مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطباتِ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

جمع و ترتیب
مولوی محمد رمضان میاں صاحب
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

اردو بازار ایم۔اے جناح روڈ کراچی ۱

خطبات علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطباتِ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

جلد اوّل

تعلیم و تعلّم

جمع و ترتیب:
مولوی محمد رمضان میاں صاحب
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی

طباعت : اکتوبر ۲۰۰۲ء علمی گرافکس پرنٹنگ پریس، کراچی۔

ضخامت : 400 صفحات

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
کشمیر بکڈپو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور
ادارۃ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی

عرض ناشر

بحمداللہ دارالاشاعت کراچی کو اسلامی موضوعات میں مستند ترین علماء کی کتب شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے اللہ تعالی محض اپنے فضل سے شرف قبول سے نوازیں آمین۔

مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بارے میں اپنے بزرگوں کی زبانی کان میں انکے علمی، تحقیقی، تصنیفی کارنامے سن سن کر جو نقشہ دل و دماغ میں بنا جیسا ایک محسن و مربی کا ہوتا ہے۔ افسوس کہ کبھی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ جامعہ بنوریہ کے ایک فاضل نے حضرت مدظلہم کے خطبات جمع کر کے انہیں کتابی شکل دی اور احقر سے برائے اشاعت رابطہ کیا تو فوری طور پر امت کے اس محسن کے خطبات شائع کرنے کا ارادہ کر لیا۔

ان صاحب سے بحمداللہ تحریری طور پر اجازت حاصل کر کے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے علماء، اساتذہ، طلباء اور عام مسلمانوں کے لئے یہ خطبات راہنما ثابت ہونگے۔

تمام قارئین سے درخواست ہے کہ ناشر مع اہل خانہ اور کارکنان دارالاشاعت کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

والسّلام

ناشر

نطق کو سو ناز ہے تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان

صفحہ	عنوان
۲۲۴	قرآن مجید میں صنعت کا ذکر
	(۱۷) اکوڑہ خٹک میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہاد اور
۲۳۲	شہداء کا خون دار العلوم حقانیہ کی شکل میں رنگ لایا
۲۳۲	عبادت کی مشقت
۲۳۳	اسلام ہند میں
۲۳۵	جہاد کی تین شرطیں
۲۳۷	خونِ شہیداں ضائع نہیں ہوتا
۲۳۸	دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی ضرورت
۲۴۲	(۱۸) عہدِ حاضر کا چیلنج اور امت محمدیہ کے فرائض
۲۴۳	عصر جدید کا چیلنج
۲۴۴	مشرقی اور مغربی کیمپ کا واحد نقطۂ نظر
۲۴۵	سب سے بڑا چیلنج مادیت
۲۴۶	وہ حقائق جو مادیت پر ضرب کاری لگاتے ہیں
۲۴۷	بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
۲۴۷	خواب تھا جو کچھ دیکھا
۲۴۸	جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
۲۴۹	مادیت کے راکب یا مرکب
۲۵۱	قناعت کا جوہر
۲۵۳	حکمت سے مراد اخلاق

عنوان	صفحہ
تزکیہ کے بغیر تعلیم کتاب وحکمت ناقص	۲۵۴
چند بوریہ نشینوں کی ضرورت	۲۵۵
اس خلا کو کوئی چیز پر نہیں کرسکتی	۲۵۶
(۱۹) زبردست چیلنج اور دوررس نتائج کے حامل	۲۵۸
تاریخ کے خطرات	۲۵۹
(۲۰) عصرِ حاضر کا جدید چیلنج اور اہل مدارس کی ذمہ داریاں	۲۶۳
ملتِ اسلامیہ کے علماءِ حق کا کارنامہ	۲۶۴
مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا کارنامہ	۲۶۶
یہودی پلاننگ	۲۶۸
عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کی اشد ضرورت	۲۷۰
دوسرا کارنامہ	۲۷۱
(۲۱) عالم اسلام کا سب سے اہم مسئلہ	۲۷۳
پشت پناہ طاقت	۲۷۸
(۲۲) ملت کا تحفظ، تحریک نفاذ شریعت اور غلبۂ اسلام	۲۸۲
(۲۳) زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے	۲۹۸
میرا قدیم اور عمیق تعلق	۲۹۹
کہنے کی باتیں	۳۰۰
دو فریق	۳۰۰

عنوان	صفحہ
زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے	۳۰۱
مذہب کوئی عجائب خانہ اور میوزیم نہیں ہے	۳۰۱
یہ پوزیشن کوئی زندہ اور صاحب دعوت قوم قبول نہیں کر سکتی	۳۰۲
عربی مدارس آثار قدیمہ کے طور پر	۳۰۳
محض قدامت اور تاریخ کے سہارا پر کوئی ادارہ زندہ نہیں رہ سکتا	۳۰۵
بقاء انفع کا بے لاگ قانون	۳۰۵
زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے	۳۰۶
آپ ایک اہم محاذ پر تعینات ہیں	۳۰۸
حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی فراست و بصیرت	۳۰۹
ندوۃ العلماء کی تحریک دینی بصیرت کا نقطۂ عروج ہے	۳۰۹
کرنے کے دو کام	۳۱۰
طب یونانی کو اس لئے زوال ہوا کہ باکمال لوگ ختم ہو گئے	۳۱۱
مدارس کا بھی یہی حال ہے	۳۱۳
اصل مسئلہ محنت کا ہے	۳۱۴
اصل بات	۳۱۵
دینی صلاحیت پیدا کیجئے	۳۱۶
خارج کے دو کام	۳۱۷
میری درخواست	۳۲۰
رحم کی اپیل پر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی	۳۲۰
(۲۴) زبان ادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت	۳۲۲
(۲۵) اپنے کو نیلام کی منڈی میں نہ پیش کیجئے	۳۳۶
(۲۶) نشان منزل	۳۵۰

انتساب

ناچیز اپنی حقیری کاوش اور ادنیٰ سی محنت کو عالم اسلام کے عظیم داعی، مفکر اسلام، علامۃ الہند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کے فرزند روحانی اور عالم اسلام کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سپوت اور میرے استاذ محترم حضرت مولانا حافظ محمد حسین خان [1] مدظلہ کے نام نامی منسوب کرتے ہوئے اپنے کو بڑا سعید اور خوش قسمت سمجھتا ہے جنہوں نے بندہ کی تعلیم وتربیت میں شب وروز محنت فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گوہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے استاذ محترم کو دین کی محنت کیلئے تادیر تروتازہ رکھے خصوصاً نیپال جیسے بتکدے میں ہدایت کی شمع روشن کرنے کی سعی کو شرف قبولیت بخشے۔ اللھم آمین۔

کتبہ

محمد رمضان میاں

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ

بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان

(۱) حال مہتمم مدرسۃ الحرمین للتپور (کاٹھمنڈو) نیپال

تعلیم و تعلّم

میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے، جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرق و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں، اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ع دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں، جو خدا کی وہ دین ہے جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں، اور نہ ہونی چاہئے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے وہ وحدت سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے، اور اس کو پانے کی خوشی ہے...... میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکمت کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی وردی پہن کر آئے، وہی ''عالم'' اور دانشور ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر ''وردی'' نہ ہو وہ مستحق خطاب ہے نہ لائق سماعت، میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے کسی وقت فیضان میں کمی نہیں۔''

مفکر اسلام علامۃ الہند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ

ابتدائیہ

إنی رأیت انه لایکتب انسان کتابا فی یومه الا قال فی غده " لوغیر هذا لکان احسن، ولوزید کذا لکان یستحسن ولو قدم هذا لکان افضل، ولوترک هذا لکان اجمل" وهذا من اعظم العبرة وهو دلیل علی استیلاء النقص علی سائر البشر.

(قاله العماد الاصفهانی فی مقدمة معجم الادباء)

میں نے یہ دیکھا کہ آج جس انسان نے بھی فن تصنیف میں قدم رکھتے ہوئے خوب اہتمام سے کتاب لکھی ہے تو کل زیور طبع سے آراستہ ہونے کے بعد اسے خود اعتراف کرتے ہوئے کہنا پڑا ہے کہ اگر اس مقام پر کوئی تبدیلی کی جاتی تو بہت اچھا ہوتا، اگر کچھ اضافہ کیا جاتا تو اور اچھا سمجھا جاتا، اگر اس عنوان یا عبارت میں تقدیم وتاخیر کی جاتی تو کس قدر بہتر ہوتا، اگر یہ عبارت نہ ہی ذکر کی جاتی تو کیا ہی خوبصورتی پیدا ہو جاتی۔

یہ بڑی عبرت کی بات ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ نقص، کمی اور کمزوری جنس بشر پر مکمل طور پہ حاوی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

اللہ تعالیٰ کا اس امت پر فضل وکرم کا معاملہ بڑا عجیب ہے، اس نے ہر دور، ہر زمانے میں اس کی ضرورت کو پورا کیا ہے اور اس کی رہنمائی کے اسباب بھی مہیا کئے ہیں، انسانی ضرورت میں جہاں، جسمانی نشونما کے لئے غذا وطعام درکار ہے وہیں روحانی ضرورت کے لئے تعلق مع اللہ، اخلاص فی الدین کے جذبہ کی بھی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے جسمانی نشونما کے لئے مختلف انواع، مختلف اقسام اور اشیاء کو پیدا فرمایا ہے اور روحانی ترقی کے لئے اپنی کتاب اور اپنے مقرب و برگزیدہ نبی حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی پاکیزہ تعلیمات رکھی ہیں، اسی روحانی ترقی کے لئے ایسے رجال پیدا فرمائے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں وقت کے تقاضوں کے مطابق الٰہی بحرین (کتاب وسنت) سے امت مسلمہ میں دین اسلام کی سیرابی کی ہے اور انسانیت کی تشنگی دور کی ہے، ہر صدی، ہر دور کے علماء کرام اور ائمہ عظام نے تحریر وتقریر، درس وتدریس، دعوت وتبلیغ، وعظ وارشاد کے ذریعے دین اسلام کے چراغ کو روشن رکھا ہے، موجودہ دور میں جہاں ہر طرف سے فتنوں کی یورش ہے، آزمائشوں اور امتحانوں کا سامنا ہوتا ہے، علماء کرام اپنی خدمات کی بجا آوری میں مصروف ہیں، ہر فتنے کے خلاف تحریر وتقریر کے ذریعے، اس کے سد باب کی کوشش میں مصروف کار ہیں، ہمارے دور کی عظیم علمی وروحانی شخصیت مفکر اسلام حضرت العلامہ مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے تحریر وتقریر کا ایک خاص ذوق اور ملکہ عطا فرمایا تھا، حضرت مولانا ندوی قدس سرہ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا

یا جس موضوع پر کلام فرمایا، اس کا حق ادا کر دیا، جی ہاں! آپ حضرت مولانا قدس سرہ کی کتابیں مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقت یہی ہے۔ آپ نے امت مسلمہ میں دینی دعوت اور اسلامی بیداری کا جو لائق تقلید کارنامہ انجام دیا ہے، وہ صرف آپ ہی کا خاصہ تھا گویا قدرت نے اس کو آپ میں ودیعت کے طور پر رکھا تھا، پاکستان کے عظیم مفکر حکیم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا نے مشرق ومغرب اور عرب وعجم میں مسلسل اسلام کی دعوت کا صور پھونکا ہے اور وہ پوری انسانیت کو اسلام کے 'خوانِ یغما' پر جمع ہونے کی دعوت دے رہے ہیں، وہ ہمیں کبھی امریکہ و لندن پہنچ کر ''مغرب سے صاف صاف باتیں'' کرتے نظر آتے ہیں، کبھی قاہرہ میں ''اسمعی یا مصر'' کی اذان دیتے ہیں اور کبھی ''اسمعوھا منی صریحۃ ایھا العرب'' کے ذریعے معدن اسلام (عرب) کے نمائندوں کو جھنجھوڑتے ہیں، کبھی دریائے کابل سے دریائے یرموک تک پہنچ کر عالم اسلام کے مقتداؤں کو بیدار کرتے ہیں، کبھی انہیں ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر کی کہانی سناتے ہیں (جس کا ایک رخ وجد آفرین ہے تو دوسرا خون افشاں) کبھی ان کے سامنے ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کھول کر رکھتے ہیں کبھی انہیں ''اسلامیت ومغربیت کی کشمکش'' کے ہولناک پہلوؤں سے آگاہ کرتے ہیں، کبھی انہیں آج کے نظریاتی قافلوں سے ہٹ کر ''کاروان مدینہ'' میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں، الغرض مولانا کی دعوت شرق وغرب، عرب وعجم اور افریقہ وایشیاء کی حد بندیوں سے بالاتر ہے، وہ پوری انسانیت کو سسکتی بلکتی

انسانیت کو، مادی زخموں سے چور چور انسانیت کو محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستگی کی دعوت دیتے ہیں۔''

(شخصیات وتاثرات ج ا ص ۴۱۱، ۴۱۲)

یہی حقیقت ہے، کبھی تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دم قدم سے عرب وعجم میں دینی دعوت کا ایک نغمہ گونج رہا تھا، آپ نے جہاں عربی ادب کو اپنی تحریر سے بام عروج پر پہنچایا وہیں اردو زبان کی اہمیت کو بھی اوجِ ثریا تک رسائی کروائی ہے، دنیا آپ کی تحریر و تقریر کی عاشق اور آپ کی دعوت کی مُحب ہے بقول شخصے کہ ''اردو زبان میں جان ڈالنے والی شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی قدس سرہ کی ہے اور ہندوستان میں جہاں اردو زبان کو حضرت مولانا ندویؒ نے بلند مقام تک پہنچایا ہے وہیں پاکستان میں حکیم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید قدس سرہ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہ نے بام عروج پر پہنچایا ہے۔''

آیئے! پاکستان کے ان دو ادیب اور انشاء پرداز حضرات کی سنیئے، وہ حضرت مولانا ندوی قدس سرہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، حکم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید نور اللہ مرقدہ رقمطراز ہیں:

''پانچویں بزرگ جن کے کمالات، علوم و معارف، فضل و احسان، ورع وتقویٰ، دعوت وعزیمت، حق گوئی و بے باکی، ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لئے گھلنے پگھلنے سے میں زیادہ متاثر ہوا جن کی خدمات پر بے حد رشک آیا اور جن سے غائبانہ عقیدت، محبت میں بدل گئی وہ حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ کی جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت تھی''۔

(تعمیر حیات مفکر اسلام نمبر ص ۱۳۴)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ان کی تحریروں میں علم وفکر کی فراوانی کے ساتھ بلا کا سوز وگداز ہے جو انسان کو متاثر کیئے بغیر نہیں رہتا، خاص طور پر مغربی افکار کی یورش نے ہمارے دور میں جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں جو فتنے جگائے ہیں ان پر حضرت مولاناؒ کی بڑی وسیع وعمیق نظر تھی اور انہوں نے اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ ان فتنوں کی تشخیص اور ان کے علاج کی نشاندھی اتنی سلادتِ فکر کے ساتھ اتنے دلنشین انداز میں فرمائی ہے کہ عہد حاضر کے مولفین میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کا ہمسری کر سکے۔

(تعمیر حیات، مفکر اسلام نمبر ص ۱۴۶)

زیر نظر کتاب ''خطباتِ علی میاں'' کے مطالعہ سے ان حضرات کے ارشاد کی تصدیق ہوتی نظر آئے گی، کیونکہ مذکورہ خطبات میں حضرت مولانا ندوی قدس سرہ نے علم وفضل، ورع وتقویٰ، دعوت وعزیمت، تاریخ وادب اور دیگر فنون جن کے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے وہ بڑی اہمیت کے حامل ہونے کے ساتھ بڑی عبرت کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں، علماء کرام وطلبہ علوم دینیہ کو ان کے مقاصد سے آگاہی، جدید چیلنجوں کے مقابل ان کی ذمہ داریوں کو واضح کیا ہے، اس سے عوام کو فقہ وحدیث، ادب وانشاء اور دعوت وعزیمت کو سمجھنے کا ایک بہترین موقع فراہم ہوگا اور یقیناً کسی خطیب کے خطبات کو کتابی شکل مل جانا اس کے تجربات، مشاہدات، حالات وواقعات اور اس کی علمی وفکری خدمات کا کتب بین حضرات کے لئے ایک تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے، پھر جبکہ وہ خطیب مفسر ومفکر، مورخ ومحدث، فقیہ وادیب، دینی فکر کا حامل، اکابر امت کی شفقتوں کا مرکز، امت مسلمہ کا مرجع ہو اور اپنے سینے میں سسکتی بلکتی، زخم خوردہ، پریشانیوں وآزمائشوں سے چور چور انسانیت

کے لئے گھلنے پگھلنے والا دل رکھتا ہو، جس کی تقریر میں جوش کے عنصر کے بجائے فکری و ذہن سازی کا عنصر غالب ہو تو یہ سونے پر سہاگہ ہے۔ درحقیقت حضرت مولانا ندویؒ کے یہ خطبات اسی کے حامل ہیں، قارئین جب اس کا مطالعہ کریں گے تو ان کے سامنے ایک نئی دنیا کے گوشے واضح ہوتے جائیں گے اور ماضی کے بند دریچے کھلتے جائیں گے۔

راقم الحروف کو حضرت مولانا ندویؒ کی پہلی زیارت نیپال کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم نورالاسلام جلپاپور سنسری میں ۳/ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۵/مئی ۱۹۹۲ء کو ہوئی، راقم الحروف ان دنوں ابتدائی درجات میں زیر تعلیم تھا، دارالعلوم کے طلبہ میں حضرت مولاناؒ کے نام کا کافی چرچا تھا طلبہ حضرت مولانا کا تذکرہ کیا کرتے تھے، اساتذہ بھی ان کے کافی مداح تھے، راقم رشک کرتا تھا کہ یہ شخصیت کیسی ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے کتنا نوازا ہوگا۔ وہاں واقعی حضرت مولاناؒ ثم یوضع لہ القبول فی الارض کے مصداق نظر آتے تھے۔ ان باتوں کے پیش نظر جب مذکورہ تاریخ کو حضرت مولاناؒ کی تشریف آوری ہوئی تو آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا، یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی، پہلی ملاقات! جس میں ان کی نظر شفقت نے مجھ کو اپنا گرویدہ بنالیا، گویا وہ میری زندگی میں ایک آئیڈیل اور ایک رہبر ورہنما کی ہستی تھی، میں جس کی تلاش میں تھا اس کو میں نے پالیا تھا (وہاں دارالعلوم میں حضرت مولاناؒ کا جو خطاب ہوا وہ خطبات مذکورہ "مدارس دینیہ کی ضرورت اور علوم دینیہ میں اخلاص واختصاص کی اہمیت" کے عنوان سے موجود ہے) پاکستان میں جب جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں داخل ہوا تو حضرت مولاناؒ کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ خاص طور سے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" اور تاریخ دعوت وعزیمت پڑھنے کے بعد آپ سے عقیدت محبت میں بدل گئی۔ ایک عرصہ سے میری تمنا تھی کہ عالم اسلام کی اس عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دیکھوں وہاں حضرت مولاناؒ کی زیارت سے اپنی روح کو سرشار کروں، چنانچہ بندہ اپنے وطن واپسی کے موقع پر بائی روڈ ہندوستان روانہ ہوا جہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، مذکورہ تاریخ یعنی ۲۲ شعبان ۱۴۲۰ھ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے مہمان خانے میں آپ سے زیارت کا شرف حاصل ہوا،

مغرب کے بعد کا وقت تھا، آپ کی طبیعت ناساز تھی، ملاقات بھی کم فرماتے تھے۔ راقم الحروف جب پہنچا اور آپ کو بتایا گیا کہ بنوری ٹاؤن سے طالب علم آیا ہے تو شرف زیارت بخشا، حال احوال کے بعد جب ہمارے محسن جامعہ کے بانی محدث حضرت العلامہ سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ کا ذکر خیر آیا تو فرمانے لگے "حضرت بنوریؒ بہت بڑے عالم اور میرے اچھے دوست تھے۔" راقم سیاہ کار آپ کی دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوا چونکہ دوسرے دن صبح کی گاڑی سے بندہ کو اپنے وطن جانا تھا سچی بات تو یہ ہے کہ کتابوں میں ہم نے جو کچھ اپنے اکابرین کے متعلق پڑھا تھا حضرت مولانا کی زیارت کے بعد مجھے اپنے تمام اکابرین کی جھلک ان میں نظر آئی، پھر جب آپ کے حفید سعید حضرت مولانا عبداللہ الحسنی الندوی زید مجدہ جو ۲۵ شعبان ۱۴۲۰ھ کو مدرسۃ الحرمین کاٹھمنڈو کے پہلے سالانہ اجلاس میں تشریف لائے، آپ نے راقم عاجز سے فرمایا "رمضان میاں! رمضان رائے بریلی میں گذارو" (حضرت مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوکر خوب استفادہ کرو) لیکن اپنے ساتھ تو ایسے اعذار لگ گئے تھے کہ راقم حاضر نہ ہوسکا اور حضرت سے ملاقات کے ایک ماہ بعد ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو عازم آخرت ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون، صدی کیا ختم ہوئی، صدی کے سارے احوال و واقعات اور تاریخ دعوت وعزیمت کو لئے وہ رخصت ہوگئے، بس ایک داعیہ تھا کہ حضرت مولانا ندویؒ کے پیام کو عام کیا جائے اور اس کے لئے کوشش کی جائے اسی بات کے پیش نظر ان خطبات کی ترتیب کی گئی ہے تاکہ حضرت مولاناؒ کے بیانات وخطبات سے استفادہ کیا جائے، اس پہلی جلد کا تعلق علمائے دین اور طالبان علوم نبوت سے ہے۔ جس میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے علمائے دین کو ان کی مسئولیات اور ذمہ داریوں سے خوب خوب آگاہ کیا ہے، علم اسلام کے زوال وانتشار کے موقع پر علمائے اسلام کی ذمہ داری کے احساس، ان کی کوتاہی اور تقصیر پر قلبی اذیت اور مدارس دینیہ وسیع وجامع تخیل کی نزاکت واہمیت نے شاید ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنا سارا علمی اثاثہ اور اندوختہ بے تکلف ومخلصانہ طور پر اپنے عزیزوں کے سامنے رکھدیں، جن نتائج تک وہ طویل علمی راہ نوردی اور تحقیق وجستجو کے بعد پہنچتے تھے اس کا لب لباب ان کے سامنے پیش کردیا، موجودہ دور میں ان کے وجود کی قدردانی سمجھائی اور ملت اسلامیہ نے ان سے

کیا کیا توقعات قائم کر رکھی ہیں اسے واضح طور پر سمجھایا ہے، ساتھ ہی علماء کو جدید چیلنجوں سے آگاہ کرتے ہوئے ان کا حل بھی تجویز فرمادیا ہے جوان علماء کرام کو ذہنی پریشانیوں سے، احساس کمتری سے نکالنے میں معاون ہونگی، اسی طرح طالبانِ علوم نبوت کے حاملین کو موجودہ حالت میں صحیح معنوں میں تعلیم حاصل کرنے اوران پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی اور وہ صفات اور شرائط بیان کئے جن کے بغیر ان کے مقاصد اعلیٰ کی تکمیل ناممکن ہے اور جوان کی زندگی کیلئے مشعل راہ اور زادِ سفر بن سکتے ہیں۔ ان خطبات کا مرکزی خیال اور بنیادی موضوع ایک ہی تھا کہ ایک طالب علم کی نگاہ کن بلند مقاصد پر رہنی چاہئے اور محدود مخصوص ماحول میں رہ کر بھی وہ کیا کچھ بن سکتے ہیں اور دنیا کو کیا کچھ دے سکتے ہیں؟ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جو جوہر کمال اس کے اندر ودیعت فرمائی ہے اس کو ترقی دے کر اور چمکا کر وہ کن علمی و روحانی بلندیوں پر اپنا نشیمن بنا سکتے ہیں، آج کے اس مغربیت و لادینیت کے عالم گیر سیلاب میں عربی مدارس کی طلبہ کی ذمہ داریاں پہلے سے بہت زیادہ ہے، اس پر آشوب زمانہ میں ملت اسلامیہ کو ایسے افراد مطلوب ہیں جوان کی صحیح رہنمائی کرسکیں، یہ کام وہی طلبہ کرام کر سکتے ہیں جو زندہ دل ہوں، چونکہ یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے ہی قائم رہ سکتا ہے، وہ افراد بڑے ایمان و یقین بڑے اخلاق و کردار، بڑے علمی رسوخ اور امتیاز، اور بڑی کاوش اور ریاضت والے ہوں، چنانچہ طلبہ علوم دینیہ و اسلامیہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ ان صفات جمیلہ اور اوصاف حمیدہ کو اپنے اندر پیدا کریں تاکہ وہ ان مدارس سے فارغ ہو کر نکلنے کے بعد ملت اسلامیہ کی احسن طریقہ پر رہنمائی کرسکیں، اسلاف امت کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ وہ ان صفات کے حامل تھے، ان کے اندر ٹھوس علمی صلاحیت موجود تھی جس کے نتیجے میں انہوں نے امت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کی اور یہ دین محفوظ شکل میں آج ہم تک پہنچا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بالتفصیل ان موضوعات پر روشنی ڈالی ہے جسے پڑھ کر طلبہ یقیناً اپنی منزلت کو پہنچائیں گے اور اپنے اندر ایک نئی قوت محسوس کرینگے اور اپنی ذہنی پریشانیوں کو رفع کرینگے، مجھے یقین ہے کہ یہ خطبات قارئین کرام کے حق میں بھی مشعلِ راہ اور سراغ زندگی ثابت ہونگے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات میں سے دوسری اور تیسری جلد انشاء اللہ دعوتی

مضامین سے متعلق ہونگی، اللہ تعالیٰ بندے کو ہمت وحوصلہ اور توفیق عنایت فرمائے کہ بندہ اس سعادتمندی کو احسن طریق پر انجام دے سکے، اخلاقی فرض کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ان تمام ہی حضرات کا بے حد مشکور وممنون ہوں جنہوں نے اس کام میں میری ہر طرح سے مدد کی خصوصاً میرے معاون عزیزان برادران رفیق محترم مولوی محمد رشید سلمہ اللہ اور محمد ہارون معاویہ، رفیق محترم مولوی محمد سفیان بلندشہری سلمہ اللہ (مرتبہ تذکرہ حضرت لدھیانوی شہیدؒ) رہے، میں ان کا مشکور وممنون ہوں کہ انہوں نے کتاب کی کمپوزنگ کے مرحلہ سے لے کر تصحیح ترتیب تک معاونت کی، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور دین متین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔ قارئین کرام سے التماس کروں گا کہ جہاں ان خطبات میں کوئی غلطی یا کمی کو پائیں اس کو مرتب کی کمی سمجھیں نہ کہ حضرت مولاناؒ کی کیونکہ خطبات میں غلطی کا رہ جانا خطیب کی غلطی نہیں بلکہ مرتب کی غلطی ہوتی ہے اور راقم کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جاسکے اور اپنی دعاؤں میں حضرت مولاناؒ کے ساتھ ساتھ میرے والدین، میرے اساتذہ اور ساتھیوں کو بھی یاد کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کے ساتھ دین اسلام کی خدمت ودعوت کے لئے قبول فرمائے آمین۔

کتبہ

راقم عاجز محمد رمضان میاں (نیپالی) عفا اللہ عنہ

۲۱ / جمادی الاول ۱۴۲۲ھ

۱۲ / اگست ۲۰۰۱ء

یوم الاحد

مقیم حال جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان

سوانح حیات مفکر اسلام حضرت العلامہ مولانا سید ابوالحسن علی میاں حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اساسی فکر، حضرت سید احمد شہیدؒ کی دینی تحریک، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی حکمت دین، حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی تبحر علمی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی وسعت علمی، حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے تجدید دین، حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کی عالمی دعوت وفکر، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی حمیت وغیرت دینی، حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کی بیعت وارشاد، حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے پیام درستی عقائد کا مجموعہ جو شخصیت بنتی ہے وہ مفکر اسلام، حضرت العلامہ مولانا سید ابوالحسن علی میاں الحسنی الندویؒ کی ذات بابرکت ہے جن کے دم قدم سے برصغیر پاک وہند بلکہ پورے عالم اسلام میں دعوت الی اللہ کی فکر بیدار ہوئی اور خوابیدہ انسانیت کے سامنے دین اسلام کی روشنی پیدا ہوئی، انہی کی ذات باسعادت کے متعلق یہ چند سطور آپ کے حالات وخدمات کے حوالے سے قارئین کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔

ولادت:

● آپ کی ولادت ۶ محرم ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء بروز جمعہ بمقام تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی) ہندوستان میں ہوئی۔

والدین:

● آپ کے والد کا نام، حکیم سید عبد الحی، اور والدہ کا نام خیر النساء تھا اور بہتر تخلص لکھتی

تھیں، ڈاکٹر سید عبدالعلی م ۱۳۸۱ھ آپ کے بڑے بھائی اور امۃ اللہ تسنیم صاحبہ م ۱۳۹۵ھ اور امۃ العزیز آپ کی بڑی بہن تھیں، مولانا مرحوم کی والدہ محترمہ حافظ قرآن تھیں اور آپ کی خالہ، اور خالہ زاد بہن، ممانی اور پھوپھی سب کی سب قرآن مجید حفظ کئے ہوئے تھیں۔ نو سال کی عمر میں آپ کے والد ۱۳۴۱ھ اور ۵۶ سال کی عمر میں آپ کی والدہ کا ۱۳۸۸ھ میں انتقال ہوا۔

ابتدائی تعلیم:

● آپ نے ابتدائی تعلیم والدہ محترمہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی اور مولانا محمود علی سے قرآن مجید، اردو اور فارسی پڑھی۔

عربی تعلیم:

● آپ نے باقاعدہ عربی تعلیم کا آغاز شیخ خلیل عرب محمد انصاری یمانی سے اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی سے حاصل کی اور ان ہی کی تربیت میں عربی زبان و ادب کی تکمیل بھی کی۔

علم تفسیر:

● آپ نے شیخ خلیل عرب انصاری سے منتخب سورتوں کی تفسیر کا درس لیا، اور مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ (وفات ۲۳ فروری ۱۱۶۲ھ) سے ان کے ترتیب دیئے نظام کے مطابق ۱۳۵۱ھ میں لاہور میں قیام کر کے پورے قرآن کریم کی تفسیر پڑھی۔

علوم شرقیہ:

● آپ نے ۱۹۲۷ء میں لکھنو یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے شعبہ میں داخلہ لیا۔ اس وقت حضرت مولاناؒ لکھنؤ یونیورسٹی کے سب سے کم سن طالب علم تھے، اور یونیورسٹی سے فاضل ادب کی امتیازی سند حاصل کی۔

علم حدیث:

● آپ نے ۱۹۲۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں کے درس حدیث میں خاص طور سے شرکت کی اور ان سے صحیحین اور سنن ابی داؤد، اور سنن ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی۔

● ۱۹۳۲ء میں دار العلوم دیوبند جا کر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے علم حدیث کے اسباق سے استفادہ کیا، اور آپ کے تفسیر وعلوم قرآن کے اسباق میں بھی شرکت کی۔

علم فقہ:

● آپ نے دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا اعزاز علی امروہی صاحب سے علم فقہ کا درس لیا۔

علم تجوید:

● آپ نے قاری اصغر علی صاحب سے روایت حفص کے مطابق تجوید پڑھی۔

نکاح:

● آپ کی شادی نومبر ۱۹۳۴ء میں حقیقی ماموں زاد بہن سید احمد سعید صاحبؒ کی صاحبزادی حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی اور مفتی عبدالرزاق صاحب (صاحب صمصام الاسلام منظوم ترجمہ فتوح الشام) کی نواسی سے ہوئی اور مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا حیدر حسن خاںؒ نے خطبہ نکاح پڑھا۔ آپ کی کوئی صلبی اولاد نہیں ہے، مگر روحانی اعتبار سے دنیا میں آپ کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں ہی میں نہیں کروڑوں ہے۔

فلسفہ:

● آپ نے سید الملت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے فلسفہ پڑھا، اور سید صاحب کے عزیز شاگرد رہے اور ان کے علم و طرز کار سے فیض حاصل کیا اور علامہ شبلیؒ کے اسلوب و طرز بیان کے نہ صرف قدر داں رہے بلکہ خوشہ چیں بھی تھے۔

سلوک و طریقت:

● آپ نے ۱۹۳۱ء میں مولانا احمد علی لاہوریؒ کے شیخ مولانا غلام محمد بہاولپوریؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ ۱۹۴۲ء میں اپنے شیخ کے اشارے پر مولانا عبدالرحیم رائے پوری کے خلیفہ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے۔

انگریزی تعلیم:

● آپ نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان انگریزی زبان سیکھنے پر توجہ دی جس

سے اسلامی موضوعات اور عربی تہذیب و تاریخ وغیرہ پر انگریزی کی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کرنے کے لائق ہوئے۔

حلیہ ولباس:

● درمیانہ قد، بلندی تقریباً ساڑھے پانچ فٹ، گول چہرہ، صبیح رنگ، ہاتھ مخمل جیسا نرم وملائم، حساس طبیعت، ہمیشہ سفید کپڑے زیب تن فرماتے، کرتہ اور چوڑی مہری کا پائجامہ جو ٹخنوں سے اوپر رہتا، ٹوپی کبھی کھڑی دیوار، کبھی پلیے دار، عیدین وتقریبات وسفر میں شیروانی پہنتے تھے اور عیدین کے موقع پر سر پر رومال اور جبہ، چھڑی، تسبیح اور جیب گھڑی ساتھ رہتی۔

رنج اور خوشی:

● حضرت مولانا کے خادم خاص حاجی عبدالرزاق صاحبؒ بتاتے ہیں کہ میں ۱۹۶۰ء سے مستقل حضرت کے ساتھ سفر وحضر میں رہا، حضرت کا سب سے ممتاز خاصہ تواضع و انکساری ہے۔

● اس چالیس سال کی طویل مدت میں ایک بار کسی بات پر حد درجہ ناراضگی بتاتے ہوئے صرف اتنا فرمایا، ''تکلیف ہوئی'' اور اس مدت میں خوشی کا لمحہ وہ تھا جب ۱۹۹۸ء میں حرم شریف حاضری کے وقت کلید بردار نے کلید کعبہ شریف کے چوکھٹ پر رکھتے ہوئے تالہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ اور دخول کعبہ کا شرف حاصل ہوا۔

غم کا لمحہ:

● سب سے زیادہ غم ۱۹۶۱ء میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی وفات

کے وقت حاضر نہ رہنے کا ہوا، اس وقت حضرت مولانا برما کے سفر پر تھے۔

پسندیدگی:

● سال کے دس مہینے (علاوہ دسمبر و جنوری) برف کا ٹھنڈا پانی پیتے، چائے صبح ناشتہ کے بعد اور بعد عصر ایک وقت میں دو تین پیالی پینے کا معمول تھا، چائے کی پیالی لبریز اور گرم اتنی کہ لب سوز اور میٹھی اتنی کہ لب باز ہو۔

معمولات:

● رات کے آخری حصہ میں فجر کی نماز سے پہلے یاد الٰہی میں مشغول رہتے، بعد فجر ٹہلنے کا معمول تھا، آخری دنوں میں بیماری، کمزوری اور بے خوابی کی وجہ سے آرام فرماتے تھے، سات سے ساڑھے سات بجے تک ناشتہ اور لوگوں سے ملنے کا معمول تھا۔ اس کے بعد نماز چاشت تلاوت قرآن مجید اور پھر دو تین معاونین کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں بیٹھ جاتے اور ساڑھے بارہ بجے تک تصنیف و تالیف اور خطوط کے جوابات دیتے، بعد نماز ظہر کھانا کھاتے اور اس کے فوراً بعد آرام فرماتے اور عصر کی نماز سے پہلے کبھی ڈاک، کبھی ملاقات اور کبھی قرآن مجید پڑھنے کا معمول تھا۔

● عصر کے بعد مہمانوں سے ملاقات فرماتے اور مغرب کی نماز سے بیس منٹ پہلے نماز کی تیاری، بعد نماز مغرب، اندرون خانہ جاتے، اگر رائے بریلی میں رہتے اور سفر کی روانگی سے قبل قبرستان جا کر فاتحہ پڑھتے۔ عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھاتے اور کھانے کے بعد تھوڑی دیر لوگوں کے ساتھ بیٹھتے اس کے بعد تھوڑی دیر طلبہ و اساتذہ سے گفتگو فرماتے اور دس بجے تک سو جانے کا معمول تھا۔

ظرافت:

● حضرت مولاناؒ کی طبیعت میں خشکی نہیں تھی، بلکہ طبعاً بہت ظریف تھے، ایک مرتبہ انجینیر امتیاز صاحب جو ندوہ تکیہ ضیاء العلوم اور تینندوا کی عمارتوں کی نگرانی کرتے ہیں حضرت کا پیر دبانے لگے، حضرت نے فرمایا آپ چھوڑ دیں، جہاں آپ کا ہاتھ لگتا ہے وہاں عمارت کھڑی ہو جاتی ہے، ایک مرتبہ حافظ عتیق الرحمٰن صاحب (ناظر مطبخ دار العلوم ندوۃ العلماء) کا جب مطبع ندویہ سے مطبخ قدیم تبادلہ ہوا تو انہوں نے حضرت کو اس کی اطلاع دی آپ نے فرمایا کہ صرف ع۔ خ کا فرق ہے یعنی مطبع سے مطبخ آئے ہیں۔

● حاجی عبد الرزاق صاحب (حضرت کے خادم خاص) کے بارے میں ایک خط میں لکھا کہ یہ ہمارے زندگی کے ساتھی اور بُڑھاپے کی لاٹھی ہیں۔ ایک مرتبہ آپ بیٹھے ہوئے تھے کہ نیند آ گئی کسی نے آپ کے کندھوں کے پاس سے کھٹمل پکڑا اور کہا حضرت کھٹمل تھا، آپ نے برجستہ کہا کہ میرا نام بھی تو علی ہے۔

علمی و دعوتی زندگی:

● عربی میں سب سے پہلا مقالہ سید رشید رضا مصری کے مجلّہ المنار میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا جو سید احمد شہید کی تحریک کے موضوع پر تھا۔ ۱۹۳۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس بنائے گئے اور تفسیر و حدیث اور ادب عربی تاریخ و منطق کا درس دیا۔

● ۱۹۳۹ء میں دینی مراکز سے واقفیت کے لئے ایک سفر کیا جس میں حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ اور مصلح کبیر حضرت مولانا محمد الیاسؒ دہلوی سے تعارف حاصل ہوا، اور اسی وقت سے ان سے مستقل ربط و تعلق ہو گیا چنانچہ اول الذکر سے روحانی تربیت حاصل کی اور ثانی الذکر کی رہنمائی و سرپرستی میں تبلیغ و دعوت کا فریضہ انجام دیا، اور یہ تعلق

تا حیات قائم رہا۔

● ۱۹۴۳ء میں انجمن تعلیمات اسلام کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس میں قرآن کریم اور سنت نبویہ کے درس کا سلسلہ جاری کیا جو بے حد مقبول ہوا۔

● ۱۹۴۵ء میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن کی حیثیت سے منتخب کئے گئے۔

● ۱۹۵۱ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تجویز پر نائب معتمد تعلیم متعین کئے گئے۔

● ۱۹۵۱ء میں تحریک پیام انسانیت کی بنیاد ڈالی، چونکہ اخلاقی قدریں بے دردی کے ساتھ پامال کی جارہی ہیں۔ خود غرضی بلکہ خود پرستی کا جنون سب پر سوار ہے۔ انسان کی جان و مال عزت و آبرو کا احترام تیزی کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے اسی فقدان کو دور کرنے کے لئے تحریک پیام انسانیت کی بنیاد ڈالی گئی۔

● ۱۹۵۴ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات کے بعد بالاتفاق معتمد تعلیم قرار پائے۔

● ۱۹۵۹ء میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام قائم کی۔

● ۱۹۶۱ء میں برادر اکبر ڈاکٹر عبد العلی حسنی صاحب کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے۔

● ۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں کئی لیکچرس دیئے جو النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن کے نام سے شائع ہوئے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اعزازات، مناصب، تعلیمی اداروں اور تعلیمی مراکز کی رکنیت:

● ۱۹۵۷ء میں دمشق کے مجمع اللغۃ العربیۃ کے مراسلاتی ممبر منتخب ہوئے۔

● ۱۹۶۲ء میں رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس و قیام کے لئے پہلا جلسہ مکہ مکرمہ میں ہوا، جس میں جلالۃ الملک مسعود بن عبد العزیز اور لیبیا کے حاکم ادریس سنوسی بھی شریک

تھے، اس جلسہ میں نظامت کے فرائض مولانا نے انجام دیئے۔

● ۱۹۶۲ء میں ہی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی تاسیس و قیام کے وقت اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر بنائے گئے، اور مجلس شوریٰ کے خاتمہ تک اس منصب پر فائز رہے۔

● رابطہ الجامعات الاسلامیہ (رباط مراکش) کی کانفرنس میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل کی قیادت میں شریک ہوئے، پھر ندوۃ العلماء کے نمائندہ کے طور پر مستقل ممبر رہے۔

● ۱۹۸۰ء میں اردن کے مجمع اللغۃ العربیۃ کے رکن بنائے گئے۔

● ۱۹۸۱ء میں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ادب میں پی، ایچ، ڈی کی اعزازی ڈگری عطاء کی گئی۔

● ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ کے اسلامک سینٹر کے قیام کے وقت تاحیات صدر بنائے گئے۔

● ۱۹۸۴ء میں رابطہ الادب الاسلامی العالیۃ کے قیام کے وقت تاحیات صدر بنائے گئے۔

● ۱۹۶۸ء میں سعودی وزیر تعلیم کی دعوت پر کلیۃ الشریعہ کے نصاب و نظام کی تیاری کے لئے ریاض تشریف لے گئے اور اس موقع پر وہاں جامعۃ الریاض اور کلیۃ المعلمین (ٹیچرس ٹریننگ کالج) میں کئی لیکچر دیئے۔

● ۱۹۳۲ء میں ندوۃ العلماء سے عربی نکلنے والے پرچے "الضیاء" کی ادارت میں اور ۱۹۴۰ء میں اردو پرچے الندوۃ کی ادارت میں شریک رہے اور ۱۹۴۸ء میں انجمن تعلیمات اسلام کی طرف سے "تعمیر" کے نام سے اردو میں ایک پرچہ نکالنا شروع کیا۔

● ۵۹-۱۹۵۸ء میں دمشق سے نکلنے والے پرچے "المسلمون" میں اداریئے تحریر فرمائے۔ پہلا اداریہ "ردۃ ولا ابابکر لھا" لکھا جس کا اردو ترجمہ نیا طوفان اور اس کا

مقابلہ کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ استاذ محبّ الدین خطیب کے پرچہ ''الفتح''، میں بھی بعض مقالات شائع ہوئے۔

● ۱۹۶۳ء میں لکھنو سے ندائے ملت نکلنا شروع ہوا، تو اس کی سرپرستی فرمائی اور ۱۹۵۵ء میں ندوہ سے عربی رسالہ ''البعث الاسلامی'' اور ۱۹۵۹ء میں نکلنے والا عربی رسالہ ''الرائد'' نیز ۱۹۶۳ء سے نکلنے والا اردو رسالہ پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' ان تینوں رسالوں کے سرپرست اعلی رہے۔

● ۱۹۸۰ء میں اسلامی دنیا میں نمایاں علمی وعملی خدمات کے اعتراف میں ۱۴۰۰ھ کا شاہ فیصل ایوارڈ آپ کو ۱۲ فروری ۱۹۸۰ء کو ریاض میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں دیا گیا۔ حکومت سعودی عرب کا یہ اعزاز دو لاکھ چالیس ہزار ریال نقد (ہندوستانی رقم چوبیس لاکھ روپے) اور ایک سند پر مشتمل تھا۔ حضرت مولانا مرحوم نے شاہ فیصل ایوارڈ کی نصف رقم افغان پناہ گزینوں اور بقیہ نصف رقم مکہ مکرمہ کے دو دینی اداروں (ادارہ حفظ القرآن اور مدرسہ صولیہ) کو برابر تقسیم کر دیا۔

● علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبی جلد ۸ پر مقدمہ حضرت مولانا نے لکھا تھا۔ کتاب جب پاکستان سے شائع ہوئی تو صدر ضیاء الحق مرحوم نے حضرت مولانا مرحوم کو ایک لاکھ روپے کا ایوارڈ دیا، حضرت مولانا مرحوم نے نصف رقم دار المصنفین اعظم گڑھ اور نصف رقم علامہ سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ کو عنایت کر دی۔

● ۱۹۹۹ء میں دبئی کے بین الاقوامی حسن قرأت کے عالمی مقابلہ کے موقع پر عالم اسلامی کی عظیم اسلامی شخصیت کا ایوارڈ ایک شاندار تقریب میں پیش کیا گیا۔ یہ رقم بھی حضرت مولانا نے ہندوستان کے تمام دینی اداروں میں تقسیم کر دی جو تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ تھی۔

● ۱۹۹۹ء میں آکسفورڈ اسلامی سینٹر کی طرف سے تاریخ دعوت وعزیمت کے

سلسلہ میں سلطان حسن بلقیہ (برونائی انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازے گئے، یہ رقم بھی احباب اور ضرورت مندوں کو تقسیم کردی)۔

تعلیمی اداروں اور تعلیمی مراکز کی رکنیت:

- ۸ جون ۱۹۶۱ء کو ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے۔
- صدر دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، ہندوستان۔
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، ہندوستان۔
- صدر مجلس انتظامی ومجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستان۔
- صدر اسلامک سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی لندن، برطانیہ۔
- صدر فاؤنڈیشن فار اسٹڈیز اینڈ ریسرچ لکزمبرگ۔
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ہندوستان۔
- صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی۔
- رکن موسسۃ آل البیت، عمان، اردن۔
- بانی وصدر تحریک پیامِ انسانیت ، ہندوستان۔
- رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ، سعودی عرب۔
- رکن مجلس شوری اسلامیہ مدینہ منورہ، سعودی عرب۔
- رکن عربی اکیڈمی دمشق وقاہرہ واردن۔
- رکن اکیڈمی آف لیبررس دمشق یونیورسٹی دمشق، سوریا۔
- رکن مجلس عاملہ مؤتمر عالم اسلامی بیروت، لبنان۔
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سنٹر جنیوا۔
- رکن مجلس برائے فقہ اسلامی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، سعودی عرب۔

● رکن مجلس شوری دار العلوم دیو بند، ہندوستان۔
● رکن مجلس عاملہ اسلامک یونیورسٹیز فیڈریشن رباط مراکش۔
● رکن اکیڈمی آف عربی لینگوئجز عمان۔
● رکن نیشنل فاؤنڈیشن فار ٹرانسلیشن ریسرچ اینڈ اسٹڈیز تیونیس۔
● وزیٹنگ پروفیسر دمشق مدینہ یونیورسٹی، سعودی عرب۔

اسفار:

● ۱۹۲۹ء میں لاہور کا سفر کیا جو دور دراز کا سب سے پہلا سفر تھا۔ جہاں لاہور کے علمی و دینی بزرگوں سے ملاقاتیں کیں اور شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم سے بھی ملے، جن کی نظم ''چاند'' کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، اسے پیش کیا۔

● ۱۹۳۵ء میں دلتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی کا سفر کیا۔

● ۱۹۴۷ء میں حج کا پہلا سفر کیا، اور چند ماہ حجاز میں قیام رہا، یہ بیرون ملک کا سب سے پہلا سفر تھا، اور حج کا دوسرا سفر ۱۹۵۰ء میں ہوا، اور وہیں سے مصر، سوڈان وشام واردن کا سفر کیا۔

● ۱۹۵۱ء میں مصر کا پہلا سفر تھا جبکہ مولانا کی کتاب ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) مولاناؒ سے پہلے وہاں کے تمام علمی حلقوں میں پہنچ کر متعارف ہو چکی تھی، یہ کتاب خود مولاناؒ کے لئے تعارف کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ اسی سفر میں فلسطین بھی گئے اور بیت المقدس اور مسجد اقصی کی زیارت کی۔ واپسی میں اردن کے حکمران شاہ عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔

● ۱۹۵۶ء میں ترکی کا پہلا سفر کیا (جس کی روداد دو ہفتے ترکی میں کے عنوان سے

شائع ہوئی) اسی سال لبنان کا سفر بھی کیا۔

● ۱۹۶۰ء میں برما کا سفر کیا۔

● ۱۹۶۲ء میں کویت کا پہلا سفر کیا بعد میں کویت اور خلیجی ممالک کے متعدد اسفار ہوئے۔ اردن اور یمن کا سفر بھی ہوا، اور جگہ جگہ دعوتی خطاب ہوئے۔

● ۱۹۶۳ء میں یورپ کا پہلا سفر ہوا جس میں لندن، پیرس کیمبرج اور آکسفورڈ وغیرہ جانا ہوا اور اسپین کے اہم شہر بھی گئے۔

● ۱۹۷۶ء میں مسجد اقصیٰ کا سفر ہوا۔

● ۱۹۷۷ء میں امریکہ کا پہلا سفر ہوا، یہ دو ماہ دس دن کا سفر تھا، اس سفر میں امریکہ کے مختلف شہروں میں جانا ہوا اور دعوتی و دینی خطاب ہوئے اور آنکھ کا آپریشن بھی کرایا۔

● ۱۹۷۷ء میں افغانستان، ایران، عراق اور لبنان (مراکش) کے لئے رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی قیادت کی۔

● ۱۹۸۵ء میں بلجیم کا سفر ہوا۔

● ۱۹۸۷ء میں تاشقند وسمرقند وغیرہ کا سفر ہوا۔ اردن کا سفر ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۴ء میں ہوا۔

● اسپین ۱۹۶۳ء، افغانستان ۱۹۷۳ء، متحدہ عرب امارات ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۳ء اور آخر میں ۱۹۹۹ء، شمالی امریکہ ۱۹۷۷ء ۱۹۹۳ء، یورپ ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء ایران ۱۹۷۳ء میں سفر کئے۔

پاکستان کا ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۶ء میں سفر کیا

بخارا کا ۱۹۸۶ء میں سفر کیا۔

برطانیہ کا ۱۹۶۳ء اور ۱۹۸۵ء میں سفر کیا۔

برما کا ۱۹۶۰ء میں سفر کیا

ترکی کا ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۸۶ء ، ۱۹۸۹ء ، ۱۹۹۳ء ، ۱۹۹۶ء میں سفر کئے۔

الجزائر کا ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۶ء میں سفر کیا۔

حجاز کا ۱۹۴۷ء ، ۱۹۵۱ء ، ۱۹۶۲ء ، ۱۹۶۷ء ، ۱۹۶۹ء میں سفر کیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی اسفار ہوئے۔

قطر، ۱۹۷۹ء ، ۱۹۹۵ء میں سفر کیا۔

الرباط، ۱۹۷۶ء میں سفر کیا۔

سری لنکا، ۱۹۸۲ء میں سفر کیا۔

سمرقند، ۱۹۹۳ء میں سفر کیا۔

سوڈان، ۱۹۵۱ء میں سفر کیا۔

شام، ۱۹۵۱ء ، ۵۲ء ، ۶۴ء ، ۷۳ء میں سفر کئے۔

عراق، ۱۹۵۶ء ، ۱۹۷۳ء میں سفر کیا۔

عمان، ۱۹۵۱ء ، ۱۹۷۳ء ، ۱۹۸۴ء ، ۱۹۹۸ء میں سفر کیا۔

فلسطین، ۱۹۵۱ء میں سفر کیا۔

کویت، ۱۹۶۲ء ، ۶۸ء ، ۸۳ء ، ۸۷ء میں سفر کئے۔

لبنان، ۱۹۵۶ء ، ۱۹۷۳ء میں سفر کئے۔

لاہور، ۱۹۲۹ء میں سفر کیا۔

ملیشیا، ۱۹۸۲ء ، ۱۹۸۷ء میں سفر کیا۔

مراکش، ۱۹۸۶ء میں سفر کیا۔

مصر، ۱۹۵۱ء میں سفر کیا۔

نیپال، ۱۹۹۲ء میں سفر کیا۔

یمن ۱۹۸۴ء میں سفر کیا۔

طالبانِ علومِ نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

یہ تقریر مارچ ۱۹۵۴ء میں دار العلوم دیوبند میں طلبہ کے ایک جلسہ میں کی گئی تھی۔ اس تقریر میں دینی مدرسہ کا حقیقی منصب و مقام اور اس کے طلبہ وفضلاء کی ذمہ داریاں بتلائی گئی ہیں اور ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ عصر جدید ان سے کس قسم کی توقعات رکھتا ہے، اور اس دور میں دین کی دعوت اور خدمت کے لئے ان کو کس قسم کے تیاریوں کی ضرورت ہے اور طالبان علوم نبوت کو خدمت دین کیلئے خوب خوب ترغیب دی گئی ہیں جو ان کے حق میں مفید ثابت ہوگا، انشاءاللہ۔

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين، وعلى آله واصحابه اجمعين، ومن تبعهم باحسان ودعى بدعوتهم الى يوم الدين. اما بعد! فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمٰن الرحيم. رب اشرح لى صدرى ويسرلى امرى واحلل عقدة من لسانى يفقهوا قولى.

عزیزان گرامی!

مجھے اس وقت آپ سے اس حیثیت سے گفتگو کرنی ہے کہ آپ دینی مدارس کے طالب علم ہیں اور میں ان کا دیرینہ خادم اور آپ کا رفیق سفر، موضوع کی اہمیت اور وقت کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ میں آپ کے سامنے اپنی زندگی کے تجربات اور اپنے محدود مطالعہ کے نتائج بے تکلف رکھ دوں، اور زندگی کے سفر کی سب سے قیمتی اور عزیز سوغات آپ

کے سامنے پیش کردوں، آپ نے مجھے گفتگو کا موقع دے کر عزت بخشی ہے، آپ نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے، میری خواہش اور کوشش ہونی چاہئے کہ میں اس اعتماد کا اہل ثابت ہوں، اور اس تھوڑے سے وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں، اس لئے کہ یہ وقت آپ نے بڑے قیمتی مشاغل سے نکالا ہے، اور یہ ان لوگوں کا وقت ہے جن کی ساعتیں اور لمحات مہینوں اور برسوں کے حساب سے تلنے چاہئیں۔

مدرسہ کیا ہے؟

دوستو! ہم کو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دینی مدرسہ کا مقام اور منصب کیا ہے؟ مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے، اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان وادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہ راست نبوتِ محمدی سے ہے جو عالمگیر بھی ہے اور زندۂ جاوید بھی، اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے، اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ درحقیقت قدیم و جدید کی بحثوں سے بالاتر ہے، وہ تو ایسی جگہ ہے جہاں نبوتِ محمدیؐ کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت پائے جاتے ہیں۔

مدرسہ کی ذمہ داری اور گراں باری

حضرات! کسی مدرسہ کے لئے اس سے بڑھ کر قابل احتجاج اور قابل اعتراض لفظ

نہیں ہو سکتے کہ وہ محض ایک دار الآثار یا کسی قدیم عہد کی یادگار ہے، میں اس کو مدرسہ کے حق میں ازالۂ حیثیت عرفی کے مترادف سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا اور حرکت ونمو سے لبریز سمجھتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوت محمدیؐ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا اس زندگی سے، وہ نبوتِ محمدیؐ کے چشمۂ حیات سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوت محمدیؐ کا دریا پایاب ہونے والا ہے، نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدیؐ کے چشمۂ فیض سے بخل اور انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار، ادھر سے **انما انا قاسم و الله يعطی** کی صدائے مکرر ہے، تو ادھر سے **هل من مزيد** ، **هل من مزيد** کی فغانِ مسلسل، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے، زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بیشمار، زندگی کی ضرورتیں بیشمار، زندگی کی غلطیاں بیشمار، زندگی کی لغزشیں بیشمار، زندگی کے فریب بیشمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بیشمار، زندگی کے حوصلے بیشمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟ دنیا میں ہر ادارہ ہر مرکز اور ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے! اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو، تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود اور تعطل کی گنجائش کہاں ہے، اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے میں، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک جائے، یا کسی منزل پر قیام کرلے، یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے، تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے، سرود ازلی اور پیغام

محمدیؐ اسے کون سنائے، مدرسہ کا تعطل، قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام، خودکشی کا مترادف اور انسانیت کے ساتھ بیوفائی کا ہم معنی ہے، اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا۔

طلبہ وفضلائے مدارس کی ذمہ داریاں

دوستو! مدرسہ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ کا کام سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ عظیم ہے، میں نہیں جانتا کہ اس وقت دنیا کی کسی جماعت یا کسی گروہ کا کام اتنا نازک، وسیع اور اہم ہو، ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ آپ کا ایک سرا نبوت محمدی ﷺ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا زندگی سے، یہی آپ کے کام کی نزاکت کی وجہ سے آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ نبوتِ محمدیؐ سے وابستگی اور اتصال جہاں ایک بہت بڑی خوش نصیبی اور سرفرازی ہے وہاں ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے، آپ کے پاس حقائق اور عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سب سے عظیم سرمایہ ہے، اس وابستگی سے آپ پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہئے، آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہئے کہ ساری دنیا ملتی ہو، تو اس کے ایک نقطہ سے بھی دستبردار ہونے کے سوال پر غور نہ کرسکیں، آپ کے دلوں میں اس کی حمایت ونصرت کا جذبہ موجزن ہونا چاہئے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اس کی صداقت، اس کی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانہ میں صلاحیت اس کی بلندی وبرتری اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اس کے مقابل ہر چیز کو پورے اطمینان کے ساتھ جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں۔ آپ جہاں احکامِ خداوندی اور تعلیمات اسلامی کو سن کر سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہیں، وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے علمبرداروں کو مخاطب کر کے کہیں، کہ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ۔ آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اسوۂ محمدیؐ ہی

کی روشنی میں دنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں، اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفانِ نوح میں سفینۂ نوح صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور امامت ہے، آپ یقین کرتے ہوں کہ افراد اور قوم کی سرفرازی اور سربلندی کی شرط صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے، اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ:

محمد عربیؐ کہ آبروئے ہر دو سرا است کسیکہ خاک درش نیست خاک بر سر او

آپ تعلیماتِ نبوت کے علم کا لب لباب اور حقیقۃ الحقائق سمجھتے ہوں، آپ اس کے مقابلے میں تمام دنیا کی الٰہیات اور فلسفہ مابعد الطبعیات اور قیاسات و روایات کو افسانہ و خرافات سے زیادہ وقعت دینے کے لئے تیار نہ ہوں، آپ توحید کی حقیقت سے واقف اور اس پر مصر ہوں، اور شرک اور تمام دنیا کے علم الاصنام کو خواہ وہ کیسے ہی پر جلال علمی اصطلاحات اور فلسفہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں، اور زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوراً سے زیادہ مرتبہ دینے کے لئے آمادہ نہ ہوں آپ سنت کے اتباع کے حریص، اور خَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین رکھتے ہوں، اور بدعات کے مضر اور نا مقبول ہونے پر آپ کو شرح صدر ہو، غرض آپ اعتقادی، ذہنی، فکری، قلبی، ذوقی اور عملی حیثیت سے نبوتِ محمدیؐ کی جامعیت اور عملیت کے قائل اور اس کی عملی تفسیر ہوں۔

طلباء و فضلاء کا امتیاز

دوستو! دنیا کے دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں آپ کا امتیاز یہ ہے کہ ان حقائق پر دوسروں کا اجمالی ایمان کافی ہے مگر آپ کو اس پر پورا ذہنی اطمینان اور شرح صدر ہونا چاہئے، آپ کا صرف قائل ہونا کافی نہیں، اس کا داعی ہونا ضروری ہے، دوسروں کا یقین لازمی ہو تو کافی ہے، آپ کا یقین متعدی ہونا چاہئے، جو سینکڑوں ہزاروں انسانوں کو یقین سے لبریز کر دے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آپ کا یہ سرور سرخوشی و

سرمستی بے خودی کی حدتک نہ پہنچا ہو، اور آپ میں یکرہ ان یعود الی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار کی حقیقت نہ پائی جاتی ہو، تعلیمات نبوت سے دوسروں کی سرسری واقفیت کافی ہے، مگر آپ کے لئے علومِ نبوت میں رسوخ، علومِ نبوت سے عشق، علوم نبوت میں مقام فنائیت، علومِ نبوت پر اصرار ضروری ہے، اس کے بغیر دعوت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دعوتوں اور تحریکوں کے اس طوفانی دور میں اس کے بغیر اپنی خصوصیات اور سرمایہ کی حفاظت بھی مشکل ہے۔

کیفیات باطنی

یہ بھی یاد رکھئے کہ نبوتِ محمدیؐ نے جس طرح علوم واحکام کا ایک بے پایاں دفتر اور وسیع ترین ذخیرہ چھوڑا۔ فان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن ورثوا ھذا العلم. یہ ذخیرہ قرآن وحدیث فقہ واحکام کی صورت میں محفوظ ہے، اور آپ کا مدرسہ بحمد اللہ اس کی خدمت واشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے، اسی طرح نبوت محمدیؐ نے کچھ اوصاف، خصوصیات، اور کیفیات بھی چھوڑے، جس طرح پہلا سرمایہ نسل درنسل منتقل ہوتا رہا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت واشاعت کا انتظام کیا، اسی طرح دوسرا سرمایہ بھی برابر منتقل ہوتا رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بھی انتظام فرمایا ہے، یہ اوصاف و خصوصیات کیا ہیں، یقین واخلاص، ایمان واحتساب، تعلق مع اللہ، انابت اخبات، خشوع وخضوع، دعا وابتہال، استغناء وتوکل، اعتماد علی اللہ، دردومحبت خودشکنی وخودداری، نبوت علوم واحکام اور اوصاف وکیفیات دونوں کی جامع تھی، ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ، نبوت محمدیؐ سے صرف علوم واحکام لینا اور کیفیات واوصاف کو ترک کردینا ناقصِ وراثت ہے اور نامکمل نیابت، دنیا میں جن لوگوں نے نبوت کی نیابت کی اور اسلام کی امانت ہم تک پہنچائی، وہ صرف ایک حصہ کے امین نہ تھے وہ دونوں دولتوں سے مالا مال تھے، اب بھی اسلام کی

دعوت اور اسلامی انقلاب صرف پہلے حصہ سے برپا نہیں کیا جا سکتا، آپ کو جن اسلاف کی طرف نسبت کا شرف حاصل ہے، وہ بھی ان دونوں خصوصیتوں کے جامع تھے، آپ اگر حقیقی نیابت کے منصب بلند پر سرفراز ہونا چاہتے ہیں، تو آپ کو اس جامعیت کی کوشش کرنی پڑے گی اس کے بغیر علم وفن کی صناعی کاغذی پھول ہیں، جن میں نہ خوشبو نہ تازگی، آج دنیا کے بازار میں کاغذی اور ولایتی پھولوں کی کمی نہیں، ہم اور آپ اس میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کر سکتے، یہاں تو نبوت کے باغ کے شاداب پھول چاہئیں، جو مشامِ جاں کو معطر کر دیں، اور جن کے سامنے دنیا کے پھول شرما جائیں۔ **فوقع الحق وبطل ما کانو یعملون.**

مدارس کا باطنی انحطاط

آپ برا نہ مانیں، کہنے والا بھی آپ ہی میں سے ہے۔ عرصہ سے ہمارے مدارس ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں، ان اوصاف میں روز افزوں انحطاط ہے، ہم کو دل پر پتھر رکھ کر سننا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ کہنے والے نے کہاں تک صحیح کہا ہے کہ:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے جس تعداد میں لوگ فارغ ہو کر نکلتے ہیں، کبھی اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے، لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں۔

انقلاب انگیز شخصیتیں

پہلے اسی ملک میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ یا سید علی ہمدانی کشمیری جیسا ایک فقیرِ بے نوا آتا اور پورے کے پورے ملک کو اپنے قلب کی حرارت اور اپنے ایمان کے نور سے

بھر دیتا، حضرت مجدد الف ثانی نے حکومتِ مغلیہ میں انقلاب برپا کر دیا، انہیں کی خاموش مساعی کا نتیجہ تھا کہ ہم اکبر کے تخت پر اورنگ زیب جیسے فقیہ و متشرع بادشاہ کو دیکھتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس طویل و عریض ملک کا رجحان بدل دیا، اور پورے نظامِ فکر اور نظامِ تعلیم پر گہرا اثر ڈالا، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک عام مایوسی اور پسپائی کے دور میں اتنا بڑا اسلامی قلعہ تعمیر کر دیا، اور علومِ شریعت کو ایک نئی زندگی بخش دی، ابھی پچھلے عرصہ میں مولانا محمد الیاسؒ نے ایمان اور دینی جدوجہد کی ایک نئی روح پھونک دی، غرض

ع جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

آج ہمارے فضلاء اس روح سے خالی، ان کیفیات سے عاری، اور اس قوت سے محروم ہیں، جو لوگوں کو نئے سرے سے سوچنے اور بدل جانے پر مجبور کر دیتی تھی، زمانہ بڑا حقیقت شناس ہے، وہ صرف بلندی کے سامنے جھکتا ہے، دماغ بلند دماغ کے سامنے جھکتے ہیں، اور خالی اور سرد دل معمور اور گرم دلوں کا لوہا مانتے ہیں، ہمارے مدارس میں دماغی انحطاط بھی روز افزوں ہے اور قلبی افسردگی بھی روبہ ترقی، مقررین اور واعظین کی اب بھی کمی نہیں، مگر بقول حضرت جگر ؎

آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

مدارس کی افسردہ فضا

مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کا مرکز تھے، اور جہاں انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا ہوتی تھیں، وہ مایوسی، افسردگی اور احساسِ کمتری کا شکار ہیں، آج مدارس کی تعداد میں، ان کے طلبہ کی تعداد میں، درس کی کتابوں کی تعداد میں، کتب کے مندرجات کی تعداد میں وظائف کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہے، مگر زندگی کی نبض سست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے، کوئی حساس دردمند کبھی بھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور وہ اس بحر کا حال کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ، کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

لیکن اب تو مدارس کے حق میں کسی طوفان سے آشنا ہونے کی دعا کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے، آج مدارس میں طوفان کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن یہ باہر کے طوفان کے تھپیڑے اور موجیں ہیں جو مدارس کے درودیوار سے ٹکرا رہی ہیں، یہ باہر کے ہنگاموں اور سطحی اور عوامی تحریکات کی صدائے بازگشت ہے، جس میں ہمارے مدارس کے طلبہ کا مقام محض نقال یا آلہ صوت کا ہے۔

دنیا کا امام تقلید و پیروی کے مقام پر

یہ بڑا افسوس ناک منظر، اور بڑی دلخراش حقیقت ہے کہ جو تحریکیں اور دعوتیں، جو ہنگامے اور شور، جو انتشار و اضطراب، جو تنظیمیں اور طریقۂ احتجاج آج عصری درسگاہوں اور دنیاوی تعلیم گاہوں میں نامقبول ہو رہے ہیں، اور پیش پا افتادہ اور کہنہ فرسودہ سمجھے جانے لگے ہیں، وہ ہمارے مدارس میں اب باریاب ہو رہے ہیں اور جن کو زمانہ کا محتسب، اپنے عصر کا امام اور خود صاحبِ دعوت اور صاحبِ مقام ہونا چاہئے تھا، وہ لادینی درسگاہوں کے متبع اور مقلد ہونے پر فخر کر رہے ہیں۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

آج مدارس کا سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑا ذہنی طاعون بڑھتا ہوا احساس کمتری ہے، جو گھن کی طرح اس درخت کو کھاتا چلا جا رہا ہے، کسی ادارہ کو اگر یہ گھن لگ جائے تو پھر اس کی زندگی محال ہے۔

احساس کمتری کیوں؟

عزیزو! آپ احساس کمتری کا کیوں شکار ہوں؟ دوسروں کا احساسِ کمتری دینی کمزوری، ضعفِ عقیدہ، اور ضعف ایمان کی دلیل ہے، جس کے نتائج بہت سنجیدہ اور دور رس ہیں، انبیاء کے نائبین اور علومِ نبوت کے حاملین کو اپنی کمتری اور حقارت کا احساس ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبوت کے مقام سے نا آشنا اور یقین سے خالی ہیں، آپ تو ان ہستیوں کے جانشین ہیں جن کے متعلق عارف رومی نے بجا طور پر کہا تھا ؎

نخوتے دارند و کبرے چوشہاں
چاکری خواہند از اہل جہاں

اور جن کے متعلق سعدیؒ کے الفاظ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا، کہ ع

شہان بے کلہ وخسروانِ بے کمراند

خودشناسی وخودداری

میرے عزیز طلبہ! آپ کے پاس جو دولت ہے اس سے دنیا کا دامن خالی ہے، آپ کے سینہ میں علومِ نبوت ہیں، اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں، اور جن کے گم ہونے سے آج عالم میں اندھیرا ہے، اضطراب وانتشار ہے، شر وفساد ہے، آپ اپنے ان سادہ کپڑوں، ان حقیر جسموں اور اس خالی جیب و دامن پر نظر نہ کریں، آپ دیکھیں کہ آپ کا سینہ کن دولتوں سے معمور، اور آپ کے اندر کیسا بدرِ کامل مستور ہے۔ ؎

بر خود نظر کشاز تہی دامنی مرنج
درسینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

آپ یاد رکھیں حقارت، ذلت کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے، عالم خارجی اور بیرونی دنیا سے بہت کم ہے، حقارت ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے، احساسِ حقارت کا

نتیجہ ہے انسان کے شک وشبہ، ضعف وتذبذب، اور خود شناسی کے فقدان کا انسان خود اپنے کو حقیر و بے مایہ سمجھتا ہے، اور اس کو دھوکہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں اور دنیا میں وہ بے قیمت اور ذلیل ہے، حالانکہ یہ جفا وہ خود اپنے اوپر کرتا ہے، یاد رکھیئے جو خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو جائے اس کو کوئی باعزت نہیں بنا سکتا، اور جو خود اپنے کو اپنی نظر سے گرا دے، کسی کو اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ اس کو اپنے دل یا آنکھوں میں جگہ دے، جس کی گنجائش خود اپنے یہاں نہیں ہے، اس کی گنجائش کون ومکان میں نہیں ہے، یہ زمین بقدرِ دل سمٹتی اور پھیلتی ہے، اور اس کی وسعت گھٹتی اور بڑھتی ہے، آدمی کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اپنے کو اپنے دل میں کیا مقام دیا ہے اور اس کا معاملہ خود اپنی ذات کے ساتھ کیا ہے، اگر کسی نے اپنے کو ذلیل وحقیر، مجبور بے بس، تہی دست و بے بضاعت اور دنیا کے بازار میں بے قیمت و بے ضرورت سمجھ لیا ہے، تو اس کو دنیا سے کسی انصاف اور کسی اعزاز کی توقع نہیں کرنی چاہئے، حاتم طائی نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

ونفسک اکرمها فانک ان تهن

علیک فلن تلقی من الناس مکرما

اپنی ذات کی خود عزت کرو، اس لئے کہ اگر تم اپنی نگاہ میں ذلیل اور بے وزن ہو جاؤ گے تو پھر دنیا میں تمہیں کوئی بھی عزت کرنے والا نہیں ملے گا۔

دوستو! مجھے یقین ہے کہ ہم حقیر نہیں، صرف احساسِ حقارت کے مریض ہیں، اور یہ احساسِ حقارت ہماری خود ناشناسی اور خود فراموشی پر مبنی ہے، اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مقام سے باخبر ہو جائیں اور اپنی دولت اور سرمایہ کا صحیح جائزہ لیں، دنیا کی تبدیلی، نگاہوں کی تبدیلی، سب ہماری نگاہ کی تبدیلی کے تابع ہے، جس دن ہماری یہ نگاہ بدلی، دنیا بدل جائے گی، اور حقارت کا یہ مہیب سایہ جو ہمارے دل ودماغ پر مسلط ہے اور ہم کو ڈرا رہا ہے کافور ہو جائے گا، کہنے والے نے کچھ غلط نہیں کہا ؎

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن ، تو ہے امیر جنود

ہماری قدیم اور معاصر تاریخ میں جن اشخاص نے اپنے مقام کو پہچان لیا، اور جن کو اس کا احساس ہوگیا کہ اللہ نے ان کو کون سی دولت دی ہے اور کس منصب پر سرفراز کیا ہے ،ان کو یہ سارا عالم پست نظر آنے لگا، ان کو سلطنتیں نہیں خرید سکیں ، انہوں نے دنیا کی بڑی سے بڑی پیش کش سن کر ہمیشہ زیرلب مسکرا کر کہا ؎

بردایں دام برمرغِ دگرنہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

انسانی تاریخ کی آبرو جوارزاں فروشیوں اور خود فراموشیوں کی داستانوں سے داغدار ہے، انہیں خود آشنا و خدا شناس انسانوں کے دم سے ہے، انسانیت کا سر انھیں کی بدولت اونچا ہے، جنہوں نے اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھا۔

زندگی کی آبرو خودداروں کے دم سے قائم ہے

عزیزانِ گرامی! اس زندگی کے بقاء و تسلسل کے لئے جس طرح غذا اور لباس کی ضرورت ، مادی ساز و سامان کی ضرورت ہے، اور لوگوں نے اس کا ذمہ لیا ہے، اسی طرح زندگی کے فروغ اور وقار اور انسانیت کے شرف اور اعتبار کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس مادہ پرست کوتاہ بین دنیا میں وقتاً فوقتاً پیغمبرانہ خودداری اور دنیا کے انکار اور حقارت کا بھی اظہار ہوتا رہے، اور کسی کسی گوشہ سے یہ صدا بھی آتی رہے، کہ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَا اٰتَانِیَ اللّٰہُ خَیْرٌ مِّمَّا اٰتَاکُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِھَدِیَّتِکُمْ تَفْرَحُوْنَ ۔جس روز یہ صدا بالکل بند ہو جائے گی ،اور ساری دنیا نیلام کی منڈی بن جائے گی ، جہاں جوہرِ ادراک شعلۂ ایمان اور متاعِ علم سب کسی نہ کسی دام پر ملنے لگیں گے، اور انسان جمادات اور حیوانات کی طرح ارزاں اور گراں بکنے لگیں گے، اس دن یہ دنیا رہنے کے قابل نہ رہے گی ،اور انسانیت اپنی

آب وتاب کھودے گی، اب اس کی ذمہ داری کہ انسانیت کی خودداری اور پیغمبروں کی سرداری کی شان قائم رہے، تنہا آپ کے سر ہے، اس کی توقع ان درسگاہوں سے نہیں کی جاسکتی، جنہوں نے معدہ اور پیٹ کے نصب العین سے بلند ہونے کا دعوی خود بھی نہیں کیا، اس کی توقع تو آپ ہی سے ہوسکتی ہے، جن کے اسلاف میں امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ جیسے غیور اور خودشناس امام گزرے ہیں جن کو حکومتِ عباسیہ کسی قیمت پر خرید نہ سکی، امام غزالی جیسے عالی ہمت جنہوں نے حریم خلافت کے اشارہ کے باوجود نظامیہ بغداد کی صدر مدرسی جو خلافت کے بعد سب سے بڑا دینی اعزاز تھا قبول نہیں کی، حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسے صاحبِ عزیمت جنہوں نے جہانگیر کے سامنے جھکنے پر گوالیار کی اسیری کو ترجیح دی، آپ کے اسلاف میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں بھی ہیں، جن کو بادشاہ دہلی نے پیغام بھیجا کہ اللہ نے اتنی بڑی سلطنت مجھے عطا کی ہے، آپ اس میں سے کچھ قبول فرمالیں، فرمایا اللہ تعالیٰ تو ہفت اقلیم کو متاع الدنیا قلیل، فرماتا ہے پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصے میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، نواب آصف جاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا، نواب نے کہا لے کر محتاجوں کو بانٹ دیجئے، فرمایا کہ مجھ کو اس کا سلیقہ نہیں، یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جایئے، گھر تک پہنچتے پہنچتے تقسیم ہو جائیگا، نہ ہو تو وہاں ہو جائے گا، آپ کے اسلاف میں سے حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی بھی تھے، نواب میر خاں والیِ ریاست ٹونک نے ان کی خانقاہ کے سالانہ مصارف کے لئے کچھ مقرر کرنا چاہا تو ان کو لکھ دیا گیا کہ ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

آپ کے اسلاف میں مولانا عبدالرحیم رامپوری جیسے مدرس گذرے ہیں، جنہوں

نے ریاست کے دس روپیہ ماہوار کو بریلی کالج کے ڈھائی سو روپیہ کی اسامی پر اور لوجہ اللہ پڑھانے کو ایک معزز پروفیسری پر یہ کہہ کر ترجیح دی کہ اگر خدا نے قیامت کے دن پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا، آپ کے اسلافِ کرام میں دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی ذات گرامی ہے، جنھوں نے علی گڑھ کے ایک دیندار رئیس کی تنخواہ میں جو غالباً دس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھی، دو روپیہ ماہوار یہ کہہ کر کمی کرادی کہ میں دو روپیہ اپنی والدہ صاحبہ کو دیا کرتا تھا ان کے انتقال کے بعد یہ روپیہ فاضل ہے اور میں قیامت کے دن اس کے حساب سے بچنا چاہتا ہوں، آپ کے اسلاف قریب میں وہ ایثار پیشہ مدرسین ہیں جنھوں نے اپنے مدارس کی چھوٹی چھوٹی تنخواہوں اور اپنے اساتذہ اور شیوخ کے قرب پر بڑی بڑی درسگاہوں کی بڑی بڑی پیشکشوں کو قربان کر دیا اور عسرت اور تنگی میں اپنی عمر بسر کر دی، آپ کو یقیناً یہ شعر پڑھنے کا حق ہے کہ ؎

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم
اذا جمعتنا یا جریر المجامعُ

یہ راستہ معاشی حوصلہ مندیوں کا نہیں

دوستو! آپ اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ مجھے زمانہ کی تبدیلی، ضروریات کی زیادتی ہمتوں اور قویٰ کی کمزوری، حالات کے اختلاف کا کوئی احساس نہیں، اور میں آپ سے اس زمانہ میں مولانا عبدالرحیم اور مولانا محمد قاسم صاحب کے ایثار و زہد کا پورا مطالبہ کر رہا ہوں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کا راستہ بلاشبہ ایثار و قناعت، یا مرضی الٰہی نے آپ کے لئے پسند کیا ہے، وہ معاشی حوصلہ مندیوں اور دنیاوی سربلندیوں کا راستہ نہیں، اس راستے پر تو قد کنت فینا مَرجُوًّا قبل ھذا کا طعنہ سننا ہی پڑے گا، اس راستے پر تو و لا تَمُدَّنَّ عینیک الیٰ ما متعنا بہ ازواجا منھم زھرۃ الحیاۃ الدنیا لنفتنھم فیہ و

رزق ربک خیر وابقی' کا سبق پڑھنا ہی پڑے گا،لیکن اس کا انعام کیا ہے وہ بھی سن لیجئے وجعلنا هم ائمة یهدون بامرنا لما صبروا وکانوا بایاتنا یوقنون . مولانا روم نے اسی مقام کی خبر دی ہے، کہ

معدہ را بگزار سوئے دل خرام
تا کہ بے پردہ زحق آید سلام

زمانہ کی بے بضاعتی وتشنہ لبی

آپ کو جو احساس کمتری تکلیف دے رہا ہے، اس کی کچھ تو وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے مقام سے واقف نہیں، میں نے اس کو تفصیل سے عرض کر دیا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ اس دنیا سے واقف نہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ زمانہ کس قدر بے بضاعت و تہی دامن ،اور کس قدر تشنہ لب ہے، آپ اس زمانہ کو مرعوب اور للچائی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ اس سے نا آشنا ہیں، آپ اس کو قریب سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ کس درجہ دیوالیہ ہے اور اس کو اپنے دیوالیہ پن کا شدت سے احساس ہو رہا ہے، اس کے سب سکے کھوٹے نکلے، اس کے سب تیر دغا دے گئے، اس کے سب چشمے سراب ثابت ہوئے، اس کے سب فلسفے اور نظام اس کے سب ازم ناکام رہے، اس کے سب خواب بے تعبیر رہے، آپ کے پاس نبوت محمدیؐ کے عطا کئے ہوئے جو حقائق ہیں، ان کو اپنی کم نظری سے پیش کرتے ہوئے آپ شرماتے ہیں کہ زمانہ سائنس اور سیاسیات اور اقتصادیات کی ترقی کا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ آج وہ انہیں کے لئے بیتاب اور چشم براہ ہے، آج قومیں ان لوگوں کے انتظار میں ہیں جو ان کو زندگی کا نیا راستہ بتلائیں، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام حیات سنائیں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

اصل متاع علوم انبیاء

آپ جن باتوں کو معمولی سمجھتے ہیں اور جن کو آپ نے کوئی وقعت نہیں دی، میں نے بڑے بڑے فاضلوں کو ان پر سر دھنتے دیکھا ہے، جب ان کے سامنے پیغمبروں کو بتلائی ہوئی باتیں کی گئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی بلندی سے خطاب کیا جا رہا ہے اور ان کے کان اس سے نا آشنا تھے، آپ دنیا کے بازار میں اسی کا مال اور اسی کی مصنوعات لے جانا چاہتے ہیں، پھر اس کا کیا شکوہ کہ وہ **بضاعتنا ردت الینا** کہہ کر آپ کے سامنے ڈال دیتی ہے، دنیا آپ سے امیدوار ہے کہ آپ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی اطلاعات اور بتلائے ہوئے راستہ کو پیش کریں، دنیا آج بھی ان کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار ہے، اس کے دماغ اب بھی اس کے سامنے سرنگوں ہیں، جیسے چھٹی صدی مسیحی کے محدود ماحول میں سرنگوں تھے، یقیناً آپ کے پاس یونانیوں کے طبعیات وعنصریات وفلکیات پر جو چند اوراق ہیں، اس کے مقابلے میں یورپ کے پاس سائنس اور تجربات ومشاہدات کی ایک دنیا ہے، یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ آج یورپ کو یونان کی فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلیات کی دقیقہ سنجیوں سے مرعوب نہیں کر سکتے، ان کی زندگی ختم ہوگئی ہے، اور وہ اپنی طاقت کھو چکے ہیں لیکن آپ کے پاس انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے جو علوم اور حقائق ہیں، یورپ وایشیا ان سے اب بھی محروم ہے، اس کے پاس آپ کے عقلی وفکری نتائج اور آپ کے علمی ذخیرے کا کچھ نہ کچھ جواب ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا جواب نہیں، آپ اپنی اصل قوت اور حقیقی دولت لے جائیں اور پورے اعتماد ویقین کے ساتھ زندگی کے میدان میں آئیں، اس میدان میں آپ کا کوئی حریف نہیں، آپ کے پاس انسانیت کے لئے جو دعوت اور پیغام ہے، آپ کے پاس علم وحقیقت کا جو سرچشمہ ہے، آپ کو جس ذاتِ گرامی سے نسبتِ غلامی حاصل ہے اس کے بعد آپ میں سے ہر شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ؎

عجب کیا گرمہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراکِ صاحب دولتے بستم سرِخودرا
وہ دانائے سُبل ختم الرُسُل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

علوم اسلامیہ کا زندگی سے ربط و تعلق اور اس کے لئے ہمارے اسلاف کی کوششیں

عزیزان گرامی! میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے تعلق کا ایک سرا نبوتِ محمدیؐ سے ملتا ہے، اس سے آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، میں نے ابھی تک اسی کی تفصیل بیان کی ہے، اسی کے ساتھ یہ عرض کیا گیا تھا کہ آپ کا دوسرا سرا زندگی سے ملتا ہے، اب میں عرض کروں گا کہ اس کی کیا ذمہ داریاں اور تیاریاں ہیں، اور آپ اس کے حقوق وفرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں:

عزیزو اور دوستو! نبوت نے جو علوم وحقائق اور جو اصول وضوابط عطا کئے ہیں، ان میں ایک شوشہ اور ایک نقطہ کی ترمیم ممکن نہیں، آپ کے اسلاف کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انہوں نے ان میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور اس ذخیرے کو ہمارے ہاتھوں تک بے کم وکاست پہنچا دیا، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو یاد رکھیئے کہ ہمارے انھیں اسلاف نے ہر دور اور ہر عصر میں اس ذخیرے کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، انہوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اس ذخیرے کو ایک زندہ قابلِ عمل اور نمو پذیر ذخیرہ ثابت کیا، انہوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ ان کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کرلیا، اور ان کو اپنے زمانہ اپنی عقلی سطح اور اس ذخیرے کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا، ان میں اصل

شریعت، مقاصدِ دین، اور منصوبات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت، اور فولاد کی سی صلابت تھی، لیکن اس کی تعبیر وتشریح میں، اس کی توضیح وتفہیم میں شاخِ گُل کی سی لچک اور ریشم کی سی نرمی تھی، ان کا عمل دراصل سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی اس حکیمانہ ہدایت پر تھا، کہ **کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم اتریدون ان یکذب اللہ ورسولہ**. اس لئے انہوں نے ہر زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح وترجمانی کا فرض انجام دیا، اور اس زمانہ کی نفسیات وضروریات کا لحاظ کیا، تیسری صدی میں مامون و معتصم کی سرپرستی اور یونانی علوم کے اثرات سے معتزلہ دماغوں پر چھا گئے تھے، اور عقلیت کے واحد نمائندہ تصور کئے جانے لگے تھے، اعتزال زمانہ کا فیشن اور روشن خیالی کی علامت بنتا جارہا تھا، اس وقت امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کی اس عقلی اجارہ داری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، اور شریعت وسنت کی حمایت ونصرت اور عقائد اہل سنت کا اثبات اسی زبان، انھیں اصطلاحات اور اسی اسلوب میں کرنا شروع کیا، جس کے سہارے معتزلہ نے اپنا علمی تفوق اور ذہنی سیادت قائم کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں معتزلہ کا یہ عقلی طلسم ٹوٹ گیا، اور سنت وشریعت کے حلقوں میں جو احساس کمتری تیزی سے پھیلتا جارہا تھا وہ دفعۃً رک گیا، ابوبکر بن الصیرفی کا مقولہ ہے کہ "معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلہ کے لئے شیخ ابوالحسن اشعری کو پیدا کیا، انہوں نے اپنی ذہانت واستدلال سے ان کو بند کردیا۔" اس کارنامہ کی بناء پر ابوبکر اسمٰعیلی جیسے مبصرین نے ان کو مجددین امت میں شمار کیا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری کے بعد ان کے مکتبِ خیال کے علماء نے ان کے کام کو جاری رکھا، اور قاضی ابوبکر باقلانی، شیخ ابواسحٰق اسفرائینی جیسے متکلم، اور علامہ ابواسحٰق شیرازی اور امام الحرمین جیسے مدرس واستاد پیدا ہوئے جنہوں نے اہل سنت کا علمی تفوق قائم رکھا لیکن اس عرصہ میں یونان کا علمی ذخیرہ عربی میں منتقل ہوچکا تھا اور باطنیوں اور فلاسفہ نے مل کر

فلسفہ کو تقدیس و عصمت کا جامہ پہنا دیا تھا اور وہ عقلیت و حق کا معیار بن گیا تھا، ادھر علم کلام کے حق میں جس کو سب سے زیادہ زمانہ شناس اور بیدار مغز ہونا چاہئے تھا جمود و تقلید سرایت کر گئی تھی، علماء کلام کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ اشعری و ماتریدی عقائد کو تسلیم کیا جائے بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ عقائد کو ثابت کرنے کے لئے بھی وہی مقدمات و دلائل اور وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کئے جائیں جو اشاعرہ و ماتریدیہ نے استعمال کئے ہیں۔ حالانکہ زمانہ نئے دلائل اور نئے طرز استدلال اور نئے اجتہاد کا طالب تھا۔ امام ابو الحسن اشعری کا دور فلسفہ کا دورِ طفولیت تھا اور عالم اسلام میں اس کا نیا نیا تعارف ہوا تھا، پانچویں صدی میں وہ اپنے شباب کو پہنچ چکا تھا اور زندگی میں اپنے پنجے گڑوا چکا تھا، اس وقت ایک نئی شخصیت، نئے اجتہاد، تازہ دماغ اور نئے علمِ کلام کی ضرورت تھی، اس کے لئے انتظام خداوندی نے امام غزالی کو تیار کیا، امام غزالیؒ نے اپنی تصنیفات میں اصول و عقائد اسلامیہ پر نئے انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے ایسے مقدمات و دلائل قائم کئے جو اس زمانہ کے لحاظ سے زیادہ موثر اور اپنے اثر کے لحاظ سے زیادہ دلنشیں و دل پذیر تھے، ان کے استدلال اور طریقِ بحث نے دین کا نیا وقار اور اہل سنت کا نیا اعتبار قائم کر دیا، اور ہزاروں بے چین اور مضطرب دماغوں کے لئے وہ سکون و ایمان کا باعث ہوئے اگرچہ علمِ کلام کے حلقہ نے اس وقت ان کی اس اہم دینی خدمت کی داد نہیں دی بلکہ علمِ کلام کی پرانی لکیر سے ہٹنے کی بنا پر ان پر اعتراضات کئے جن کا جواب امام صاحب نے **فیصل التفرقة بين الاسلام و الذندقة** میں دیا ہے، لیکن بالآخر عالم اسلام نے ان کے اس مجددانہ کارنامہ کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فلسفہ کا جواب دینے کے لئے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ فلسفہ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کریں اور اس پر علمی تنقید کرنے کا استحقاق پیدا کر سکیں، چنانچہ انہوں نے دو سال لگ کر (جیسا کہ **المنقذ من الضلال** میں وہ لکھتے ہیں) فلاسفہ کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا، اور باطنیہ کے عقائد و

خیالات سے واقفیت پیدا کی، پھر انہوں نے اول **مقاصد الفلاسفہ**. پھر **تہافۃ الفلاسفۃ** لکھی، تھافۃ الفلاسفۃ میں انہوں نے نیا کام یہ کیا کہ ابھی تک متکلمین اسلام کی طرف سے مدافعت و جوابدہی کیا کرتے تھے جو ہمیشہ سے ایک کمزور طریقہ ہے۔ امام غزالیؒ نے پہلی بار فلسفہ کے شیش محل پر سنگ باری کی، ان کے اس حملہ کا اثر یہ تھا کہ بقول مغربی مؤرخینِ فلسفہ سو برس تک فلسفہ کی عمارت ان کے حملہ سے متزلزل رہی اور تقریباً نوے سال کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن رشد کی کتاب **تہافت التہافت** کی صورت میں امام غزالی کی کتاب کا جواب پیش کیا۔

امام غزالیؒ کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی بنیادوں پر منظّم حملہ ہو اور نفسِ فلسفہ کو اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ فلسفہ کا سارا نظام قیاس آرائی اور بادیہ پیمائی سے زیادہ نہیں، اس کے لئے فلسفہ سے بڑی گہری اور وسیع واقفیت، ایک بڑے نقاد دماغ اور ایک بڑے جری اور طاقتور قلم کی ضرورت تھی، اس کام کے لئے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ بڑھے، جو ہر طرح اس کے لئے موزوں تھے، انہوں نے اپنے مختلف رسائل بالخصوص اپنی تصنیف **الرد علی المنطقیین** میں فلسفہ اور اس کے پورے نظام فکر کو بے اعتبار ثابت کر دیا۔ ان کی مجتہدانہ کتابیں اب بھی ذہن کو نئی غذا، قلوب کو نیا اعتماد اور فکر کو تازگی اور نشاط بخشتی ہیں۔

ادھر فلسفہ اور علمِ کلام دونوں نے مل کر جو ایک عقلی ظاہریت اور سطحی تفلسف پیدا کر دیا تھا اور عالمِ اسلام میں اس کے اثر سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا تھا کہ صداقت و یقین حاصل کرنے کا راستہ صرف استدلال و فکر ہے، اس کے خلاف مولانا جلال الدین رومیؒ نے قلمی جہاد کیا، ان کی زندہ جاوید مثنوی درحقیقت ساتویں صدی کے عقلی بحران کے خلاف قلب و روح کی ایک دلکش صدائے احتجاج ہے، اور نہ صرف علم کلام کی ایک مجتہدانہ تصنیف ہے بلکہ نئے علم کلام اور نئے استدلال کی بنیاد ہے۔ انہوں نے عقائد و حقائقِ اسلامیہ کے

ثبوت کے لئے نئے نئے دلائل اور نئی نئی مثالیں دی ہیں۔ جو بیک وقت قلب و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں اور دونوں کی سلوٹوں کو دور کرتی ہوئی دلنشیں و جاگزیں ہوتی چلی جاتی ہیں، اس کتاب کی تاثیر ابھی تک باقی ہے اور فلسفہ زدہ حلقوں میں اب بھی اس کے تیر بے خطا ہیں۔

مولانا رومؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے بعد فلسفہ نے نئی کروٹ لی، اب وہ تصوف و اخلاق کی سرحدوں میں بھی گھس آیا اور سیاست اور انتظام میں بھی دخل دینے لگا، اب اس کی تردید کے لئے تنہا الٰہیات کے مباحث اور علم کلام کی کاوش کافی نہ تھی، اب فلسفہ کے ہمہ گیر اثرات کا مقابل وہ کرسکتا تھا جو یونانی الٰہیات کے ساتھ یونانیوں کے علم الاخلاق، مصر کی افلاطونیتِ جدیدہ اور اشراق، ہندوستان کے جوگ اور قرونِ وسطیٰ کے سیاسی تخیلات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتا ہو ، اور فلسفہ و تصوف، علم الاخلاق اور علم السیاست اور اسلام کے معاشی اصول اور نظامِ مالیات پر بھی اس کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہو، اس موقع پر شاہ ولی اللہ کی شخصیت نمودار ہوتی ہے، جنہوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء لکھ کر اسلام کی عظمت اور صداقت کا نقش قائم کردیا، اور علمی حلقوں میں اسلام کی نئی علمی ساکھ، علومِ اسلامیہ کی زندگی کا ثبوت اور طبقہ علماء کا وقار قائم کردیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے تسلط سے نئے نئے فتنوں نے سر اٹھایا، عیسائی مبلغین نے اسلام پر علانیہ حملے شروع کردیئے اور علماءِ اسلام کو دعوتِ مقابلہ دی، پادریوں کا جواب دینے کے لئے اناجیل ان کی تفاسیر اور ان کی تاریخ تدوین اور مسیحیت و اسلام کے مابہ النزاع مسائل و مباحث کی براہ راست مطالعہ کی ضرورت تھی، اس موقع پر طبقہ علماء ہی کے ایک فرد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی میدان میں آئے اور انہوں نے اظہار الحق اور ازالۃ الاوہام جیسی کتابیں لکھ کر مسیحیت کی اشاعت میں ایک سنگِ گراں رکھ دیا، یہ کتابیں ہندوستان سے لے کر مصر و ترکی تک اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی

ہیں، اور ابھی تک لاجواب ہیں۔

دوسری طرف آریوں نے جن کو حکومت وقت کی شہہ مل گئی تھی اسلامی عقائد و الٰہیات پر نیا حملہ شروع کر دیا اور حدوثِ عالم و قدم ذات وصفات، کلام الٰہی، حیات بعد الموت اور تناسخ، قبلہ اور حیاتِ نبویؐ پر عقلی اعتراضات کرنے شروع کئے۔ ان کے جواب میں نہ تو قدیم کلامی دلائل پورے طور پر کارگر تھے، نہ قدیم مقدمات اور قدیم اسلوب موثر تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان کے جواب کے لئے ایک نیا علم کلام تیار کر دیا، انہوں نے روزمرہ کی ہلکی پھلکی زبان میں چھوٹی چھوٹی مثالوں اور عام فہم دلیلوں میں بڑے بڑے علمی مسائل سمجھائے اور بڑے بڑے مباحث کا فیصلہ کیا۔ تقریر دلپذیر، حجۃ الاسلام، آب حیات اور قبلہ نما ان کی ذہانت وسلامتِ فہم اور دقیقہ شناسی کا بہترین نمونہ ہیں، دوسری طرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں ایک فتنہ کھڑا ہوا۔ یہ نبوت محمدیؐ کے خلاف ایک سوچی سمجھی بغاوت تھی اور اسلام کے پورے اعتقادی اور علمی وفکری نظام کو ڈائنامیٹ کرنے اور خدانخواستہ اس کے ملبہ پر ایک نئی نبوت اور امامت کے قصر کی تعمیر کی کوشش تھی، اس کے مقابلہ میں چند مخلص اور بالغ النظر علماء میدان میں آئے، جن میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ندوۃ العلماء اور مولانا سید انور شاہؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے[۱۴]

زندگی کی رفاقت اور زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل

یہ ساری تفصیل اس لئے سنائی گئی کہ آپ اندازہ کرسکیں کہ علماء اسلام کی ذہانت اور جذبہ خدمت نے کسی منزل پر قیام اور لکیر کا فقیر بننا گوارا نہیں کیا، انہوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا۔ ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض سے کبھی جدا نہیں ہوا، ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں، انہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے جس زمانہ میں جس چیز، جس طرز اور جس اسلوب کی ضرورت سمجھی، بلا تکلف اختیار کر لیا،

انہوں نے اسلام سے وفاداری اور دین کی خدمت گزاری کا عہد کیا تھا انہوں نے کسی مدرسۂ فکر کسی مکتبِ خیال اور کسی انداز فکر سے وابستگی کی قسم نہیں کھائی تھی، ہندوستان و مصر میں جب اسلام پر تمدن وتہذیب اور تاریخ وادب کی راہ سے حملے شروع ہوئے اور مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کی مستند شخصیتوں اور اس کے معیاری عہد پر اعتراضات کئے، اور اسلام کے خدوخال کو بگاڑ کر بدنما شکل میں پیش کیا، تو طبقۂ علماء ہی میں سے ایسے اہل قلم اور ادیب ومصنف آگے بڑھے جنہوں نے ان مضامین پر ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اسلامیات بلکہ اردو ادب میں بھی یادگار ہیں اور جنہوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہزاروں کو نیا اطمینان اور دماغی سکون عطا کیا، اور نہ صرف ان کا تذبذب دور ہوا بلکہ اسلام سے شیفتگی پیدا ہوگئی۔ مولانا شبلی کی الفاروق، الجزیہ فی الاسلام کتب خانۂ اسکندریہ اس سلسلہ کی کامیاب تصنیفات ہیں۔

نصاب تعلیم کے تغیرات

خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی وعقلی رجحانات کا نمائندہ ہے، اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی و ذہنی تبدیلیوں کی بناء پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق ومتقاضی تھا۔

دین کی نمائندگی کے لئے متنوع صلاحیتوں کی ضرورت

عزیزو! اس عہد انقلاب میں دین کی نمائندگی، تعلیماتِ اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف ان کی تشریح وتفہیم بلکہ ان کی بلندی و برتری کا نقش قائم کرنے کے لئے بڑی وسیع

تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ آپ اسلام کے سپاہی ہیں اور زندگی کے معرکے کے لئے تیار ہو رہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لئے سب سے زیادہ ناموزوں، سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم وجدید اسلحہ اور طریق جنگ کی بحث ہے، سپاہی کے لئے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے، نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کے لئے کون سا ہتھیار کارگر ہے اور کون سا طریق جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہ کے لئے تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فنِ جنگ سے، اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہئے۔ عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا ؎

کل امرئٍ یسعی الیٰ یوم الھیاج بما استعدا

نئی تحریکوں سے گہری اور ناقدانہ واقفیت کی ضرورت

عزیزانِ گرامی! آپ کو نئے فتنوں سے واقف ہونا چاہئے، مگر سطحی واقفیت عدم واقفیت سے زیادہ مضر ہے، آج ہمارے مدارس میں فیشن کے طور پر بعض تحریکوں اور نظاموں کے نام لئے جاتے ہیں، لیکن ان کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، ناقدانہ نظر اور محققانہ مطالعہ تو بڑی چیز ہے، ان کی اجمالی حقیقت سے بھی واقفیت نہیں، ضرورت ہے کہ ماہرینِ فن اور اہل نقد ونظر کی نگرانی اور رہنمائی میں ان کا مطالعہ کیا جائے اور اسلام کے نظام کی برتری ثابت کی جائے، یہ کام مشکل ہے لیکن ضروری ہے، اگر یہ مدارس کے اہتمام میں منظم طریقہ پر نہ ہوا تو وہ غیر منظم طریقہ پر ہوگا۔

نئے مطالعہ کی مشکلات و ذمہ داریاں

ہمارے مدارس میں نئے مطالعہ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے، مگر مجھے اس کا اظہار کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی سنجیدگی اور گہرائی نہیں، میں عصری مطالعہ کا ادا ئی

ہوں مگر بے تکلف کہتا ہوں کہ وہ اس قدر آسان اور سرسری کام نہیں، جتنا سمجھ لیا گیا ہے، اس کے لئے کتابوں کے صحیح انتخاب وترتیب پر پوری رہنمائی اور کسی اچھے مشیر کی رفاقت کی ضرورت ہے، پھر اس سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ وہ ذہن تیار ہو جائے جو اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکے۔ معلومات میں صحیح ترتیب ونظام قائم کر سکے اور ان کو صحیح طور پر استعمال کر سکے، اگر یہ ذہن صحیح تعلیم وتربیت اور اساتذہ کی صحبت سے تیار ہو گیا تو وہ ہر طرح کی پڑھی چیزوں سے کام لے گا اور معلومات کے موادِ خام سے کارآمد مصنوعات اور عظیم نتائج پیدا کرے گا، اور ادب، تاریخ، معلومات عامہ، یہاں تک کہ بہت سی غیر متعلق چیزوں سے دین کی نصرت اور خدمت کا ایسا موثر اور حیرت انگیز کام لے گا جو بعض اوقات خالص دینی چیزوں سے نہیں لیا جا سکتا، اس وقت **من بین فرث ودم لبناً خالصاً سائغاً للشاربین** کی حقیقت کا ظہور ہوگا، اگر ایسا نہیں ہے، دین کی بنیاد میں قلب ودماغ میں مستحکم نہیں ہوئی ہیں، ذہن کج اور ذوق فاسد ہے تو۔ ع

ہر چہ گیرد علتی علت شود

کا مصداق ہوگا۔

ملک کی زبان وادب سے ربط وتعلق

اس موقع پر میں دو اور حقیقتوں کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک حقیقت تو یہ ہے کہ کسی ملک میں دین کی خدمت واشاعت اور وہاں کی زندگی پر اثر انداز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو اس ملک کی زبان وادب کا صاف ستھرا ذوق ہو، اور وہ مذاقِ سلیم اور معیارِ صحیح کے مطابق اس میں اظہارِ خیال کرنے کی قدرت، جیتی جاگتی زبان اور شگفتہ اندازِ بیان میں تصنیف وتقریر کی قابلیت رکھتے ہوں۔ دین کی دعوت اس وقت بہت موثر ہو جاتی ہے جب اس میں دل آویزی اور دلپذیری بھی ہو، اور یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت اور امر واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تک کو

اپنی قوم کو خطاب کرنے اور ان کے دل و دماغ میں نفوذ کرنے کے لئے بہترین زبان دی گئی، قرآن مجید میں کہا گیا، **انا انزلناہ قرانا عربیاً لعلکم تعقلون** کہیں فرمایا گیا **بلسان عربی مبین** کہیں ارشاد ہوا، **وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ** اہل فکر سمجھتے ہیں کہ لسان القوم سے مراد صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ ان کو سمجھ سکتا اور ان کو سمجھا سکتا ہو، بلکہ اپنے زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ لسانی اور ادبی معیار پر پورا اترتا، بلکہ سب سے فائق ہو، اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد بھی فرمایا **لِتُبَیِّنَ لَھُمْ** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **انا افصح العرب**۔

آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے اسلام کی تاریخِ اصلاح وتجدید میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا اور مسلمانوں کے خیالات ورجحانات پر گہرا اثر ڈالا، وہ عموماً زبان وقلم کی طاقت رکھتے تھے اور ان کی تصنیفات یا تقریروں میں صحیح ادبیت اور بلاغت ہے، حضرتِ شیخ جیلانیؒ کے مواعظ آج بھی زور بیان اور خطابت کا نمونہ ہیں، امام ربانی کے مکتوبات اپنی ادبیت، زور اور طلاقت، سلاست اور بے تکلفی میں ابو الفضل اور فیضی کے انشاء پردازی سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ البالغہ عربی انشاء اور علمی زبان کا ایسا نمونہ ہے کہ مقدمۂ ابن خلدون کے بعد سے ان صدیوں میں اس سے بہتر نمونہ نظر نہیں آتا۔ شاہ صاحب کی فارسی میں بھی خاص حلاوت اور سلاست ہے، ازالۃ الخفاء کے بعض ٹکڑے ادبی شہ پارے ہیں، یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب عربی اور فارسی اس ملک میں مسلمانوں کی تصنیفی اور علمی زبان تھی اردو کے رواج کے بعد خود شاہ صاحب کے فرزندوں نے اردو میں تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا، شاہ عبد القادر صاحبؒ کا ترجمہ دہلی کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے اور اپنی ادبی خوبیوں اور استناء کی بناء پر اردو کے کلاسیکل ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ کی اردو تصنیفات میں ایسی سلاست، سادگی اور برجستگی پائی جاتی ہے کہ دقیق علمی مضامین اردو

ذوق پر بار نہیں ہونے پاتے، اس ملک میں عرصۂ دراز تک زبان و ادب کی قیادت طبقۂ علماء کے ہاتھ میں رہی اور وہی اس ملک کی ادبی رہنمائی کرتے رہے، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد دہلوی اور مولانا شبلی نعمانی اردو ادب کے معماروں میں شمار کئے جانے چاہئیں، علماء نے اپنی لطافتِ ذوق، سلامتِ طبع سخن فہمی اور انشاء پردازی کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جو اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین اور مولانا سید عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء کا تذکرہ گل رعنا اور تاریخ یاد ایام اردو نثر کا ایسا نمونہ ہے جس میں تاریخی ثقاہت و متانت اور ادبی بانکپن اور رنگینی پہلو بہ پہلو ہیں، اور یادش بخیر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اردو کو اپنی علمی تحقیقات اور ادبی مضامین سے گرانبار کر دیا۔ ان کی کتابیں اب بھی اور بہت دنوں تک نقدِ کامل عیار اور ادب و انشاء کا معیار سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں نے اردو کو ایک نئی طاقت اور نیا اسلوب بخشا، الہلال کے سحر حلال نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو مسحور کر لیا تھا۔ اب بھی ان کا ایک ایسا ادبی مقام ہے جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے، علماء کی اس بیدار مغزی اور زمانہ شناسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء پر اس ملک کی تعمیر و ترقی سے علیحدگی اور اس کے رجحانات و جذبات سے بے خبری کا الزام نہیں لگایا جا سکا۔ انہوں نے اس ملک میں کبھی جزیرہ بننے کی کوشش نہیں کی، بعض دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح وہ زمانے کے کارواں سے بچھڑے نہیں، انہوں نے اپنی دعوت اور دینی مقاصد کے لئے وہی زبان استعمال کی جو اس ملک میں رائج تھی اور جو ادبی حلقوں میں اثر رکھتی تھی، ہمیں ان روایات کو قائم رکھنا چاہئے، اور اس مقدس ترکہ کی حفاظت کرنی چاہیئے، ہم اگر اب بھی دین کی مؤثر خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور اپنے عقائد و خیالات کو عوام و خواص تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تصنیف و تقریر کے لئے شگفتہ و سلیس زبان اور نیا اسلوب اختیار کرنا پڑے گا، اور اپنی تصنیفات و مضامین اور

تقریروں کو اس ادبی معیار پر لانا ہوگا جو اس زمانہ میں قائم ہوگیا ہے۔ یہ نہ ثقاہت کے خلاف ہے نہ اسلاف کی روایات کے بلکہ حکمتِ دین کے عین مطابق ہے۔

عربی زبان پر قدرت

دوسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقتور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے پورے عروج اور شباب پر ہے، وہ تصنیف وتالیف، خطابت وتقریر، سیاست و صحافت، علم وفلسفہ اور دستور وقانون کی زبان ہے، وہ پورے طور پر نکھر گئی ہے، ہمارے عربی مدارس میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ قدیم عربی زبان تفسیر وحدیث وفقہ میں محدود ہے اور وہ کہیں پائی نہیں جاتی، عربی کے نام سے بالکل ایک جدید زبان ایجاد ہوگئی ہے، جس میں زیادہ تر انگریزی وفرانسیسی کے معرب یا دخیل الفاظ ہیں، اس غلط فہمی نے ہمارے بہت سے علماء اور نوجوانوں کو عربی سے متوحش اور مایوس بنا دیا ہے، آپ اگر مجھ پر اعتماد کرسکیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کروں گا کہ جدید عربی کا کہیں وجود نہیں، اس وقت جو زبان اہل علم اور اہلِ قلم شرق اوسط میں استعمال کرتے ہیں، وہ قرآن و حدیث اور جاہلیت واسلام کی زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہے، نئی ضرورتوں کے لئے بھی انہوں نے عربی کے قدیم ذخیرہ اور قرآن وحدیث سے الفاظ نکال لئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کام انجام دیا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے، اور قابل داد بھی، مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد سے جو مغربی الفاظ عربی زبان میں داخل ہوگئے تھے وہ ایک ایک کرکے بے دخل کئے گئے اور ان کی جگہ پر خالص عربی الفاظ رکھے گئے اس وقت ان ملکوں کا لسانی اور ادبی معیار اتنا بلند ہوگیا ہے، اور صحافت واشاعت نے عربی کے خزانۂ عامرہ کے نوادر کو ایسا وقفِ عام کردیا ہے کہ اب عربی میں کام کرنے کے لئے بڑی تیاری اور جدوجہد کی ضرورت ہے، ہمارے مدارس میں جس انداز پر عربی زبان وادب کی تعلیم ہورہی ہے، اس کے ساتھ ان ملکوں میں کوئی علمی خدمت یا دعوتی کام ناممکن ہے، اگر آپ

کو عربی دنیا میں دین کی دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا ہے یا ہندوستان کی دینی و علمی تحریکات کا تعارف کرانا ہے تو اس کے لئے بڑے پیمانے پر تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اب ہندوستان ان ملکوں سے الگ نہیں رہ سکتا، دنیا کی سیاست میں شرقِ اوسط کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ اہمیت بڑھتی جائے گی۔ ہر ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے وہ اب بھی عالم کا قلب اور مرکز اعصاب ہے۔ اگر شرقِ اوسط سے ربط قائم کرنے اور دین اور مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کرنے کے کام سے علماء نے گریز کیا تو یہ نہ ان کے حق میں اچھا ہوگا نہ اس ملک کے حق میں اس لئے اس پہلو کی طرف بھی ہمارے مدارس میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، زبان و ادب زندہ اور متحرک چیزیں ہیں، کچھ مدت کے لئے بھی اگر کوئی ادارہ یا فرد ان سے بچھڑ جائے تو اس کو اس کا نقصان مدتوں برداشت کرنا پڑے گا۔

عقائدِ صحیحہ کی حفاظت

دوستو اور بھائیو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن

ع ’لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔‘‘

اب آپ سے رخصت ہونے سے پہلے میں ایک آخری چیز کہنا چاہتا ہوں جو اگرچہ آخر میں کہی جارہی ہے، مگر وہ اہمیت میں کسی سے کم نہیں۔ آپ کے ہمارے اسلاف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی دینی حس اور مذہبی غیرت کی حفاظت کی اور وقت کے کسی فتنہ کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ انہوں نے بدعات و رسوم اور شعائر جاہلیت کے معاملہ میں بھی مداہنت و تساہل سے کام نہیں لیا۔ آپ کے اسلاف میں حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جبلِ استقامت اور نقیب شریعت گزرے ہیں، جنہوں نے سب کچھ گوارا کیا، مگر کسی خلافِ شریعت فعل اور کسی بدعت کے ساتھ رعایت نہیں برتی، انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جب اس ملک پر مغربی تہذیب و عادات اور ملحدانہ عقائد و خیالات کا سیلاب آیا تو

آپ چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے، آپ کے اسلاف شریعت کے بارہ میں اتنے ذکی الحس، اتنے دور بین اور اتنے غیور واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے آخر وقت تک بدعات کو سندِ جواز نہیں دی، جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو بنتی جاتی تھیں، انہوں نے محتسب اور شریعت کے بے لاگ منتظم کے فرائض انجام دیئے اور ان کی نگاہِ احتساب سے کوئی انحراف اور کوئی بدعت بچ کر نکل نہیں سکی، انہوں نے عوام کا عتاب، لوگوں کی ملامت، تکفیر کے فتوے، مقاطعہ اور ایذا رسانی سب کچھ گوارا کیا، مگر اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج لاکھوں کی تعداد میں ایک طبقہ جو زیادہ سنجیدہ، باوقار اور صاحبِ فکر ہے ان بدعات سے محفوظ ہے، اور یہ بدعات ابھی تک مسلمانوں کی زندگی میں مستند اور مسلم نہیں ہو سکیں اللہ تعالیٰ ان خادمینِ شریعت اور ان محافظین دین کی تربتیں ٹھنڈی رکھے اور ان کو امت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے ؎

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آج ہمیں ان کی بصیرت، ان کی فراست، ان کے دینی تفقہ اور ان کے رسوخ فی العلم کی قدر آتی ہے کہ انہوں نے اپنا فرض کس خوبی سے انجام دیا من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضیٰ نحبہ و منھم من ینتظر و ما بدلوا تبدیلا۔

مجھے پہلے تو آپ سے یہ کہنا ہے کہ یہ آپ کا بڑا عزیز اور محبوب سرمایہ ہے۔ انہوں نے اپنی جانوں کو حصار بنا کر اس باغ کی حفاظت کی ہے۔ انہوں نے اپنے خون سے اس کے درختوں کو سینچا ہے اور ہمیں بتلا دیا کہ شریعت کے باغ کی رکھوالی اس طرح کی جاتی ہے ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخون دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

عزیزو! ہمیں اس سرمایہ کو سینہ سے لگا کر رکھنا چاہئے اور اپنے ہر سرمایہ سے زیادہ اس

سرمایہ کو عزیز رکھنا چاہئے، مجھے آپ سے دوستانہ شکایت ہے، میرے دردمند دل کو آپ سے گلہ ہے کہ آپ اس سرمایہ سے بیگانہ ہوتے جارہے ہیں، آپ کے بزرگوں کی بہترین صلاحیتیں، اور مبارک ترین اوقات ان نفوس قدسیہ کی طرف سے حمایت و مدافعت میں گزرے، آپ انہیں کی بدولت ایک بڑے گروہ میں معتوب و مغضوب ہوئے اور آپ کے ساتھ اب بھی یہ نسبت لگی ہوئی ہے، مگر اب آپ میں بہت سے ان کے نام اور کام سے بھی واقف نہیں، آپ میں سے کتنے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے حالات اور کارناموں سے واقف ہیں؟ آپ میں سے کتنے بھائیوں نے صراط مستقیم اور تقویۃ الایمان پڑھی ہے؟ آپ میں سے کتنے بھائی توحید و سنت کی صحیح حقیقت سے واقف ہیں، وہ بتلا سکتے ہیں کہ اہل جاہلیت کے ایمان باللہ کی حقیقت کیا تھی، اور قرآن نے کیوں ان کو مشرک کہا، توحید کے کیا مراتب ہیں، اور شرک کے کیا مظاہر ہیں، بدعت کی جامع و مانع تعریف کیا ہے، اور اس کے کیا نقصانات ہیں، آپ کو ان سب مسائل پر تیار ہونا چاہیئے تھا، اور آپ کا مطالعہ اور آپ کی بصیرت عوام سے اس بارہ میں بہت ممتاز ہونی چاہیئے تھی، مگر مجھے خطرہ ہے کہ آپ میں سے بہت سے بھائی ان چیزوں سے بالکل خالی الذہن ہوں گے۔

نئے دور کے فتنے

اسی کے ساتھ ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ اب نیا دور نئے فتنے لا رہا ہے، جاہلیت نئے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے، پہلے اگر بدعات کا معاملہ تھا تو اب کھلی کھلی وثنیت اور اصنامِ قدیمہ کا دور دورہ ہے، یہ حالات ہمارے احساسِ مذہبی، ہماری حمیتِ دینی اور ہمارے عقیدہ توحید کو چیلنج کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جنہوں نے بدعات و رسوم کو کبھی گوارا نہیں کیا وہ ان مشرکانہ رسوم و مظاہر کو کس طرح گوارا کرتے ہیں، اور ان کا رویہ اس بارہ میں کیا ہوتا ہے، ہم اپنے اسلاف کے دینی تصلب اور دینی شجاعت کے معترف ہیں، اور خدا اور خلق کے سامنے اس کی گواہی دینے کے لئے تیار ہیں کہ انہوں نے باطل

کے سامنے گردن نہیں جھکائی، اور ہتھیار نہیں ڈالے، دیکھنے کی بات ہے کہ ہمارے بعد کی نسلیں ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہیں، اور ہم تاریخ میں کیسے نقوش چھوڑ کر جاتے ہیں۔

دورِ جدید کی ذمہ داریاں

عزیزو اور رفیقو! تقدیرِ الٰہی نے ہمارے لئے جس دور کا انتخاب کیا ہے اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھی ہوئی ہیں، لیکن اس کا انعام اور اس کی سرفرازیاں بھی بہت بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ذمہ داریوں سے گریز اور زمانہ سے شکست مردوں کا کام نہیں، جو وقت باقی رہ گیا ہے اس کو تیاری میں صرف کیجئے، خدا نے آپ کو بہترین مربی اور شفیق استاد دیئے ہیں، ایک دینی ماحول اور ایک بہت بڑا ادارہ بخشا ہے، زمانہ کی نزاکت، اور اپنے کام کی عظمت سمجھیئے، اور اپنے کو قیمتی اور کارآمد بنائیے، تاکہ امت کے لئے قیمتی اور کارآمد ثابت ہوں۔

غافل منشیں ، نہ وقت بازیست
وقتِ ہنر است و کارسازیست

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری اور ان کی مطلوبہ صفات

وہ تقریر جو جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ وفضلائے شہر اور طلبائے عزیز کے سامنے جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی میں کی گئی۔ جس میں مولانا مرحوم نے علماء کو ان کی مسئولیات سے خوب آگاہ فرمایا ہے اور ان کی مطلوبہ صفات کی نشاندہی بھی فرمائی ہے

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعی بدعوتھم الی یوم الدین۔

امابعد! میرے قابل احترام بزرگو اور قابل محبت بھائیو، اور عزیزو!

میں اس وقت ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور اس تعارف کے بعد جو مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی زیدت فیوضہ[1] نے میرے خاندان کا کرایا اس کے بعد مجھے اور بھی قرب اور موانست محسوس ہوتی ہے، کم از کم درجہ یہ ہے کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عزیز طلباء اور رفقاء کار اساتذہ کے سامنے بیٹھا ہوں اور ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں بہت شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے ان عزیزوں اور بھائیوں سے باتیں کرنے کا موقع دیا۔ اس کا امکان تھا کہ آپ میری صحت کی

[1] مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے بعد ''مفتی اعظم پاکستان'' کہے جاتے ہیں۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے باعث صد افتخار استاد مولانا حیدر حسن خان ٹونکی کے پوتے۔

رعایت یا میری مشغولیت کے خیال سے مجھے دعوت دینا مناسب نہ سمجھتے، لیکن بہت اچھا ہوا کہ آپ نے یہ زریں موقع مہیا کیا۔

اب میں بغیر کسی معذرت اور تواضع کے کچھ حقیقتیں اور کچھ تقاضے آپ کے سامنے رکھوں گا، جو میں نے اپنے کراچی کے قیام کے چار دن کے مطالعہ اور مشاہدہ سے اخذ کئے ہیں۔

سیاسی اصطلاحات اور سیاسی تصورات اپنی جگہ پر ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ملتِ ہندیہ اسلامیہ کے علماء کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کے لئے تقدیر الٰہی نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان میں رہے، تاکہ وہاں دعوت اسلامی کا فرض انجام دے، اور مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مشغول رہے، دوسرے حصہ کے لئے قدرت الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ اس ملک میں جہاں پہلے بھی مسلمان (اکثریت میں) تھے (یا کہ اسی راستہ سے برصغیر میں آئے تھے) ملت کی تعلیم وتربیت کا فرض انجام دے اور عالم اسلام کے لئے ایک آزاد اور مثالی اسلامی ملک کا نمونہ پیش کرنے میں مدد اور رہنمائی کرے۔

عزیزانِ گرامی! دنیا کے صالح وصحتمند تغیرات وانقلابات اور انسانی عزیمت کی فتوحات کی تاریخ پر اگر کوئی کتاب مستقل طور سے لکھی جائے تو نائبین انبیاء اور افرادامت کی زبان سے جو جملے نکلے ہیں ان میں ایک جملہ کو سب سے نمایاں اور ممتاز مقام دیا جائے گا اور اس کو آب زر سے لکھا جائے گا۔ یہ جملہ ایسا ہے جس نے حالات کی رفتار کو ایسا بدلا ہے جس کی مثال مِلل وادیان کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ جزیرۃ العرب کے ایک حصہ میں اور بعض قبائل میں ارتداد نے سر اٹھایا۔ یہ نازک ترین مرحلہ تھا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے قریب ہی زمانہ میں اسلام کے قلب وجگر میں ایک شگاف پیدا ہو رہا تھا۔ یہ بڑی نازک صورتحال تھی۔ ابھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمایا ہے اور اس کو کچھ ہی مہینے گزرے ہیں کہ عرب جن کو ساری دنیا

میں اسلام پھیلانا تھا اور جن کو ایک امت مبعوثہ کی طرح اسلام کی دعوت دینی تھی، وہ خود ارتداد کے خطرے سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ایسا نازک وقت پوری تاریخ اسلام میں (وفات نبوی کے بعد سے اس وقت تک) نہیں آیا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے ایک فقرہ نکلا جس نے تاریخ کا رخ اور واقعات کا دھارا بدل دیا اور خطرہ کا کہرا اس طرح چھٹ گیا جس طرح آفتاب کے نکلنے سے چھٹ جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا (اور تاریخ نے اسی طرح ان الفاظ کو تبرک اور امانت سمجھ کر محفوظ کر لیا ہے) "**اَیُنْقَصُ الدین و انا حی**" کیا دین میں کوئی قطع و برید ہو سکتی ہے اور میں زندہ ہوں) ابوبکر زندہ ہو اور پھر اللہ اور رسول اللہ کے دین میں کوئی قطع و برید ہو کوئی کتر بیونت ہو، کوئی انتخاب کا مسئلہ ہو کہ اس رکن کو لیں گے اور اس رکن کو چھوڑیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی وقت منع زکوٰۃ کا فتنہ نمودار ہوا تھا، مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور ساتھ ساتھ ارتداد پھیلنا شروع ہو گیا تھا، چند مقامات کا نام آتا ہے، مثلاً مدینہ طیبہ، جواثی اور بعض مقامات کا کہ وہاں ارتداد کے اثرات نہیں پھیلے تھے، ورنہ گویا پورا جزیرۃ العرب ارتداد کی لپیٹ میں آ رہا تھا، اس وقت اللہ کے ایک بندے نے اپنی زبان سے یہ کہا۔ یہ تو الفاظ ہیں، لیکن الفاظ کے ساتھ جو دلی درد اور جوش تھا، اس کو تو تحریر میں نہیں ادا کیا جا سکتا۔ یہ ان کے دل کی آواز تھی اور ان کے جذبات کا نقطۂ عروج تھا۔ جس طرح سے کوئی جام لبریز ہو جاتا ہے تو چھلک جاتا ہے، زمین پر قطرے گرتے ہیں وہ ان الفاظ کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبہ! یہ وراثت ہے جو امت کی طرف عمومیت سے اور نائبین رسول اور علماء حقانین کی طرف خصوصیت سے منتقل ہوئی، یعنی ان کو سمجھنا چاہئے کہ ہمارے ہوتے ہوئے کسی ملک میں اسلام کا زوال کسی طرح سے قابل برداشت کیا، قابل تصور بھی نہیں۔ ہم کسی ملک میں موجود ہوں اور وہاں اسلام کا زوال ہو جائے۔ یہ بات ممکن نہیں۔ یہ احساس بنیاد ہے سارے انقلابات اور دینی جدو جہد کی تاریخ کی۔ آپ دعوت و عزیمت

کی تاریخ پڑھتے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ کے خلق قرآن کے عقیدہ کے خلاف سربکف ہو جانے میں، امام ابوالحسن اشعری کے اعتزال کے مقابلہ میں صف آراء ہوجانے میں۔ امام غزالی کے باطنیت اور مادیت کے مقابلہ اور اسلامی معاشرہ کے مختلف طبقات وعناصر کے دینی احتساب کے کارنامہ میں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے رد روافض میں، بعض کلامی مسائل کی تنقیح کی شکل میں، ہندوستان کے اس ایک تجدیدی کارنامہ میں جو تقریباً چارسو سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے اور جس کے اثرات ابھی تک زندہ ہیں شاہ ولی اللہؒ کی مصلحانہ اور مجددانہ دعوت میں، حضرت سید احمد شہیدؒ اور اکابر دیوبند کے اپنے اپنے وقت میں اور رنگ میں اصلاحی وتربیتی جدوجہد اور اشاعت کتاب وسنت اور عقائد صحیحہ کی سرگرمی میں یہی احساس کام کررہا تھا، جس کی ترجمانی صدیق رضی اللہ عنہ نے کی تھی اور ہر دور کے نائبین رسول کو یہ روشنی دکھائی تھی۔ ''**وجعلها كلمة باقية فى عقبه لعلهم يرجعون.**''

علماء اپنا احتساب کریں

اس روشنی میں علماء اپنا احتساب کریں، کہ انہوں نے اس جملہ کو کہاں تک اپنا اصول اور دستورالعمل بنایا؟ وہ یہ دیکھیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ان کے ملک میں اسلام یا اسلامی معاشرہ کے زوال کا کوئی جواز ہے؟ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں ہمارے سامنے بڑی عبرتناک مثالیں ہیں، جن ملکوں میں اسلام کا زوال ہوا، یا وہاں دشمنِ اسلام طاقتیں غالب آئیں آپ اگر تحقیق کریں گے تو ان میں کچھ ایسی چیزیں پائیں گے جن سے اس دور میں سبق لیا جاسکتا ہے۔ ان میں ایک چیز تھی علماء کا شدید اختلاف اور دوسری چیز یہ تھی کہ علماء کا عوام سے رابطہ نہیں تھا، ان کی شخصیتیں اتنی موثر نہیں رہ گئی تھیں کہ عوام کے قلوب میں دین کا احترام اور علماء کا وقار قائم رکھتیں۔ وہ ملک جس نے خواجہ بہاء الدین نقشبندی کو پیدا کیا، جس نے خواجہ عبیداللہ احرار کو پیدا کیا، وہ ملک طاقتور روحانی شخصیتوں

سے خالی ہو گیا تھا، معیار زندگی بہت بلند ہو گیا تھا، مادیت اپنے عروج پر تھی۔ ابھی تک امیر بخارا کا محل باقی ہے اور کمیونسٹ حکومت اسے دکھاتی ہے کہ دیکھئے کس طرح دولت جمع کی گئی تھی، کس طرح سونے چاندی کے ظروف تھے، بقول ان کے عوام بھوکے مر رہے تھے، اور امیر بخارا کے محل میں یہ چیزیں تھیں۔ اسی طریقہ سے آپ اندلس کی تاریخ میں مدینۃ الزہراء اور قلعۃ الحراء کی تفصیلات پڑھیں، خواب وخیال اور جن و پری کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہاں دو بڑے عنصر اسلام کے زوال کا باعث ہوئے ہیں۔ ایک معیار زندگی کی بلندی اور اللہ کی دی ہوئی دولت کا غلط استعمال اور دوسرے یہ کہ اشاعتِ اسلام اور معاشرے کو اسلامی بنانے کے بجائے انہوں نے فنون لطیفہ، شعر وشاعری اور ادبیات وغیرہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی تھی۔ تیسری بات یہ ہے کہ حاکم خاندان میں حکومت کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی، سیاسی پارٹیوں کا وہ عہد نہیں ہے، اب اس کی جگہ سیاسی پارٹیوں نے لے لی ہے، یہ تین عنصر تھے، اندلس کے زوال کے۔ (اس پر اضافہ کیجئے اخلاقی زوال کا) آپ اگر ''صبح سمرقند'' کتاب پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں کیا اخلاقی زوال اور انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔

چند خطروں کی نشاندہی

میں چند خطروں کی طرف نشاندہی کرتا ہوں۔ بعض مرتبہ باہر سے آنے والا اس چیز کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، جو گھر میں رہنے والا محسوس نہیں کرتا ہے۔ آپ روشنی میں ہیں، اگر کوئی شخص باہر اندھیرے سے آئے گا تو اس کی کیفیت دوسری ہوگی اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہر وقت دیکھتے رہنے اور سنتے رہنے سے ایسی مانوس ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی جدت نہیں معلوم ہوتی، اس میں کوئی کشش نہیں ہوتی۔ لیکن باہر سے آنے والا اس کو فوراً محسوس کر لے گا۔ مثلاً یہاں اردو کے سائن بورڈ عام طور پر لگے ہوئے ہیں، آپ کو تو بالکل نہیں محسوس ہوں گے، لیکن ہم ہندوستانی جب یہاں آئیں گے جو انگریزی

یا ہندی کے سائن بورڈ دیکھنے کے عادی ہیں تو وہ ایک خوشی محسوس کریں گے اور کہیں گے کہ ماشاء اللہ یہاں تو ہر طرف اردو ہی اردو نظر آتی ہے، ایسے ہی بعض لوگ تختیاں لکھ کر دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں، تو ان میں جو چیزیں لکھی ہوتی ہیں آدمی غور سے پڑھتا ہے پھر پڑھنا چھوڑ دیتا ہے، مجھے نہ کسی دور بینی کا دعویٰ ہے اور نہ دروں بینی کا، نہ بصیرت و فراست کا، بقول اقبال ؎

میں نہ عارف نہ مجدد، نہ محدث نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پر رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام

ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں باہر سے آ رہا ہوں، اس لئے میری بات توجہ کے قابل ہے۔

اپنے اس تاریخی مطالعہ اور عالم اسلام سے قریبی واقفیت کی بناء پر کہتا ہوں کہ اعتقادی اور سیاسی انتشار اس ملک کے لئے سخت خطرناک ہے۔ یہاں مذہبی گروہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں، بعض بحثیں...... جو علمی انداز میں ہو سکتی تھیں، ان کو عوام میں لے آیا گیا ہے اور ان کی بنیاد پر متحارب کیمپ اور متوازی محاذ بن گئے ہیں۔ یہ سخت خطرناک بات ہے، میں بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس سے آپ کا تعلق ہے۔ میرے احساسات بالکل وہی ہیں جو آپ کے ہیں اور صرف احساسات نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں نے تو وہ جھنڈا بلند کیا جس کی وجہ سے ہم کو نئے نئے لقب ملے اور سخت مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اگر زمین ہی پاؤں کے نیچے سے نکل گئی تو پھر یہ عمارتیں کس پر قائم ہوں گی؟ ایک گروہ یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہے کہ پاکستان ہم نے بنایا ہے، دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ہمیں حق پر ہیں اور ہمارا ہی اس ملک پر اقتدار اعلیٰ

ہونا چاہئے، اگر ٹٹولا جائے (معاف کیجئے گا میں کسی پر حکم نہیں لگاتا) تو اس کے پیچھے حب جاہ کا جذبہ نکلے گا۔ ہمارے بزرگوں نے ملک میں دین کو بچانے کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں اور ضرورت پڑی ہے تو اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے اور دب گئے ہیں، جھک گئے ہیں اور نیچے اتر آئے ہیں، انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ بھائی آپ ہی اوپر بیٹھئے، مگر دین باقی رہ جائے۔ ہمارے بزرگوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مسلک اور ان کے مکتب فکر کے لوگوں کی ہندوستان میں یہی روایت رہی ہے۔ آپ درس کے حلقوں اور علمی مجلسوں میں اختلافی مسائل پر آزادی کے ساتھ گفتگو کیجئے، ان مسائل پر کتابیں لکھئے، مگر ملک کو داؤ پر نہ لگائیے۔ جب کوئی ایسا محاذ قائم کیا جاتا ہے اور اس طرح کی دعوت دی جاتی ہے جس میں احساس برتری یا اظہار برتری ہوتا ہے، تو اس کے مقابل دوسرا محاذ بن جاتا ہے اور وہاں سے صدائے ''ہم چوں من دیگرے نیست'' بلند ہونے لگتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا سارا کام تواضع کے ساتھ تھا، اتّہام نفس کے ساتھ تھا ''ایمان واحتساب'' کے ساتھ تھا، نہ ان کو سیادت وقیادت کا دعویٰ تھا اور نہ یہ کہ ہماری جماعت ہی نے سب کچھ کیا ہے اور ہمیں سب کچھ ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب پڑھئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے مکاتیب پڑھئے، ہندوستان کے اس دور میں جب مسلمانوں کے اقتدار کا چراغ ٹمٹمارہا تھا اور سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی، اس وقت انہوں نے احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ وغیرہ کو جو خطوط لکھے ہیں، ان کو آپ پڑھئے، ان میں کیا درد ہے، احمد شاہ ابدالی کو، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک مفصل خط لکھا ہے، اس میں بتایا ہے کہ مسلمان اس وقت کس بے بسی کی حالت میں ہیں، اس میں انہوں نے کیا مؤثر جملہ لکھا ہے، جس سے ان کی دردمندی اور اخلاص ٹپکتا ہے۔

(میں رسول اللہ کو شفیع بناتا ہوں کہ اللہ کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کیجئے اور ایک مرتبہ آجائیے) چنانچہ احمد شاہ ابدالیؒ انہیں کی دعوت پر آئے اور انہوں نے مرہٹہ

طاقت کی ایسی کمر توڑی کہ آج تک وہ پورے طور پر سر نہیں اٹھا سکی۔ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی ہی تھے اور ان کا درد تھا، اور ان کی بصیرت تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ آپ انہیں کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ملت اور دین کے لئے جس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، وہ پیش کیجئے اور صاف کہئے کہ اچھا بھائی تم ہی صحیح، تمہارا ہی کارنامہ سب سے بڑا ہے، ہم سب مل کر اس ملک کو بچائیں۔ موجودہ خطروں اور اندیشوں میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ علماء اس طرح دست و گریباں ہوں، یہ بات میں اپنے عقائد کے پورے تحفظ کے ساتھ کہتا ہوں الحمدللہ ایک شوشہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں، نہ عبادت کے مسائل میں، نہ اپنے عقائد کے اصول میں، کسی چیز میں کسی مفاہمت کے لئے میں تیار نہیں۔ ایک تو اپنا عمل ہے اور ایک یہ کہ اکھاڑا بنا دیا جائے ،عوام کو آلۂ کار بنایا جائے اور سارے ملک کو میدان جنگ میں بدل دیا جائے۔ ایک کانفرنس ہو رہی ہے یا رسول اللہ کی اور ایک کانفرنس ہو رہی ہے محمد رسول اللہ کی یہ جینے کی باتیں نہیں، اس موقع پر اقبال کا شعر مجھے یاد آ رہا ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

عوام الناس کے ساتھ علماء کا ربط

دوسری بات یہ ہے کہ عوام کے ساتھ آپ کا رابطہ ہونا چاہئے۔ میں نے محسوس کیا کہ علماء کا عوام سے جو ربط ہونا چاہئے اس میں کمی ہے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں علماء کا عوام سے ربط یہاں سے زیادہ ہے۔ وہاں سیاسی میدان میں بھی، علمی ادبی اور تحقیقی میدان میں بھی علماء پیش پیش ہیں اور ان کا مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ علماء سے متوحش نہیں ہے۔ ہم ادبی اور علمی مجلسوں میں جاتے ہیں اور الحمدللہ وہاں ہم کو عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے، عوام سے آپ کا ربط بڑھنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ عوام آپ

کے ہاتھ سے نکل جائیں۔

علماء کی زندگی ممتاز ہو

تیسری بات جو عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہماری زندگی عوام کی زندگی سے ممتاز ہو، دیکھنے والا کھلی آنکھوں دیکھے کہ یہ دنیا کے طالب نہیں ہیں، ان کے یہاں مال و دولت معیار نہیں ہے۔ ہمارے کام زیادہ تر حسبۃ للہ ہوں، جیسا کہ ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے جب تک ہمارے طبقہ علماء میں یہ اخلاقی امتیاز نہ ہوگا، ایثار کا مادہ نہ ہوگا، ان کی شخصیت مؤثر اور قابل احترام نہیں ہوگی، دل و دماغ میں دین کا گہرا اثر و وقار نہیں ہوگا۔ علماء کا وقار اس سے نہیں بڑھے گا کہ یہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہاں اتنے طالبعلم پڑھتے ہیں اور وہاں کے جلسے اتنے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس سے علماء کا وقار نہیں قائم ہوگا۔ علماء کا وقار قائم ہوتا ہے ذاتی نمونے سے، عوام جب دیکھتے ہیں کہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس پر جان دے دی جائے لیکن علماء اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے ہیں، وہ اس کو خاطر میں نہیں لاتے، ہم نے سمجھا ہے کہ دولت سب سے بڑی چیز ہے، ان کے یہاں دولت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے نواب صاحب ڈھاکہ کو جواب دیا تھا۔ نواب صاحب نے کہلوایا کہ آپ مجھ سے مل لیں۔ حضرت نے کہلوایا کہ نواب صاحب سے کہنا کہ آپ کے پاس جو چیز ''دولت'' ہے وہ میرے پاس بقدر ضرورت موجود ہے، لیکن میرے پاس جو چیز ہے وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو آنا چاہئے۔ مجھے آنے کی ضرورت نہیں۔

ایک واقعہ

ایک واقعہ آپ کو اور سنادوں، بڑا مؤثر ہے۔ شیخ سعید حلبیؒ ایک بزرگ عالم تھے، ایک دن دمشق کی ایک مسجد میں سبق پڑھا رہے تھے، اس دن ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف

تھی (یہ واقعہ اگر چہ میرا منہ اس قابل نہیں کہ سنائے لیکن واقعات کے بغیر کام نہیں چلتا چھوٹا آدمی بھی اگر یہ واقعہ سنائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے) ہاں تو شیخ سعید درس دے رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسجد میں جب درس دیا جاتا ہے تو پشت قبلہ کی طرف ہوتی ہے اور سامنے طالبعلم ہوتے ہیں، تو سامنے سے جو آتا ہے، استاد تو دیکھتا ہے طالب علم نہیں دیکھتے، ابراہیم باشا جو محمد علی خدیو، بانی سلطنت خدیویہ کا فرزند تھا اور بڑا باجبروت حاکم وسپہ سالار تھا، جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جس سے لوگ کانپتے تھے۔ وہ دروازہ کی طرف سے مسجد میں داخل ہوا۔ حضرت کے پاؤں میں تکلیف تھی اس لئے دروازہ کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ جب وہ قریب آیا تو طالب علموں نے دیکھا کہ وہ ہے اور اس کے ساتھ حفاظتی دستہ بھی ہے، جلاد اور پہرہ دار بھی ہیں۔ طالبعلم سمجھے کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو، پاؤں سمیٹ لیں گے، حاکم کا بھی ادب ہوتا ہے، شیخ نے بالکل جنبش نہیں کی، پاؤں پھیلائے رہے۔ وہ سامنے آیا اور کھڑا ہو گیا۔ مؤرخ نے لکھا ہے کہ طالب علموں نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے کہ اب جلاد کو حکم ہوگا استاد کا قابلِ احترام خون ہمارے کپڑوں پر نہ پڑے، وہ دیر تک کھڑا رہا۔ اس پر ایسا جلال طاری ہوا کہ کچھ بولا نہیں، سبق سنتا رہا اور پھر چلا گیا، بعد میں شیخ سعید حلبی کے لئے اشرفیوں کا ایک توڑا بھیجا۔ اہل اللہ کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ سلام کہلوایا اور کہا یہ قبول فرمائیے، جو جملہ انہوں نے جواب میں کہا وہ جملہ سننے کے قابل ہے، میں تو کہتا ہوں کہ ایسے ایک جملہ پر غزلوں کے دس دیوان قربان کئے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے کہا " اپنے ولی نعمت سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا" **الذی یمدُّ رجله لا یمدُّ یده**" یہ جملہ اسی طرح نقل ہوا ہے اگر مجھے ہاتھ پھیلانے ہوتے تو میں اس وقت پاؤں نہ پھیلاتا پاؤں سمیٹ لیتا، لیکن یہ علامت ہے کہ میں ہاتھ پھیلانے والا نہیں تھا، جو پاؤں پھیلاتا ہے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے، یہ جوہر علماء میں، دین کے خادموں میں دسویں درجہ میں،

پچاسویں درجہ میں سہی، ہونا چاہئے۔ اگر یہ جوہر نہیں ہے تو میں صاف کہتا ہوں کہ آپ کی ساری علمی قابلیت اور آپ کی ساری خطابت جس میں آپ ممتاز ہیں (سیاسی جماعتوں میں بھی ایسے خطیب ہوں گے) سب بے اثر ہے۔ جب تک کہ آپ کا عملی نمونہ نہ ہو، اہل اقتدار یہ نہ سمجھیں کہ علماء خریدے جا سکتے ہیں، علماء پیسے کے غلام اور دولت کے بندے نہیں ہیں، علماء ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے، علماء کی زندگی ہم سے زیادہ سادہ ہے، علماء ہم سے کم درجہ کے مکانوں میں رہتے، کم درجہ کا کھانا کھاتے ہیں، اس کا اظہار ہونا چاہئے۔ ہمارے اسلاف نے اس کا اظہار کیا ہے، میں اپنے اساتذہ ہی کے واقعات سناتا ہوں کہ میں مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں پڑھتا تھا اور وہاں ہم لوگوں کے لئے کبھی کبھی پر تکلف کھانے پکتے تھے اور چونکہ میرا اقریبی تعلق تھا، مدرسہ کے پیچھے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کا قیام تھا ان کے صاحبزادے مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم سے میرا اقریبی تعلق تھا، وہ ہمارے دوست تھے، مجھے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ آج وہاں فاقہ ہے او یہاں پلاؤ پکا ہے، کیا مجال کہ چاول کی ایک کھیل وہاں پہنچ جائے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت سے دین کی خدمت کا جو کام لیا ہے، وہ انہیں صفات کا نتیجہ ہے، زہد، ایثار، قربانی کا جذبہ، تواضع اور اپنے خلاف بات سن کر ضبط کر لینا، دوسرے کو اپنے سے بہتر اور فاضل سمجھنا۔ ہماری جماعت کا یہ شعار کبھی نہیں رہا ہے کہ "ہم چوں من دیگر نیست" بلکہ ہم نے بڑے سے بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مولانا مدنی سے جب کوئی بیعت کے لئے کہتا تو میں نے حضرت کو بعض اوقات یہ شعر پڑھتے سنا ہے ؎

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
در حیر تم کہ دہقاں بچہ کارکشت مارا

نہ پھول ہوں، نہ گھاس نہ میں سبزہ ہوں، مجھے حیرت ہے کہ دہقان نے مجھے کس کام

کیلئے پیدا کیا، ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اپنے سے شرمندہ ہیں، یہی بڑے سے بڑے اولیاء اللہ کا شعار رہا ہے۔

تعصّبات سے گریز کریں

تہذیبی ولسانی تعصب، صوبائی تعصب بھی اس ملک کے لئے سخت خطرناک ہے۔ اسی تعصب نے بنگلہ دیش کو پاکستان سے کاٹ دیا۔ اس لسانی تعصب، صوبائی تعصب کے خلاف علماء کو دورے کرنے چاہئیں اور اس کے خلاف اسلام کے احکام بیان کرنے چاہئیں، حدیث میں آتا ہے:

''من تعذی علیکم بعذاء الجاھلیة فاعضوہ بھن ابیه ولا تکنوا۔''

زبان نبوت جس پر وحی جاری ہوتی تھی، جس سے قرآن مجید دنیا نے سنا، جس کے متعلق آتا ہے کہ آپ کی زبان سے کوئی نامناسب لفظ نہیں نکلتا تھا، پہلی مرتبہ اور آخری مرتبہ سخت ترین لفظ جو زبانِ نبوتؐ سے نکلے ہیں وہ ہیں، کوئی شخص تمہارے لئے جاہلیت کا نعرہ لگائے اور خاندان، برادری، قوم کی دہائی دے اور اس کام پر ابھارے تو اس کو اس کے باپ کی گالی دو، خالی کنایہ سے بھی کام نہ لو، اللہ اکبر! اللہ کے رسول جن کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور شہد ٹپکتا تھا اور قرآن مجید جن کی زبان سے جاری ہوتا تھا ''ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی'' اتنے سخت لفظ بولیں، مجھے یاد نہیں آپؐ نے کسی مسئلہ میں اتنے سخت لفظ استعمال کئے ہوں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ پاکستان کے صوبوں میں جائیں اور خاص طور پر تمام صوبوں کے بچوں کو یہاں بلائیں اور ان کو پڑھائیں اور ان کو ایسا عالم بنائیں کہ خود بخود ان کو اس عصبیت جاہلیہ سے نفرت پیدا ہو جائے، پھر ان کو اس صوبہ میں بھیجیں جس میں یہ لسانی، جغرافیائی تعصب پایا جاتا ہے۔

اس حمیت جاہلیہ نے ملکوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی اسلامی سلطنتوں کا چراغ گل ہو گیا۔

یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی زبان کا جادو لوگوں کے دل و دماغ پر بٹھا دیں اور اپنی علمی قابلیت کا سکہ جما دیں، لیکن حقیقی احترام عملی نمونہ، سیرت کی بلندی، زہد و استغناء، روحانیت اور اخلاق عالیہ سے پیدا ہوتا ہے علمی و فکری حیثیت سے بھی اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی مؤثر شخصیتیں پیدا ہونی چاہئیں۔ ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اکابر ایسے تھے، ہر وقت اس کی رٹ لگانا اور اس کا وظیفہ پڑھنا کچھ کام نہیں دیتا، میں نے پچھلی مرتبہ یہیں جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی، تحریک سے چلتی ہے۔ ہم پاکستان میں دعوت و مسلک، تاریخ سے چلانا چاہتے ہیں۔ لوگ کہہ دیں گے کہ صاحب سن چکے، بہت سن چکے، سنتے سنتے طبیعت بھر گئی، آپ کے اکابر ایسے ایسے تھے "پدرم سلطان بود، پدرم سلطان بود" بتائیے آپ کون ہیں؟ کام شروع کیجئے، تاریخ بہت سنائی جا چکی، کتابیں بہت لکھی گئیں، پورا کتب خانہ تیار ہے، اب حرکت اور عمل، جدو جہد و قربانی اور پر کشش وسحر انگیز زندگی کی ضرورت ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے

''یہ تقریر پاکستان کی عظیم دینی درس گاہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن (نیوٹاؤن) کراچی میں ۱۳/جولائی ۱۹۷۸ء کو طلبہ کے سامنے کی گئی جس میں جامعہ کے اساتذہ، طلبہ، اراکینِ انتظامیہ کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں کے علماء، اور تعلیم یافتہ حضرات نیز بیرونِ ملک کے ان مندوبین کی بھی معتدبہ تعداد شریک تھی جو اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔''

عزیز طلبہ اور حاضرین مجلس:

دین کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے

اس دین کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر اور مقدر کر دیا ہے کہ اس کے لئے زندہ اشخاص برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ کوئی درخت اس وقت تک سرسبز و شاداب اور زندہ درخت نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ باثمر نہ ہو۔ اس میں نئی نئی پتیاں اور نئے نئے شگوفے نہ کھلتے رہتے ہوں۔ یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کے لئے ہے اور اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، وہ دین مٹ گئے، ختم ہو گئے جنہوں نے روحانیت کے میدان میں، علم کے میدان میں، فکر کے میدان میں، قیادت کے میدان میں زندہ اشخاص پیدا کرنے بند کر دیئے، انسان زندہ اشخاص سے متاثر ہوتا ہے، چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنا چاہئے اور جلتے رہنا چاہئے، اور اگر اس امت کو باقی رہنا ہے تو اس امت

کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندہ اشخاص پیدا کرے۔ اس کا درختِ علم، اس کا درختِ فکر اس کا درختِ اصلاح اور اس کا درختِ روحانیت نئے نئے برگ و بار لاتا رہے، نئے نئے شگوفے کھلاتا رہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت بارانِ رحمت کی طرح ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس کے ابتدائی قطرے مردہ زمین کے لئے زیادہ حیات بخش ہیں یا بعد کے۔

میں تاریخ لکھتا رہا ہوں، میرے شعور اور تصنیف و تالیف کی عمر زیادہ تر اسی کوچہ میں گزری اور میں کہہ سکتا ہوں

ع عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

میں اب بھی اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ اسلاف کے کارنامے، اسلاف کا خلوص و صداقت، اسلاف کا تعلق مع اللہ اسلاف کی استقامت اور اسلاف کی قربانیاں بعد کی نسلوں کے لئے بہترین سرمایہ ہیں اور وہ حیات زندگی کا پیغام دینے والی ہیں، ہم نے ہمیشہ کہا اور مانا کہ ہمارے بزرگ ایسے تھے، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا، ان کا علم اتنا وسیع تھا، وہ ایسے متبحر عالم تھے، یہ سب سر آنکھوں پر لیکن اتنا کافی نہیں۔

فیض مردوں سے بھی حاصل ہوسکتا ہے مگر رہنمائی زندوں ہی سے حاصل ہوتی ہے

جس ادارہ اور مکتب خیال سے میرا تعلق ہے اس نے تاریخِ اسلام کو مرتب کیا، اس تختی برِاعظم (ہند) میں جس ادارہ نے اردو میں تاریخ اسلام مرتب کرنے کی سب سے پہلے سعادت حاصل کی ہے اس سے میرا تعلق ہے، یعنی ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' اور ''دار المصنفین''، کسی اور کی زبان سے تو شاید آپ سوچیں کہ یہ تاریخ سے ناواقف ہے اور تاریخ سے انصاف نہیں کرتا، میری زبان سے سنیئے کہ اسلاف نے جو کچھ کیا اس کو محفوظ رہنا

چاہئے اور اسی آب و تاب کے ساتھ رہنا چاہئے اور نئی نسلوں کو اس سے روشناس کرانا چاہئے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسلاف کے کارنامے جمع کرنے چاہئیں۔ لیکن اس دین کے لئے خدا فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ دین قیامت تک کے لئے ہے لہٰذا اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، روحانیت بھی زندہ انسانوں ہی سے قائم ہے، محققین صوفیاء کی اور مشائخ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ تزکیہ وعلمِ باطن بھی زندہ انسانوں ہی سے حاصل کیا جاتا ہے اور زندہ انسانوں ہی سے اس کی تکمیل ہوتی ہے، ورنہ ایسے ایسے بلند مرتبہ لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے ایک کافی تھا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں حرکت ونمو ہے، زندگی میں تنوع ہے، ابھی ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا، ابھی ایک مرض پیدا ہوا اور ایک مرض گیا، اس لئے جن کا تعلق اس زندہ کائنات اور عالمِ طبیعی سے ٹوٹ چکا ہے وہ ان متحرک اور زندہ انسانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتے، فیض ان سے حاصل ہو سکتا ہے (فیض کے جو طریقے ہیں ان کے ذریعہ) اس میں غلط فہمی نہ ہو لیکن رہنمائی زندہ انسانوں ہی سے حاصل ہوتی ہے، کسی نسل میں سب کچھ ہے، بڑے کتب خانے ہیں، تاریخ کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں لیکن زندہ ہستیاں نہیں ہیں جن کے قلوب سے اور جن کے اجتہاد فکر سے، جن کے تفقہ سے، جن کی بصیرت سے ہم روشنی حاصل کریں، اس نسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

دین تازہ ہوتا رہے گا

حدیث صحیح میں ہے کہ:

"ان اللہ یبعث علی رأس کل مائة سنة من یجدد لهذه الامة أمر دینها"

سنن کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر سو برس میں ایک مجدد بھیجتا رہے گا جو اس دین کو

تازہ کرے گا اور تجدید کا فرض انجام دے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت تو وہ دین کو تازہ کر دے گا، پھر وہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرصہ تک اس کا وجود رہے گا، من یجدد لھذہ الامۃ أمر دینھا" کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آئے اور ہفتہ دو ہفتہ کے لئے دین کا چرچا ہو گیا، اور چلے گئے۔ ان میں سے کسی بھی بزرگ کا حال پڑھیں، کسی کا اثر سو برس تک رہا اور بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کا اثر صدیوں تک رہا۔

ریلوے لائن پر ایک چھوٹی گاڑی چلا کرتی تھی۔ (اور غالباً اب بھی چلتی ہے) جس کو ٹرالی کہتے تھے، لوگ اس کو ڈھکیلتے تھے اور پھر اس پر بیٹھ جاتے تھے اور وہ چلتی اور پھسلتی رہتی تھی، جب وہ رکنے لگتی تھی تو پھر اتر کر دھکا دیتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے، اس سے لائن کا معائنہ ہوتا تھا، اس امت کی گاڑی کو بھی اسی طرح سمجھئے اور اس کو ڈھکیلنے والے اس امت کے علماء اور مشائخ اور مجدد ہیں، یہ اس کو ڈھکیل دیتے ہیں اور وہ خود اپنے پہیوں پر چلتی ہے، یہ نہیں کہ اس کو چلاتے ہی رہتے ہیں، گاڑی خود چلے گی اپنے پہیوں پر، لیکن اس کو ڈھکیلنے اور چلانے کے لئے زندہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی ٹیکنیکل چیز نہیں، زندہ انسان اس کو بڑھاتے ہیں اور ڈھکیلتے ہیں اور وہ اپنے پہیوں پر چلتی ہے کیونکہ ٹرالی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، پٹریوں میں اتنی چکناہٹ اور پہیوں میں اتنی حرکت و سرعت اور چلنے کی اتنی صلاحیت ہو کہ وہ چل سکے اور آدمیوں کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اس کو ڈھکیل سکیں، اور مسافر جو بیٹھے ہوں وہ ایسے ہوں کہ بیٹھے رہیں اور جم جائیں، اس امت کی روایت یہ ہے کہ جب اس پر تعطّل اور بے عملی طاری ہونے لگتی ہے تو کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے اور اس کو دھکّا لگاتا ہے اور پھر وہ خود چلتی ہے اور کچھ دور تک چلی جاتی ہے۔

میں مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ صاحب دونوں کو اس دور کا مجدد سمجھتا ہوں، میں

سمجھتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی علم دین ہے، جہاں کہیں بھی سنت کی دعوت ہے، جہاں کہیں بھی شرک و بدعت سے اجتناب کا جذبہ اور اس سے تنفر ہے، یہ ان دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دیکھئے ایک ایسا بھی انسان تھا جس نے اس زور سے دھکا دیا کہ امت کی گاڑی ساڑے تین سو سال سے برابر چل رہی ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کتنا چلے پھر کوئی اور اللہ کا بندہ پیدا ہوا اور اس کے دھکے سے اور کتنا چلے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا پورا خاندان، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سو ڈیڑھ سو برس بعد پیدا ہوا اور ان کے کام کے اثرات تیرھویں صدی کے ابتداء میں ظاہر ہوئے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فریضہ ہے تمام مدارس کا اور تمام علماء کا کہ زندہ اشخاص پیدا کرتے رہیں۔

پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت

میرے عزیزو! کل میں نے دار العلوم کورنگی میں ایک بات کہی تھی کہ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے علماء ملک میں رہیں کہ وہ نئے مسائل سمجھ سکیں اور نئے مسائل کے حل پیش کر سکیں اور اس میں وہ شریعت کی مدد سے کتاب وسنت کی مدد سے، اصولِ فقہ اور فقہ کی مدد سے رہنمائی کر سکیں، اس لئے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے وہاں ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے متبحر علماء پیدا ہوں جیسے مفتی محمد شفیع صاحب ،مولانا ظفر احمد صاحب عثانیؒ ،مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ

،اور دوسرے علماء جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آئے، پھر اس کے بعد میں نے کہا کہ زمانہ اتنا ترقی کر گیا ہے اور اب زمانہ کے فتنے اتنے سنگین اور زمانے کے چیلنج اتنے شدید ہیں کہ حقیقۃً ضرورت تھی امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی، لیکن اگر حجۃ الاسلام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ

اس وقت نہ پیدا ہوں تو کم از کم اس درجہ کے لوگ پیدا ہوں جن کے نام میں نے لئے۔ لہذا مدارس کا یہ فرض ہے کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں کہ وہ تبحر پیدا ہو، وہ وسعتِ نظر اور عمق اور نظر کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو اور وہ کتاب وسنت کی روح سے واقفیت پیدا ہو، مقاصدِ شریعت سے آگاہی پیدا ہو، بدلے ہوئے زمانہ میں امت کی رہنمائی کرسکیں، محض یہ کہ کتاب میں دیکھ لو، یہ کافی نہیں، اس لئے کہ کتابیں تو اپنے اپنے عہد میں لکھی گئی ہیں، اللہ نے صرف کتاب اللہ کی یہ خصوصیت قرار دی ہے کہ **لا تبلی جدته ولا تنتهی عجائبه** کہ وہ کبھی پرانی نہیں ہوگی، باقی ہر انسانی کتاب میں اس عہد کی چھاپ ہوتی ہے اس عہد کے گھنے سائے ہوتے ہیں، آپ کسی عالم کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے، اگر اللہ نے آپ کو ذوق اور علمی بصیرت دی ہے تو آپ اسے دیکھ کر زمانہ کا تعین کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب فتنۂ تاتار کے بعد لکھی گئی ہوگی، یہ آٹھویں صدی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، ہر صدی کا اسلوب الگ ہوتا ہے، فکر اور علم کا طرز الگ ہوتا ہے، ان کے درجات الگ ہوتے ہیں، یہ مدارس بہت مبارک اور نہایت ضروری ہیں، ہم سب مدارس ہی کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہیں اور میں جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا بات کہہ رہا ہوں، یہ مدارس ہی کا فیض ہے، اول سے آخر تک میری تعلیم اسی نہج پر ہوئی، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں (اور خدا کرے کہ میری بات جتنی ہے اور جس درجہ کی ہے اسی کے مطابق سمجھا جائے) کہ یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کی اس کو ضرورت ہے، اور زندہ انسانوں ہی کے دم سے یہ چلے گا، اسلاف کی عظمت میں رتی برابر کمی کرنا مقصود نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ اس پر قناعت نہیں کرنی ہے کہ اسلاف نے یہ کیا، کوئی مسئلہ پوچھنے آئے تو کہے کہ ہمارے یہاں ایک سے ایک بڑا عالم پیدا ہوا، آسمانِ علم، جبلِ علم، سائل کہتا ہے کہ کنویں میں فلاں جانور گر گیا ہے، تمام محلہ والے پریشان ہیں کتنے ڈول پانی نکالا جائے، آپ کہیں کہ ہمارے

یہاں امام ابوحنیفہؒ پیدا ہوئے، امام زفرؒ پیدا ہوئے اور آخر میں بدائع الصنائع کے مصنف، البحر الرائق کے مصنف اور فتاوی عالمگیری کے مصنف پیدا ہوئے، وہ کہے گا حضرت یہ سب صحیح ہے، لیکن جلدی بتائیے نماز کا وقت بالکل قریب ہے کہ اس کو کس طرح پاک کیا جائے؟ کوئی آپ سے یہ پوچھنے آئے کہ ذرا سی یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا، اس کے معنی بتائیے، آپ کہیں کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا جواب نہیں، عبدالقاہر جرجانی پیدا ہوئے، ابوعلی فارسی پیدا ہوئے، امام زمخشری پیدا ہوئے، حریری پیدا ہوئے اور قاضی فاضل پیدا ہوئے، اور ہندوستان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہوئے ہیں، وہ کہے گا یہ سب ٹھیک ہے لیکن میں کتاب پڑھانے جارہا ہوں، طالبِ علم منتظر ہیں جلدی سے شعر کا مطلب بتائیے، اسی طرح ہر فن کا حال ہے، جس فن کا آدمی آیا تو کہہ دیا کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔

ہر شہر میں متبحر آدمی ہونے چاہئیں

ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں ایسے متبحر آدمی ہونے چاہئیں جو وقت پر مدد کرسکیں، رہنمائی کرسکیں، یہ نہ کرسکیں تو کم از کم کسی عالم کا حوالہ دے سکیں، میں خود یہ کرتا رہتا ہوں، کوئی اہم مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے مدرسہ میں مفتی موجود ہیں ان سے پوچھو "لکل فن رجال" ہر فن کا شخص الگ الگ ہے، وہ فقہ پڑھاتے ہیں، علامہ ابن حزم کے متعلق امام ابن تیمیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے سعی میں رمل و اضطباع کو لکھ دیا ہے، وہ بہت ادب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کو حج کرنے کا موقع نہیں ملا تو ان کو طواف اور سعی میں التباس ہوگیا۔ یہ بات الگ ہے، لیکن ہر چیز میں آپ اسلاف کے کارناموں کی فہرست گنانے لگیں کہ کیسے کیسے آدمی پیدا ہوئے تو اس کی مثال ایسی ہے

کہ کوئی شخص پیاسا ہو اور پانی پینے آئے اور کہے کہ پانی پلا دیجئے تو آپ اس سے کہیں کہ دنیا میں ایسی ایسی سبیلیں لگی ہیں اور ایسی ایسی آئس کریمیں ایجاد ہوئی ہیں، ایسے ایسے مشروبات ایجاد ہوئے ہیں، تو بھائی مشروبات کے نام لینے سے اور اس میں جو ترقیاں آپ کے اسلاف نے کیں اس سے کیا ہوتا ہے، اس کو تو پانی چاہئے، آپ کٹورہ میں دیں یا مٹی کے کوزہ میں دیں، جب جا کر اس کی پیاس بجھے گی۔

خلا پُر کرنے کے لئے جانفشانیوں کی ضرورت ہے

علوم کا زوال بلکہ امتوں کا زوال اسی طرح ہوا کہ جب کوئی گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے والا نہیں آج خطرہ اسی بات کا ہے جو اٹھتا ہے جگہ خالی کر کے چلا جاتا ہے۔ آپ سے کیا کہوں، یہ کہنے کی بات نہیں، ہندوستان میں ہم کیا خلا محسوس کر رہے ہیں، کسی مدرسہ میں شیخ الحدیث کی ضرورت ہے، شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے، کہیں اصولِ فقہ پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، کچھ اللہ کے بندے یہاں آ گئے اور کچھ اللہ میاں کے یہاں چلے گئے، ایک نے انتقال کیا تو دوسرا منتقل ہو گیا، ہمارے حق میں نتیجہ ایک ہوا، مطلب یہ ہے کہ خلا پُر ہونا چاہئے اور اس کے لئے جانفشانیوں کی ضرورت ہے، یہ کام بغیر جانفشانیوں کے نہیں ہو سکتا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ حدیث کا جیّد عالم پیدا ہو، فقہ کا کوئی جید عالم پیدا ہو، تو اس کے لئے پتا پانی کرنے کی ضرورت ہے، اور افسوس ہے کہ اب ہمارے مدارس میں اس کا رواج نہیں رہا، سب کچھ ہے لیکن وہ محنت نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ مبالغہ سہی مگر کسی درجہ میں انہماک ہونا چاہئے، یورپ میں جو ترقیاں ہوئی ہیں اسی لائن سے ان میں بھی استغراق ہے، میں نے واقعات سنے ہیں کہ بعض تحقیقی کام کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی، میرے جاننے والے ایک دوست جرمنی گئے تھے

انہوں نے کہا ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کب کام شروع کرتے ہیں، آپ کا یہ ادارہ کب سے کھلتا ہے، تو اس نے کہا ابھی بتاتا ہوں، وہ اندر گیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ میرا شعبہ کب سے کھلتا ہے، اس نے بتایا، اتنے بجے تو آکر کہہ دیا کہ اتنے بجے سے، میں نے کہا کیوں آپ نے خود کیوں نہیں بتلایا تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں میں اتنی صبح آجاتا ہوں کہ مجھے ہوش نہیں رہتا اور میں گھڑی بھی نہیں دیکھتا، کام کا جوش اتنا غالب ہوتا ہے۔

میرے عزیز طلبہ! یہ انتشار کا دور ہے، آج کل تو بڑی مصیبت یہ ہے کہ آپ یہاں سے جائیے، پچاس چیزیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو انتشار پیدا کرنے والی ہوں گی۔ آپ ایسے حالات دیکھیں گے جو انتشار پیدا کرنے والے ہوں گے آپ ایسی تصویریں دیکھیں گے جو ساری ذہنی یکسوئی ختم کردیں گی، اور اگر ٹیلی ویژن ہو رہا ہے تو سبحان اللہ یا انا اللہ کہہ دیجئے، اس زمانہ کی خوبی یہ تھی کہ انتشار پیدا کرنے والی چیزیں کم تھیں اور لوگوں میں علمی استغراق تھا، میرے ایک مغربی استاد نے بتایا کہ ایک صاحب مغرب (مراکش) میں فقہ مالکی پر کتاب لکھ رہے تھے، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا کہ دوپہر کو وہ گھر جاتے تھے اور کھانا کھاتے تھے اور آجاتے تھے، ایک دن وہ گھر نہیں گئے تو لوگوں نے کہا کہ آج آپ کھانے پر تشریف نہیں لائے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں میں تو آیا تھا! میں نے کھانا بھی کھایا، اب ان کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہوئی، معلوم ہوا کہ مسئلہ سوچتے ہوئے نکلے اور ایک گھر کا دروازہ کھلا تھا اس میں چلے گئے اور وہ لوگ اتنے مشفق اور مہذب تھے کہ انھوں نے کھانا کھلایا اور ان کو بالکل محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا گھر نہیں ہے، اس زمانہ میں علماء کی قدر تھی، ان کو شاید یہ معلوم تھا کہ وہ اس وقت نکلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں، گھر والوں نے دسترخوان بچھایا، ہاتھ دھلائے، انھوں نے کھانا کھایا، ہاتھ پونچھے اور اپنی جگہ آگئے اور یہ

سمجھتے رہے کہ وہ اپنے گھر گئے تھے اور کھانا کھایا تھا۔

ایک واقعہ امام غزالیؒ نے غالباً احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ امام شافعی ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کے گھر آئے۔ امام صاحب کے بچے کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے تھے کہ ہمارے والد ہر نماز کے بعد امام شافعی کے لئے دعا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

''اے اللہ! محمد بن ادریس کو زندہ رکھ، قائم رکھ، ان کی عمر میں برکت دے۔''

وہ بچے سوچتے تھے کہ ہمارے باپ امام وقت ہیں ان کے استاد کیسے ہوں گے جن کے لئے یہ دعا کرتے ہیں؟ تو ایک مرتبہ پوچھا کہ ابا جان! آپ کس کے لئے دعا کرتے ہیں اور کیوں؟ انھوں نے کہا:

"یا بنی انه کالشمس الدینا و العافیة للبدن."

ایک مرتبہ لطیفہ پیش آیا کہ امام شافعی تشریف لے آئے تو گھر والوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھے دولت ملی، بڑی خاطر مدارت کی اور رات کو جب وہ کھانا کھا کے اور باتیں کر کے بستر پر لیٹے تو بچوں نے سوچا کہ والد صاحب بڑا وقت عبادت میں گزارتے ہیں، یہ تو ہمارے والد کے بھی استاد ہیں، ان کی تو پلک بھی نہیں لگے گی، رات بھر عبادت کریں گے، چنانچہ انھوں نے لوٹا بھر کر رکھ دیا کہ رات کو اٹھیں گے، وضو کریں گے، عبادت میں مشغول ہو جائیں گے لیکن وہ صبح تک سوتے رہے، یہاں تک کہ امام احمد بن حنبلؒ آئے اور انھوں نے اٹھایا، وہ اٹھے اور بے وضو کئے ہی نماز پڑھنے چلے گئے، اب تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ یا اللہ قصہ کیا ہے؟ لوٹا دیکھا تو ویسا کا ویسا بھرا رکھا ہے، بڑی حیرت کہ انھوں نے بے وضو نماز پڑھی، اس زمانہ میں اعتراض کرنے کا رواج نہیں تھا، جب وہ مجلس میں آ کر بیٹھے تو امام احمد بن حنبل سے امام شافعی نے کہا کہ ابو عبد اللہ رات کو عجیب واقعہ پیش آیا جب تم مجھے لٹا کر گئے تو فلاں حدیث کی طرف میرا ذہن چلا گیا، میں نے

اس سے مسائل استنباط کرنے شروع کئے، رات بھر مسائل استنباط کرتا رہا، مسائل کی ایک بڑی تعداد بیان کر کے فرمایا کہ اتنے مسائل استنباط کر چکا تھا کہ صبح ہوگئی، اسی لئے شاعر نے کہا ہے ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد درنو شتن شیر، شیر

اگر بدگمانی کا دور ہوتا تو اخبار میں چھاپ دیا جاتا کہ ایسے ایسے علماء ہیں جو بے وضو نماز پڑھ لیتے ہیں، بلکہ پڑھا بھی دیتے ہیں تعجب نہیں کہ انھوں نے نماز پڑھائی بھی ہو، بھلا ان کی موجودگی میں کون نماز پڑھاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس خلا کو پُر فرمائے

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

دین وعلم کا دائمی رشتہ

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين، وعلى آله واصحابه اجمعين، ومن تبعهم بإحسان الى يوم الدين. امابعد ......

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ٥

''اور یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں چند اشخاص نکل جاتے تا کہ دین کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس ہوتے تو ان کو ڈر سناتے تا کہ وہ حذر کرتے۔''

(توبہ آیت ۱۲۲)

اسلام اور علم کا رابطہ

میرے عزیز بھائیو، اور دوستو!

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسلام علم کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ علم بھی اسلام کے بغیر نہیں رہ سکتا ہے لیکن کسی اور مجلس میں شرح و

بسط کے ساتھ کہنے کی بات ہے، وہ علم علم ہی نہیں جو وحی کی سرپرستی اور وحی کی رہنمائی بلکہ وحی اور علوم نبوت کی انگلی پکڑ کر نہ چلے اور جس پر وحی کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو۔ اور جو وحی اللہ تبارک وتعالیٰ کے بھیجے ہوئے اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کی سرپرستی میں، اتالیقی میں، نگرانی میں، رہنمائی میں نہ ہو وہ علم علم نہیں۔

ع علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت است

اس وقت ہمارا آپ کا موضوع ہے کہ اسلام بغیر علم کے نہیں رہ سکتا اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے آپ مچھلی کو پانی سے نکال دیجئے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ مر جاتی ہے، تو اسی طریقہ سے اسلام کے لئے علم ضروری ہے خدا کی صحیح معرفت ہو، اس کی ذات وصفات کی صحیح معرفت ہو۔ اس کا بندوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ بندوں کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہئے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ آغاز کیا ہے؟ انجام کیا ہے؟ ابتداء کیا ہے؟ انتہاء کیا ہے؟ انسان کہاں سے آیا اور اس کو کہاں جانا ہے، اور پھر کیا ہونا ہے اس سب کا علم ہونا ضروری ہے اسی لئے اسلام علم کو چاہتا ہے اور وہ علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔

پہلی وحی میں علم وقلم کا تذکرہ

پہلی وحی جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں نازل ہوئی اور سینکڑوں برس کے بعد آسمان وزمین کا پہلی مرتبہ جو رشتہ قائم ہوتا ہے زمین کے لئے کچھ لینے کے لئے اور آسمان کے لئے کچھ دینے کے لئے، برسوں کے بعد دو بچھڑے ہوئے ملتے ہیں وہ ایک دوسرے کو کیا کیا فغاں وفریاد، شکایتیں اور حکایتیں سناتے ہیں، لیکن اس وقت جو یہ دو بچھڑے ہوئے ملے تو آسمان سے اس نبی کو جس کو زمین والوں کا رشتہ اللہ سے جوڑنا تھا سب سے پہلا پیغام ''اقرا'' کی شکل میں ملا۔ اس سے آپ علم وقلم کی اہمیت وعظمت سمجھئے جن کو اس پہلی وحی اور پیغام آسمانی میں عزت کا مقام دیا گیا۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہا تھا

ع کتب خانۂ چند ملت بشست

لیکن آپ نے کتب خانے اتنے دھوئے نہیں جتنے کتب خانے بنا دیئے، وہی کتب خانے دھوئے جن کو دھونا چاہئے تھا، لیکن دھو کر کے پھر کیا دیا؟ نور دیا، یقین دیا، اللہ کی صحیح معرفت عطا فرمائی، انسان کو انسان بنا دیا اور جاہل انسان بلکہ حیوان صفت انسان کو دنیا کا معلم بنا دیا۔ بقول اکبر ؎

جو نہ تھے خود راہ پر غیروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

تعلیم و تعلم کی ضرورت اور اس کا مقام

دنیا کی کوئی قوم علم سے مستغنی ہو سکتی ہے کہہ سکتی ہے کہ ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم پر کوئی فرض واجب نہیں، ضروری نہیں ہے کہ ہم پڑھیں اور پڑھائیں۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام کریں لیکن روئے زمین پر قیامت تک مسلمان کہیں بھی آباد ہوں وہ چاہے مقاماتِ مقدسہ ہوں، چاہے جزیرۃ العرب ہو، چاہے یورپ و امریکہ ہو، چاہے ہندوستان کی سرزمین ہو، شہر ہو قصبہ ہو، دیہات ہو جہاں مسلمانوں کے چار گھر بھی آباد ہوں، بلکہ جہاں چار مسلمان بھی پائے جاتے ہیں وہاں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ "اِقْـرَأْ" کا سامان کریں۔ وہ اس کی تعمیل کریں کہ پڑھو، یہ کام شفاخانوں کے قیام سے زیادہ ضروری ہے اور آپ کی دکانوں سے زیادہ ضروری ہے، یہ کارخانوں سے زیادہ ضروری ہے، اس میں سے کسی چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مامور نہیں فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ تجارت کرو، کماؤ کہ یہ بہت بڑی طاقت ہے، دینِ حق کو غالب کرنے کے لئے خوب پیسہ پیدا کرو، خوب دولت جمع کرو، اپنی امت کو سبق سکھاؤ، یہ کہیں نہیں فرمایا۔ فرمایا تو یہ فرمایا "اِقْـرَأْ" (پڑھو) اب بتائیے کہ علم کا کیا مقام ہوا؟

اچھا پھر وہ علم جو منجانب اللہ حاصل ہوتا ہے، ایک علم لدنی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کسی کسی

کا سینہ کھول دیتا ہے اور اسے علوم کا گنجینہ بنا دیتا ہے ان کی زبان سے حکمت ابلتی ہے، یہ سر آنکھوں پر، ہم ان کو اپنے سے ہزار درجہ افضل مانتے ہیں۔ ان کا سایہ پڑ جائے تو ہم سمجھیں کہ ہم آدمی بن جائیں گے، لیکن "اِقْـرَأْ" اپنی جگہ پر رہے گا۔ ان حضرات کو بھی ضرورت ہے کہ وہ مسئلہ پوچھیں عالموں سے بڑے بڑے صاحبِ ادراک، صاحبِ کشف بھی نماز کا مسئلہ پوچھتے ہیں۔

یہ "اِقْرَأْ" کا سلسلہ ایسا ہے کہ نبی اُمّی سے شروع ہو کر آخری اُمّی تک (یعنی جو لفظاً بے پڑھا ہے) جاری رہے گا۔ کتنے ہی دنیا میں انقلابات آئیں سلطنتیں بدلیں، تہذیبیں بدل جائیں۔ اور انقلاب عظیم برپا ہو جائے۔ زبان بدل جائے، تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہے گا!

حفاظت قرآن کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے کسی کتاب اور کسی زبان کی حفاظت کی گارنٹی نہیں لی۔ قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے تو حفاظت کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بس کتاب رہے نہ کوئی اس کو سمجھے نہ سمجھائے۔ اس کے لئے سمجھنے سمجھانے والے بھی ہونے چاہئیں، اور وہ کتاب الفاظ میں ہے تو زبان بھی ہونی چاہیے۔ الفاظ بغیر زبان کے نہیں رہتے۔ اس لئے عربی زبان بھی رہے گی کتنی زبانیں مٹ گئیں، لیکن شریعتِ الٰہی کی زبانِ عربی اپنی جگہ پر ہے اور اس کا علم اپنی جگہ پر ہے، تو ہر جگہ کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں مقدور بھر دینی تعلیم کا انتظام کریں، ہر جگہ مسائل بتانے والے نہ صرف یہ کہ موجود ہوں بلکہ ان کا سلسلہ جاری رہے یہ بھی مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے۔ مدارس کا سلسلہ ضروری ہے یہ کوئی شوقیہ تفریحی کام نہیں ہے یہ خالص دینی ضرورت ہے، میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ مساجد کے بعد نمبر دو چیز یہی ہے اور سچ پوچھئے تو مساجد کی پشت پناہ بھی یہی مدارس ہیں اگر مدارس نہ ہوئے تو آپ کو امام کہاں سے ملیں گے؟ اور اگر ایسے امام مل گئے جو بس

نماز پڑھا دیں تو جمعہ پڑھانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ شرائط ہیں اس کے کچھ اور احکام ہیں پھر اس کے بعد مسائل کے لئے آپ کہاں جائیں گے، مسجدوں ہی میں تو جائیں گے امام صاحب سے پوچھنے امام صاحب کو کوئی علم نہیں ہے بس تھوڑی سی سورتیں یاد کرلیں اور نماز پڑھانا آ گیا تو یہ مدارس درحقیقت مساجد کے بھی محافظ ہیں اور مساجد کو بھی غذا پہنچاتے ہیں۔

فضلائے مدارس کا فرض

میں نے آپ کے سامنے شروع میں آیت پڑھی تھی وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ط یہ تو نہیں ہوسکتا، یعنی ایک غیر ممکن سی چیز ہے غیر طبعی چیز ہے کہ سب مسلمان سب کام چھوڑ چھاڑ کر دین سیکھنے نکل جائیں، نہ دکان پر کوئی بیٹھنے والا ہو، نہ کوئی خرید و فروخت کرنے والا، نہ کوئی ضرورت پوری کرنے والا، معلوم ہوا سارا شہر چلا گیا مدرسہ کا طالب علم بن کر، یہ ہونے والی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایسی بات نہیں کہتا نہ اس کا مکلّف قرار دیتا ہے نہ اس کا مطالبہ کرتا ہے، فرماتا ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام مومنین سب کے سب گھر چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔ ”فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ“ پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہو جائیں کہ وہ دین سیکھیں ، لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ دین کی سمجھ حاصل کریں یعنی وہ دین کے احکام و مسائل کا علم حاصل کریں۔ ”وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ“ جا کر اپنی اپنی بستیوں میں ہدایت کا کام کریں ، وعظ و ارشاد کا کام کریں۔ اور ان کو خطرات سے مہلکات سے بچائیں شرک کے مہلکات سے کفر کے مہلکات سے، ان عقائد سے ان رسوم سے ان اعمال سے کہ جن سے آدمی بالکل اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ اسلام کی سرحد پار کر جاتا ہے اور مسلمانوں میں اس کا شمار نہیں رہتا، بعض چیزوں سے ایمان چلا جاتا ہے بالکل آدمی نے گویا ارتداد اختیار کرلیا ”لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ“

عالم ہی بتا سکتا ہے مسلمانوں کا کوئی بہت بڑا شہر ہو، تجارتی مرکز بھی ہو کھاتے پیتے مسلمان رہتے ہوں لیکن ایک مدرسہ بھی وہاں نہ ہو دین کے موٹے موٹے احکام سکھانے کے لئے اور قرآن مجید پڑھانے کے لئے تو پورا شہر گنہگار ہوگا، بس یہی فرض کفایہ کے معنی ہوتے ہیں، پورا شہر خطرہ میں ہے اور خدا کے یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ اتنے بڑے شہر میں مدرسہ قائم کرو۔ یہ بات ایسی نہیں جیسے تہجد پڑھنا بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ تہجد تو فرض نہیں ہے اللہ توفیق دے کوئی پڑھے تو اچھی بات ہے ایسے ہی ان لوگوں نے مدرسہ قائم کر دیا ہے گویا تہجد پڑھا یا کوئی خیرات کر دی، یہ بنیادی کام ہے یہ آپ کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے کہ آپ اپنے یہاں بقدرِ ضرورت کم سے کم دینی تعلیم کا انتظام کریں آپ کے شہر میں ایسے لوگ ہوں جو وقت پر مسئلہ بتا سکیں اور مسلمانوں کو کوئی خطرہ پیش آجائے، حلال و حرام، کفر و ایمان کا کوئی مسئلہ آجائے تو اس میں وہ رہنمائی کر سکیں، بتا سکیں کہ یہاں سے یہاں تک تو اسلام ہے اس کے بعد کفر ہے اور اگر تم سمجھنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بتاتے ہیں۔

"قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ"

(البقرہ ۔ ۲۵۶)

یہ رشد ہے اور یہ غی ہے، یہ اسلام ہے اور یہ جاہلیت ہے، یہ بتا سکیں، اس کے بعد کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔

عوام کی ذمہ داری

بنیاد رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے بنیاد رکھ دی ہماری ایک ذمہ داری ہوگئی آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں یہ بنیاد تو ہم آپ کی طرف سے رکھیں گے گویا آپ کے ہاتھوں سے آپ سب تو ہاتھ نہیں لگا سکتے تو ہم آپ کی طرف سے آپ کی نیابت کریں گے خدمت

ہم کریں کہ وہ پتھر رکھ دیں۔ لیکن آپ کا کام ختم نہیں ہوتا، بلکہ سچ پوچھئے تو اس سے شروع ہوتا ہے اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس مدرسہ کو ترقی دیں، باقی مشورہ کا معاملہ ہے استادوں کا مسئلہ ہے کتابوں کا مسئلہ ہے، نصاب کا مسئلہ ہے کبھی جلسوں میں آنے جانے کا مسئلہ ہے اس کے لئے ہم حاضر ہیں۔ آپ کو شکر گذار ہونا چاہئے کہ ایک بہت بڑی مصیبت سے ایک قومی و ملّی کوتاہی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بال بال بچا لیا اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو خدا کے یہاں پرسش ہوتی۔

سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے دینی تعلیم کا انتظام

اسی طریقہ سے آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ بچوں کو خواہ اس مدرسہ میں نہ پڑھتے ہوں اسکولوں میں پڑھتے ہوں، ان کی بقدرِ ضرورت دینی تعلیم کا انتظام آپ کے ذمہ فرض ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا............

(التحریم. ٦)

''اے ایمان والو! اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو جو تمہارے ذمہ ہیں ان سب کو آگ سے بچاؤ۔''

یہ آپ کا فرض ہے آپ ان کے لئے صبح و شام کوئی انتظام کریں۔ کوئی ٹیوٹر رکھیں، کسی مولوی صاحب کی خدمات حاصل کریں، بہر حال اُن کے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے آپ کو کچھ سامان کرنا چاہئے۔ ایسی ہی کچھ چیزیں اور ہیں، مثلاً اس ملک میں موجودہ دور میں اور اس جمہوری ملک میں اور ایک ایسے ملک میں جہاں ہم اکثریت میں نہیں ہیں بہت سی تحریکیں ہیں، جہاں تبدیلیاں جلدی جلدی ہوتی ہیں، بہت سے چیلنج سامنے آتے ہیں اس ملک میں اس طرح ہم اپنے دین کو بھی بچا سکتے ہیں اور اپنی عزت کو بھی بچا

سکتے ہیں اور اپنی جانوں کو بھی بچا سکتے ہیں اس کے لئے کئی چیزیں ایسی ہیں جن کو آپ کو اختیار کرنا ہوگا اور ان پر عمل کرنا ہوگا لیکن اس وقت خالص دینی تعلیم کے تعلق سے کہتا ہوں کہ اس مدرسہ کو ترقی دینا اس کو تکمیل کی منزل تک پہنچانا اس کے منصوبہ کو پورا کرنا اور اس کو اس قابل بنانا کہ یہ آپ کے پورے جوار کا اس پورے نواح کا ایک مرکزی مدرسہ بن جائے یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔

اسی طریقہ سے اپنے بچوں کو اردو سکھانا اور دینیات کی تعلیم دینا اور سیرت اور صحابہ کرامؓ اور دینی شخصیتوں سے واقف کرانا اور کفر و ایمان کا فرق اور توحید و شرک کا فرق بتانا ضروری ہے۔

اسی طریقہ سے جو بالغ حضرات ہیں ان کو اپنے دین کے لئے بھی اور دینی جذبات کو ترقی دینے کے لئے بھی اور دینی عزم پیدا کرنے کے لئے بھی تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنا اور ان کے اجتماعات میں شریک ہونا اور اس کو وقت دینا اور دینی کتابیں پڑھنا یہ سب بہت ضروری ہے ورنہ ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے بلکہ ایسے دور میں جس میں ہمیں خدا نے پیدا کیا ہے نظر چوکی، آنکھ جھپکی اور آدمی مارا گیا، ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور اس میں بہت وسیع نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور گرد و پیش کے حالات کا پورا جائزہ لینے کی ضرورت ہے زندگی کے دھارے سے الگ ہونا خطرناک ہے اگر مسلمان ماحول سے کٹ گئے اور اپنے خول میں رہنے اور اپنی خیالی دنیا میں بسنے لگے کہ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دیجئے ہم تو نماز روزہ کرتے ہیں اس طرح آپ ملک میں نہیں رہ سکتے اس ملک میں ہر وقت حالات کو دیکھتے رہیں اور اپنے مخلص رہنماؤں کی باتوں پر دھیان دینا ہے جن کو صرف اس سے دلچسپی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس انعام سے سرفراز فرمایا اور جو امانت ہمارے سپرد کی وہ ہم محفوظ رکھیں اور اس کو لے کر ہم دنیا سے جائیں اور سرخرو ہوں اور جن کو صرف اس بات سے دلچسپی ہے ان کے مشوروں کو آپ

مانیں اور غور سے سنیں۔ اس ملک میں ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور دیکھتے رہیں کہ کیا ہو رہا ہے، کیا چیز ایسی پیدا ہو رہی ہے کہ جس سے ہم کو بھی اور اگر ہم بھی رہ گئے تو ہماری آئندہ نسلوں کو مسلمان رہنا مشکل ہو جائے۔ اس کا برابر جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔

ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو دین کی قدر دانی نصیب فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دعوتِ ایمان اور پیامِ انسانیت

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعیٰ بدعوتھم الی یوم الدین ۔ امابعد

دعوت کی خاصیت

دوستو اور بھائیو! آج میں آپ کی خدمت میں دو باتیں عرض کروں گا۔ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح اشیاء میں خاصیتیں پیدا کی ہیں اور وہ ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں برسوں سے چلی آ رہی ہیں، زمانہ میں کتنے انقلابات آئے، سلطنتوں کے چراغ گل ہو گئے، کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں خلیج عربی کا کوئی وجود نہ تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبھی شام اور ہندوستان کی سرحد ایک تھی، مصر اور ہندوستان کی تہذیب میں جو مماثلت پائی جاتی ہے ان کے عقائد میں بلکہ مزاج تک میں جو اشتراک ہے اس سے لوگوں نے اندازہ کیا ہے کہ کسی زمانہ میں مصر و ہندوستان قریب تھے اور یہ ایک تختہ تھا جو یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا۔ یہ سب انقلابات ہوئے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اشیاء میں جو خصوصیات رکھی تھیں وہ آج تک چلی آ رہی ہیں، پانی آگ بجھاتا ہے، آگ جلاتی ہے، سنکھیا اور زہر کی جتنی قسمیں ہیں وہ کام تمام کر دیتی ہیں، سردی گرمی کے وہی اوصاف ہیں اور انسانوں کو کھانے کی ضرورت ہزاروں لاکھوں برس سے ہے، غلہ ہمیشہ سے پایا جاتا ہے، انسان کے لئے اس کے ماحول میں جو چیزیں رکھ دی گئی ہیں ان سے اس کا تعلق

بہت قدیم ہے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اخلاق میں، اعمال میں اور معنویات میں تاثیر رکھی ہے، ایمان میں اس نے جو اپنے تعلق کی صفت رکھی ہے اپنی یاد میں، اپنے ذکر اور اپنی عبادت میں، توجہ میں جو خصوصیت رکھی ہے وہ لاکھوں برس سے ہے اور اگر ابھی دنیا کے مقدر میں ہزاروں برس باقی رہنا ہے تو یہ خاصیت رہے گی۔

تاریخ کی کسی ایک شہادت سے نہیں معلوم ہوتا کہ ان اخلاق، اعمال اور عقائد کی خاصیت کسی زمانہ میں کچھ اور تھی، تاریخ تو کیا بتاتی کوئی صحیفہ آسمانی بتاتا کہ توحید میں جو خاصیت ہے وہ کبھی شرک میں تھی جو نیک اعمال میں خاصیت ہے کبھی بداعمالی میں تھی، جو ہمدردی میں خاصیت ہے وہ کبھی بے دردی میں تھی، جو عدل میں خاصیت ہے وہ کبھی ظلم میں تھی کوئی آسمانی صحیفہ یہ نہیں بتاتا، توریت ہو، انجیل ہو، صحف ابراہیم ہوں، زبور ہو اور پھر آخری صحیفہ قرآن مجید ہو، سب یہ بتاتے ہیں کہ ایمان میں توحید میں، نیک اعمال میں، عبادات میں، عدل میں، انصاف میں، ہمدردی میں، محبت میں یہ ہے، جب یہ حقیر اشیاء جو انگلیوں سے مسلی جاسکتی ہیں، پیروں سے روندی جاسکتی ہیں جنہیں استعمال کر کے انسان نہایت خراب حالت میں پہونچا سکتا ہے جن کو جانور چر جاتے ہیں، کھا جاتے ہیں، جن کو پانی بہالے جاتا ہے ان میں یہ خاصیت ہے تو وہ چیزیں جو خدا سے اور اس کی ذات عالی سے تعلق رکھتی ہیں ان میں یہ خاصیت کیوں نہ ہوگی۔

صفات میں تغیر پیدا کیجئے

میرے دوستو اور بزرگو! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اور آپ کے لئے دنیا میں نجات کا، عزت کا اور حفاظت کا راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم خدا کے پیغمبروں کی تعلیمات پر چلیں اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کریں جن کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

"وانّ جندنا لهم الغالبون.وان جندنا لهم المنصورون."

"بے شک ہمارا ہی لشکر غالب آنے والا ہے بے شک ہمارے ہی لشکر کی مدد کی جائے گی۔"

وہ اخلاق پیدا کریں جو دلوں کو کھینچتے ہیں، جو دشمنوں کو دوست بناتے ہیں، ہمارے اندر سچی ہمدردی پیدا ہو، بے لوث خدمت کا جذبہ پیدا ہو، ہمارے اندر درد پیدا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے ہم اپنے اندر سے حسد نکال دیں، کینہ کو نکال دیں، خودغرضی کو نکال دیں، ہماری سطح بلند ہو جائے، ہم مال و دولت کے پرستار نہ ہوں، ہم نوکریوں اور آسامیوں کے عبادت گزار نہ ہوں، ہم عروف و اقبال، طاقت و دبدبہ اور اقتدار کے پجاری اور غلام نہ ہوں، ہم ابن الوقت اور موقع پرست نہ ہوں، ہم پیسہ پر جان دینے لینے والے نہ ہوں، یہ اخلاق اگر ہم اپنے اندر پیدا کرلیں گے تو سارے عالم کی کیفیت بدل جائے گی اور ہم خدا کے محبوب بن جائیں گے اور پھر آسمان سے صدا آئے گی کہ مجھے اپنے فلاں بندہ سے محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو، اس سے بڑھ کر کوئی شمشیر، اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر پیغمبر سے لے کر اولیاء اللہ تک اور اولیاء اللہ سے لے کر عام مسلمانوں تک نہ کبھی تھی اور نہ کبھی ہوگی، کوئی سیاسی رہنما کوئی دنیا کا فلسفی و دانشور آپ کو اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتا اور کسی کے مشورہ سے آپ کو فائدہ نہیں ہو سکتا جو آپ کو خدا کے پیغمبروں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے ہے، یہ عالم بہت وسیع ہے اور اس کثرت میں اتنا انتشار ہے اور اس میں اتنی چیزیں اتنی اکائیاں پھیلی ہیں کہ آپ ان کو سمیٹ بھی نہیں سکتے، آپ ایک شہر کی ایک محلّہ کی بھی اکائیوں کو نہیں سمیٹ سکتے، اس کثرت میں اگر آپ وحدت پیدا کریں، اس کثرت میں اگر اس ذات واحد سے آپ کا تعلق پیدا ہو جائے اور اس کو آپ اپنا بنالیں تو پھر سارا عالم آپ کا بن جائے گا۔ صفات میں جب تک تغیر نہ ہوگا حالات میں تغیر نہ آئے

گا۔آپ اپنی صفات میں تغیر پیدا کیجئے ،اپنی افادیت ثابت کیجئے اوراس لئے ثابت نہ کیجئے کہ آپ کو فائدہ ہو بلکہ آپ مجسم افادیت بن جایئے ،ثابت کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے،ثابت کرنا بھی ایک طرح کا تصنع ہے،نہیں آپ مفید بن جایئے یہ نہ دیکھئے کہ دوسروں نے آپ کو مفید مانا یا نہیں ، پانی کب کہتا ہے کہ میں پیاس بجھاتا ہوں ، کیا آپ نے کبھی سنا ہے پانی کے وکیل آئے ہوں ، پانی کے مبلغ آئے ہوں ، پانی کے سفیر آئے ہوں کہ پانی یہ کہتا ہے کہ میں بہت کام کی چیز ہوں مجھے پینا چاہئے ، مجھ سے پیاس بجھتی ہے؟ آگ نے کبھی کہا تھا یا اپنا سفیر بھیجا تھا کہ میں کھانا پکاتی ہوں ، میں بہت کام نکالتی ہوں ، یہ سب بے زبان چیزیں ہیں یہ نہ کبھی بولی ہیں اور نہ بولیں گی مگر ان کی افادیت مسلم ہے، ساری دنیا ان کی پابند اور محتاج ہے ، ایسے ہی مسلمان کسی ملک میں بھی محبوب بن کر رہنا چاہتے ہیں تو اپنی صفات میں تغیر پیدا کریں ۔تمام سیرت کی کتابیں اور تاریخ کی کتابیں اس کے دلائل سے بھری ہوئی ہیں، آپ نے بارہا یہ ایمان افروز واقعات سنے ہیں میں صرف دو واقعات سناتا ہوں ۔

داعی کے سامنے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی

حضرات گرامی !ایک واقعہ تو دہی دجلہ والا ہے جب مسلمان مدائین فتح کرنے کے لئے دجلہ کے قریب پہنچے تو مدائن کا شہر سامنے تھا لیکن پل توڑ دیئے گئے تھے، کشتیاں وہاں سے ہٹادی گئیں تھیں، مسلمانوں کے لئے اس کے پار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی ، آپ کو معلوم ہے کہ جزیرۃ العرب کے رہنے والے عرب دنیا میں گھوڑے کے سب سے بڑے شہہ سوار تھے لیکن پانی سے ان کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا یہ پیرنا کیا جانیں ،اور سمندر بھی ہر جگہ نہیں ہے، صرف ساحل عرب پر ہے، جو اس کے قریب رہتے ہیں اور وہ بھی اکثر کشتیوں پر بیٹھنے کے عادی ہوا کرتے ہیں، عام طور پر تو عرب کچھ بھی جانتے ہوں لیکن پیراکی سے ناواقف تھے ،اب سوال یہ ہے کہ مدائن اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ سامنے

ہے مگراس میں جایا کیسے جائے ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے وہاں لشکر چند منٹ کے لئے روکا اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، میں یہ واقعہ کئی بار ذکر کر چکا ہوں، لکھ چکا ہوں مگراس سے بہتر واقعہ تاریخ عالم میں نہیں مل سکتا اور یہ ایسی بولتی ہوئی کہانی ہے ، سچا واقعہ ہے کہ اس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی تو انہوں نے حضرت سلمان کی طرف دیکھا کہ کیا کرنا چاہئے؟ انہوں نے کہا ''ان هـذا الـديـن لـجـديد'' اللہ کا یہ دین اس کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے یہ ابھی ابھی آیا ہے دنیا کو نجات دینے کے لئے میری عقل یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اس کا بیڑا یہیں غرق ہو جائے جس کام کے لئے بھیجا جائے وہ کام پورا نہ ہو بشرطیکہ بھیجنے والا قادر ہو، آپ نے اپنے نوکر کو بھیجا اور آپ کی حکمرانی ہے، آپ کا سکہ چل رہا ہے تو کیا مجال ہے کہ کوئی آپ کے نوکر کو روکے یا راستہ ہی میں اس کا کام تمام کر دے ،تو انہوں نے کہا یہ دین ابھی تازہ ہے، اسے ابھی دنیا میں آئے کتنے دن ہوئے ہیں اور اس کے نمائندے ڈوب جائیں؟ مگراتنی بات ضرور ہے کہ کہیں لشکر میں گناہ تو عام نہیں ہو گئے ہیں۔ لشکر میں گناہ کا رواج تو نہیں ہو گیا ہے؟ بس انہوں نے یہ کہا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے لشکر پر ایک نگاہ ڈالی، وہ نگاہ بھی کیا نگاہ تھی، اور وہ لشکر بھی کیا لشکر تھا کہ اس کی صورت سے معصومیت ٹپکتی تھی، اور وہ نگاہ بھی کیا نگاہ تھی جو ایک نظر میں سب کا جائزہ لے لے، آج جائزے کے لئے کیسے کیسے محکمے قائم ہیں پھر بھی اس کا پتہ نہیں چلتا ہے اور انہوں نے ایک مرتبہ دیکھا اور کہا بسم اللہ چلو بس سب نے دریا میں گھوڑے ڈال دیئے اور نہایت اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے، کسی صحابی کا ایک برتن گر گیا لوگوں نے انہیں طعنے دیئے کہ آپ کا برتن گر گیا؟ انہوں نے کہا جائے گا کہاں اس کی مجال کیا ہے، ایک لہر آئی اور برتن بہتا ہوا ان کے پاس آ گیا، انہوں نے اسے اٹھا لیا ان کے اطمینان کی اس وقت پر یہ حالت تھی لکھا ہے کہ کہ اس طرح باتیں کر رہے تھے كـانـهـم يـمـشـون فـى الـبـر ایسا پتہ چل رہا تھا جیسے خشکی پر چل رہے

ہوں، جب ایرانیوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا دیواں آمدند، دیواں آمدند یہ تو دیو آرہے ہیں دیو آرہے ہیں۔

دوسرا واقعہ حضرت عقبہ بن نافع کا ہے جب وہ قیروان گئے اور وہاں چھاؤنی ڈالنے کا ارادہ کیا کہ وہاں سے بیٹھ کر سارے شمالی و مغربی افریقہ کو فتح کریں اور جگہ ان کو پسند آئی تو لوگوں نے کہا یہ جگہ مناسب نہیں ہے، شیر چیتے، بھیڑیئے بہت ہیں جو بھی جانور رہے ہوں، شیر کا نام تو خاص طور پر لیا اور بھی جانور رہے ہوں گے، تو کہا آپ یہاں چھاؤنی نہ بنائیں آگے بنائیں۔ معقول بات تھی اور معمولی بات تھی، اللہ کی بڑی زمین پڑی ہوئی تھی لیکن صحابہ کرامؓ کا ذہن ہی اور تھا وہ حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتے تھے، حالات کو اپنے موافق بناتے تھے، انہوں نے کہا ہم تو جو اللہ کا پیغام لے کر آئے ہیں چلے جائیں اور یہ شیر اور چیتے رہیں؟ رہنا تو اسے چاہئے جس کی ضرورت ہو، اس لئے یہ تو الٹی بات ہوئی کہ ہم کہیں یہ جگہ مناسب نہیں ہے آگے چلو، اور شیر کون سا مفید کام کر رہے ہیں، یہ کون سا اللہ کا پیغام پہنچا رہے ہیں، یہ بھیڑیئے کون سے مفید ہیں اس لئے ہم نہیں جائیں گے، ان کو جانا چاہئے اور یہ کہہ کر انہوں نے ایک آدمی کو بلایا، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، افسانہ نہیں ہے اور عرب ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی طرح تاریخ میں افسانہ لکھنے کے بالکل عادی نہیں ہیں، تاریخ بالکل سچی لکھتے ہیں جبھی تو حدیث محفوظ رہی، تو انہوں نے ایک آدمی کو بلایا اور کہا دیکھو اعلان کر دو کہ شیرو! اور چیتو! اے بھیڑیو! اے تیندووو! ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں، ہم یہاں چھاؤنی بنانا چاہتے ہیں، ہم یہاں بیٹھ کر اللہ کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں، اور اللہ کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جن کو اپنی جان پیاری ہے فلاں وقت تک مہلت ہے چلا جائے اور اگر وہ رہے گا تو ان کی جان کی خیر نہیں، لوگوں نے کہا واللہ العظیم ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ چیتا بھاگا چلا جا رہا ہے، اور اس کی مادہ اپنے بچے کو گود میں لئے ہوئے ہے، بغل میں دبائے ہوئی ہے اور بھاگی چلی جا رہی

ہے تھوڑی دیر میں میدان صاف ہوگیا۔

یہ تھا ان کا طریقہ، انہوں نے ایک بار خدا کے حکم سے تغیر پیدا کیا اور اس کے بعد اس پر ثابت قدم رہے، ان کا طرز عمل یہ نہیں تھا کہ حالات کا تقاضہ یوں ہے تو یوں ہو جاؤ پھر تقاضا یوں ہو تو یوں ہو جاؤ، فلاں پارٹی جوائن کرلو، وہ دَل بدلی نہیں کرتے تھے اور دل بدلی بھی نہیں کرتے تھے، نہ وہ دِل بدلتے تھے اور نہ دَل بدلتے تھے، ایک دِل اور ایک دَل ، یہ صفات میں تغیر تھا۔

ہندوستان میں ہمیں کس طرح رہنا ہے

مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے، عزت کے ساتھ رہنا ہے، محبوبیت کے ساتھ رہنا ہے تو یہ لڑتے بھڑتے کب تک رہیں گے، یہ حالت جنگ کہاں تک قائم رہے گی کہاں تک یہ شکوے شکایت کہ ہمیں چھیڑتے ہیں، جیسے بعض بچے ہوتے ہیں، احساس کمتری کے مریض ہوتے ہیں، وہ چلاتے ہیں ہمیں چھیڑتے ہیں، دیکھئے ہمیں چھیڑتے ہیں، بعض کسی چیز سے چڑتے ہیں، یہ ایک نفسیاتی مرض ہے اس میں خبط سا ہو جاتا تھا کہ دیکھئے بچے چھیڑ رہے ہیں، کوئی کریلے سے چڑتا ہے اور کوئی جلیبی سے چڑتا ہے، کوئی کسی نام سے چڑتا ہے اور بچے اسے چھیڑتے ہیں، تو ہم کب تک ہندوستان میں نعرے لگاتے رہیں گے کہ بچے ہمیں پریشان کرتے ہیں، یہاں کی صورت یہ ہے کہ ایک تو اپنے اندر صفات میں تغیر پیدا کریں آپ اپنے اندر ایمان پیدا کریں، عمل صالح پیدا کریں، اخلاق حسنہ پیدا کریں جیسے ہمارے دوست ناصر العبودی نے بڑی اچھی بات کہی کہ اگر آپ کے اخلاق درست ہیں تو آپ کے معاملات درست ہیں تو لوگ آپ کو دیکھ کر کہیں گے کہ ان کا دین بھی اچھا ہے۔ اور انہوں نے یہ بات بھی خوب کہی تھی کہ اکثر لوگ سطحی نظر کے ہوتے ہیں، زیادہ گہرائی میں نہیں جاتے، وہ آپ کو دیکھتے ہیں، کتاب پڑھنے کی کس کو فرصت ہوتی ہے، یہاں جو لوگ مسلمان ہوئے وہ

مسلمانوں کو دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے خواجہ معین الدین چشتی کو دیکھا تھا، خواجہ معین الدین چشتی قطعاً مصنف نہ تھے، چشتی حضرات یہ کہتے ہیں کہ خواجہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا ہمارے بزرگوں نے کتاب نہیں لکھی نہ جس کتاب کی نسبت خواجہ معین الدین چشتی کی طرف ہے وہ صحیح، نہ جس کتاب کی نسبت خواجہ قطب الدین کعکیؒ کی طرف ہے وہ صحیح، نہ جس کتاب کی نسبت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی طرف ہے وہ صحیح، تو خواجہ نظام الدین اولیاء نے بھی کتاب نہیں لکھی، ان حضرات نے تصنیف وتالیف کے ذریعہ اور تقریر وخطابت کے ذریعہ دلوں کو نہیں جیتا، انہوں نے اپنے اخلاق سے جیتا ہے، قربانی سے ایثار سے، کسی سے جیتنے والے تھے جیت سکتے تھے لیکن ہار مان لی، دب گئے، غصہ پی گئے، گالی سن لی، کسی نے لوٹ لیا، چوری کی تو اس کو معاف کر دیا، غریب کو دیکھا اور رونے لگے، اس کو سینہ سے لگا لیا، دوسروں کو کھلا کر خود کھایا، یا بھوکے رہے، یہ اخلاق تھے جنہوں نے دلوں کو کھینچا ہے اور انہیں اخلاق نے، انہیں صفات نے انڈونیشیا میں بھی اپنا کام کیا ہے، سارا انڈونیشیا عرب تاجروں کے اخلاق دیکھ کر یا صوفیاء کرام کی روحانیت دیکھ کر مسلمان ہوا اور آج تک کوئی سراغ نہیں لگا سکا کہ انڈونیشیا میں یا چین میں کوئی اسلامی لشکر گیا ہو، اسلامی لشکر ان دور دراز مقامات تک گیا ہی نہیں اور آج دیکھ لیجئے ہندوستان میں جن مقامات پر سات سو برس تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی وہاں آج تک مسلمان اقلیت میں ہیں، یہ آپ کا یوپی کا صوبہ، مدھیہ پردیش کا صوبہ، بہار کا صوبہ اور راجپوتانہ بھی ان سب جگہوں میں اسلامی حکومت قائم رہی، خاص دلی میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے، لیکن مسلمان اکثریت میں کہاں ہیں؟ کشمیر میں ہیں جہاں ایک اللہ کا بندہ، امیر کبیر سید علی ہمدانی تشریف لائے اور سارا کشمیر ان کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا، اسی طرح بنگال سے خاص طور پر مشرقی بنگال سارا کا سارا صوفیائے کرام کے حساب میں جاتا ہے۔

تو اخلاق بدلنے کی ضرورت ہے یعنی یہ کہ آپ دعوت لے کر کھڑے ہوں اور اپنے درمیان بھی داعی بنیں، مسلمانوں کو آپ تبلیغ کریں تاکہ آپ کی بات کا مسلمانوں میں وزن ہو اور آپ مسلمانوں پر اثر انداز ہوسکیں اور مسلمانوں میں اصلاح کی رو چلے، تعلق باللہ کی رو چلے، ان کے اخلاق درست ہوں وہ نمونہ بنیں، تو پہلے تو مسلمانوں میں ضرورت ہے پھر مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ بجائے علمی انداز میں تبلیغ کرنے اور اس طرح دعوت دینے کے کہ آؤ مسلمان ہو جاؤ، اپنے اخلاق سے ان کے قلب میں، ان کے دل میں جگہ پیدا کرنی چاہئے اور ہمدردی کا جذبہ کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ ملک ڈوب نہ جائے۔

طفلانہ ذہنیت

اب مسلمانوں کی ذہنیت ایسی ہوگئی ہے کہ کوئی سیلاب بھی آجاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں چلو اچھا ہوا جتنی ہی پریشانی ہو ٹھیک ہے، کہیں آگ لگ جاتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اب ایسی ذہنیت پست ہوگئی کہ اگر کرکٹ میں، ہاکی میں ملک کی ٹیم ہار جائے تو خوش ہوتے ہیں اور کسی اسلامی ملک کی ٹیم جیت جائے تو خوش ہوتے ہیں، یہ بالکل طفلانہ ذہنیت ہے، اس سے کام نہیں چلے گا، سچی ہمدردی آپ کے اندر پیدا ہونی چاہئے کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی ہو، دیکھئے اگر آج ہمارے اسلاف کرام نے اس ملک کو نہ بنایا ہوتا، نہ سنوارا ہوتا تو آج ہم اس ملک کو دکھانے کے قابل نہ ہوتے اتنے آدمیوں کو ہم نے دکھایا آپ ہماری نمائش گاہ جائیے دار العلوم میں جہاں نمائش ہال ہے وہاں دیکھئے کہ اس ملک کو ہمارے بزرگوں نے کیا دیا ہے اور اس ملک کو کیسا مالا مال کر دیا، اگر ان کے اندر یہ جذبہ نہ ہوتا اور ہمیشہ ان کا ذہن مصائب سے خوش ہونے کا ہوتا، کہتے لعنت ہو اس سرزمین پر، ڈوب جائے یہ ملک، ہمارے ساتھ یہ ناانصافی ہوئی ہے، وہ ناانصافی ہوئی ہے، تو کچھ بھی نہ ہوتا، لیکن انہوں نے اس ملک کو اپنا

ملک سمجھا، اور اس ملک کی مخلوق کو اللہ کی مخلوق سمجھا **الخلق عیال الله**، مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اس کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کی، اللہ کا پیغام پہنچایا اس کو انسان بنانے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محبوب بن گئے، ہر دلعزیز بن گئے آنکھوں کا تارا بن گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنا محبوب بنائے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

دعوت کا کام ہی امت مسلمہ کی اصل قدر و قیمت ہے

۱۳ ۱ ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۳ جون ۱۹۹۵ء معہد الدعوة کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے درج ذیل فکر انگیز تقریر فرمائی جو مدارس عربیہ کے منتھی درجات کے طلبہ اور اساتذہ کرام کے لئے اپنے اندر بڑے رہنما اصول کی حامل ہے۔ افادہ عام کی غرض سے تقریر ہدیہ ناظرین ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعیٰ بدعوتھم الی یوم الدین۔

اما بعد اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

عزیز طلبہ! یہ بات معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اس سال خطبات، مطالعہ اور پڑھنے کے سلسلہ میں مشوروں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے ، یہ ایک بدیہی حقیقت اور ایک تاریخی واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تمام مساعی اور ان کی برکات۔ ان کے فیوض و اصلاحات اور ان کے ذریعہ سے عالم انسانیت کے اندر جو تعلق

مع اللہ اور تعلق باللہ پیدا ہوا اور عقائد کی تصحیح ہوئی اور اصلاح اخلاق کا رجحان پیدا ہوا، منکرات اور مظالم کے خلاف جو رجحان پیدا ہوا۔ ان کو ختم کرنے یا ان کو بے اثر بنانے کا اور پوری انسانیت کے رخ کو بدلنے کا، تمدن اور معاشرت کے رخ کو بدلنے کا کام شروع ہوا اور انجام کو پہنچا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ ان سب کی بنیاد دعوت تھی، نہ حکومت تھی نہ سیاست، نہ طاقت تھی نہ منفعت تھی، نہ مصلحت تھی، نہ ذاتی اثر و رسوخ تھا، خالص دعوت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں خاص طور سے اس حقیقت اور امتیاز کو نمایاں کیا ہے اور جس نبی کے بھی حالات پڑھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے کام کی بنیاد اور ابتداء اور انتہا بھی اسی دعوت پر ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام فرمایا اور انبیاء کرام نے خاص اس کی جدوجہد کی کہ ان کے تیار کیے ہوئے لوگ بھی اس ذمہ داری کو سنبھالیں اور اس کو اپنا فرض سمجھیں۔ اس لئے قرآن مجید میں امر کے صیغے کے ساتھ کہا گیا۔ ولتکن منکم امة..... الی آخرہ۔ تم میں ایک ایسی امت رہنی چاہئے جس کا کام ہی یدعون الی الخیر، (وہ خیر کی طرف بلاتے ہیں) پھر اس کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے بڑے مثالی، مستند اور مقبول داعیوں اور سب سے زیادہ کامیاب داعیوں کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام ہیں اگر آپ ان کو دیکھیں گے تو دعوت کی روح کیا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ دعوت ان کا مزاج تھا، ایک ہوتا ہے کام، ایک ہوتی ہے ضرورت کی تکمیل اور ایک ہوتا ہے وقت کا تقاضا، اور ایک ہوتا ہے مزاج، تو انبیاء کرام کا مزاج بلکہ ادیان کا مزاج دعوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو جزئیات بیان کی ہیں، انبیاء کے مکالے اور ان کی دعوت کے طریقے نقل کیئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اولا واصلاً وہ داعی تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں خاص امتیاز رکھنے والے دنیا میں قیامت تک ان سے نسبی واعتقادی، اور دعوتی انتساب رکھنے والے دنیا میں قیامت تک دعوت الی اللہ دعوت الی الآخرۃ، دعوت

الی الدین، دعوت الی الفضائل، دعوت الی الانسانیۃ! ان سب کے ذمہ دار وہ ہوں گے جو حقیقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیرو بنیں۔ اس لئے فرمایا **ملة ابیکم ابراهیم هو سماکم المسلمین.**

مہر لگادی کہ مسلمان جو آخری امت ہیں اور جن کے متعلق کہا گیا ہے **کنتم خیر امة**، خیر امت کے اصل مورث اعلیٰ اور اس کے بانی اور مربی، سرپرست حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، قرآن مجید میں جہاں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ آیا ہے اس میں صاف داعیانہ روح جھلکتی رہے اور ان کو سب سے زیادہ داعی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور کسی داعی کو جو سب سے بڑا خطرہ پیش آسکتا ہے اور بڑی سے بڑی قربانی اس کو دینی پڑتی ہے اس کا نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے تذکرہ میں دو عظیم الشان قربانیاں بیان کی گئی ہیں آپ نے جب عقیدہ توحید کا اعلان کیا اور بادشاہ وقت کی پرستش سے انکار کیا تو آگ جلائی گئی اور کہا گیا کہ اس کو اس آگ میں ڈال دو۔

دیگر انبیاء کرام کے تذکروں میں ایسی کھلی آزمائش کے واقعات تاریخ میں نظر نہیں آتے پھر دوسری آزمائش جس وقت انہوں نے کہا:

یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ما ذاتری؟

(سورۃ الصافات پ ۲۳)

''ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامر الہی) ذبح کرتا ہوں سو تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟

یہ دونوں قربانیاں ایسی ہیں جن کی داعیوں کی زندگی اور تاریخ میں کیا؟ انبیاء کرام کی

تاریخوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور ان دونوں کا تذکرہ کر کے گویا اللہ تعالیٰ نے اشارہ کر دیا ہے کہ داعی کو یہ مرحلے پیش آسکتے ہیں تو اسلام کی تاریخ کا، اسلام کی کامیابیوں کا، اور جو انقلاب اسلام لایا ہے اور جو کردار اس کے سپرد کیا گیا ہے اور جو خلاء امت مسلمہ پر کرتی ہے ان سب کا انحصار دعوت پر ہے امت جب تک دعوت سے منسلک رہے گی دنیا میں خیر کی امید ہے اور دنیا میں خیر پھیلے گی، اور خدانخواستہ یہ امت اگر دعوت سے مستغنی اور کنارہ کش اور بےتعلق ہوگئی تو دنیا خطرہ میں پڑ جائے گی اس لئے ضرورت ہے کہ دعوت کے پیغام کو زندہ کیا جائے اور جیسا کہ ربیع بن عامرؓ نے رستم سے کہا تھا جب رستم نے پوچھا تھا ماالذی جاء بکم (تم کس غرض سے آئے ہو) رستم کے اس سوال کے دس جواب ہو سکتے تھے، اور رستم توقع کرتا تھا کہ اس کو یہ جواب دیا جائے کہ آپ لوگ سینکڑوں برس سے عیش کر رہے تھے اور ہم وہاں فاقے کر رہے تھے اور خیموں میں رہتے تھے اونٹ کا گوشت کھاتے تھے اور اس کا دودھ پیتے تھے اور کھجوروں پر ہماری گذر اوقات تھی ہم اپنا حق لینے کے لئے آئے ہیں کیا یہ سب آپ ہی کے لئے ہے؟ ہمیں بھی حصہ رسدی ملنا چاہئے بالکل رستم اس کے لئے تیار تھا کہ اگر وہ کہیں تو ان کا جو پیدائشی اور فطری حصہ اور حق ہے ان کو دے دیا جائے اور ان سے چھٹی ملے، جہاد کا بھی خطرہ نہیں رہے گا، سب لوگ واپس چلے جائیں گے، اچھا ہم تمہارا وظیفہ مقرر کرتے ہیں، ہر عرب کو اتنا ملے گا، اور تمہارے تمدن کو بھی داخل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ رستم نے سوال اسی بنا پر کیا تھا اور ہم سمجھتے ہیں وہ ۹۰/۹۵ فیصد اسی امید میں رہا ہوگا کہ جواب میں اس سے کہا جائے گا کہ ہم کو فقر وفاقے نے یہاں پہنچایا ہے۔ کیا ظلم ہے کہ آپ لوگ ایک ایک لاکھ کی ٹوپی پہنیں اور ہم بھوکے رہیں یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب رستم شکست کھا کر بھاگا ہے تو اپنے ساتھ ایک ہزار باورچی ایک ہزار گویئے، ایک ہزار باز کے پالنے والے لے کر بھاگا تھا اور اس پر کہا تھا کہ کیسے چلے گا؟ ساسانی حکومت پر بہت مستند اور پراز

معلومات کتاب جس کا پروفیسر اقبال نے ترجمہ کیا ہے اس کا میں نے اپنی کتاب میں حوالہ بھی دیا ہے، ہم تاریخی چیز سرسری طور پر پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ غور نہیں کرتے۔ ربعیؓ بن عامرؓ کا جواب بہترین نمائندگی کرتا ہے، ایک داعی کے جواب کی، اور وہ امت مسلمہ کو بھی اس کا مقام بتلاتا ہے، انہوں نے کہا!

ماالذی جاء بکم قالوا ما جاء بنا شیء اللہ بعثنا۔

(ہم کسی لالچ میں نہیں آئے ہیں ہم کو تو اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے اٹھایا ہے)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے سوچ کر آئے تھے۔ "اللہ بعثنا" نہیں کہا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عسکری تھے، سعد بن ابی وقاصؓ نے اس کے لئے ووٹ نہیں لیا تھا اور نہ ہی کسی سے پوچھا تھا۔

اللہ بعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ وحدہ،

"ہم کو اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے اور اٹھایا ہے کہ جسے اسے منظور ہو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا تعالیٰ کی عبادت میں داخل کریں۔"

فوراً ان کی تربیت سامنے آئی ہم کیا نکال سکتے، ہم کب اپنے ارادہ سے نکلتے تھے فرمایا من شاء جس کو اللہ تعالیٰ چاہے **من عبادۃ العباد** یہاں عبادت اصنام (بت) ہو رہی تھی، عبادت مال و مادیت، اور جنسی تقاضوں کی ہو رہی تھی، ہر بادشاہ معبود بنا بیٹھا تھا جب وہ رستم کے دربار میں گئے ہیں تو ان کو روکا گیا کہ تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ گھوڑا یہاں چھوڑو۔ اور ادب کے ساتھ چلو، انہوں نے کہا نہیں، میں بلایا گیا ہوں خود نہیں آیا ہوں، اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو میں واپس جاتا ہوں۔ رستم نے کہا کہ آنے دو۔ اللہ

ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة الله وحده، ومن ضيق الدنيا الی سعتها . (ترجمہ) ہم کو اللہ تعالیٰ نے نکالا اور اٹھایا ہے کہ جسے اسے منظور ہو کہ بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا تعالیٰ کی عبادت میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف نکالیں۔

یہ جملہ تو چونکا دینے والا ہے کہ آپ ضیق دنیا میں ہیں ہم پر رحم کھا کر آئے ہیں، یہ تو ایسا مکالمہ ہے کہ اس کو دنیا کی مختلف زبانوں میں تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہئے۔ ایک ایک لفظ ایسا ہے جس کو کلام نبوت اور الہام خداوندی کہنا چاہئے۔

وہ اگر کہتے کہ ''من ضيق الدنيا الی سعة الاخرة'' تو ذرا بھی تعجب نہ ہوتا۔ ہر مسلمان کا ایمان اس پر ہے کہ آخرت زیادہ وسیع ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم تم پر رحم کھا کر آئے ہیں کہ تم دنیا کے ایک پنجرے میں گرفتار ہو، تم ایک بلبل کی طرح ہو کہ جس کو پانی اور دانہ ڈال دیا جاتا ہے اور اس کو وہ کھا لیتا ہے، اس کے آگے وہ کچھ نہیں کر سکتا، ایسا ہی آپ کا حال ہے کہ اگر غلام آپ کے سامنے نہ ہو تو آپ بھوکے رہ جائیں، وہی پکاتے ہیں، وہی کھلاتے ہیں، وہی آپ کو پانی پلاتے ہیں۔ اور آپ جنبش نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کو اس تنگنائے اور اس پنجرے سے نکال کر دنیا کی ہوا کھلانا چاہتے ہیں اور آزاد بنانا چاہتے ہیں۔ جو مل گیا کھا لیا، جیسے مل گیا کھا لیا، لیکن آپ اپنے غلاموں کے غلام ہیں۔ اپنے باورچیوں کے غلام ہیں، اپنے محافظوں اور دستے کے غلام ہیں اور ان برتنوں اور ظروف کے غلام ہیں۔ تاریخ کا یہ واقعہ ہے کہ جب کسریٰ نکلا، راستے میں اس کو پیاس لگی، کسی نے بتایا کہ یہاں پانی مل جائے گا، جب وہ وہاں گیا تو جس برتن میں پانی لایا گیا اس کو دیکھ کر اس نے کہا کہ میں مر جاؤں گا تب بھی اس برتن میں پانی نہیں پی سکتا۔

''من عبادة العباد الی عبادة الله وحده ، ومن ضيق الدنيا الی سعتها، ومن جور الاديان الی عدل الاسلام.''

ہم مذہب کے ظلم و جور سے آپ کو نکال کر اسلام کے عدل کے

سائے میں لانا چاہتے ہیں۔''

بہر حال یہ دعوت ہی اس امت کی قدر و قیمت ہے اس کے وجود کی اصل علت ہے۔ اللہ پاک نے اس کو باقی رکھا ہے اور اس کے سرچشمے قرآن کو بھی باقی رکھا ہے۔ سیرت نبوی اور داعی، عربوں اور داعیان اولین کی تاریخ، بلکہ پوری تاریخ داعیوں سے بھری ہوئی ہے، تاریخ دعوت وعزیمت میں کہا گیا ہے کہ کوئی دور خالی نہیں رہا کہ وقت اور تقاضے کے مطابق داعی نہ پیدا ہوا ہو، اس کی مثال کسی غیر مذہب میں نہیں ملتی ہے۔ ہم نے دعوت وعزیمت میں غیروں کے بعض اعتراضات کو نقل کیا ہے۔ شنکر آچاریہ سے پہلے صدیاں گذر گئیں۔ شنکر آچاریہ نے کیا اصلاح کا کام کیا۔ انہوں نے تو بت پرستی کی حمایت کی، اور عیسائیت کا حال تو یہ ہے کہ سینٹ پال جو ستر برس کے بعد پیدا ہوا۔ اس نے تو عیسائیت کو دوسری پٹری پر ڈال دیا۔ بالکل ضلال پر، جس کے معنی ہم اردو میں سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ گمراہی یہ ہے کہ مثلاً مشرق کی طرف جاتا ہو اور مغرب کی طرف پلٹ جائے۔ یہ معنی ولا الضآلین میں بھی سمجھنا چاہئے۔ اصل ضلال یہ ہے کہ راستہ اور رخ بدل جائے۔ مشرق کے بجائے مغرب کی طرف چلے۔ اس کے لئے اس سنت کو باقی رکھا گیا ہے، اور قرآن مجید اس کے ہاتھ میں دیا گیا ہے سیرت نبوی موجود ہے داعیوں کے واقعات و حالات موجود ہیں کوئی بھی دور وقت کے مخلص داعی سے خالی نہیں رہا۔ اگر کوئی دعوی کے ساتھ کہے کہ اس امت میں دس سال تک کوئی داعی نہیں پیدا ہوا تو سراسر غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر زمانہ اور ہر دور میں داعی پیدا کرتا رہا ہے ہم بہت خوش ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور درحقیقت ندوۃ العلماء کی بنیاد دعوت ہی پر پڑی ہے۔ مدارس بہت تھے، لیکن اس عہد کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس دین کی اہمیت اور ضرورت سمجھانے اور وقت

کے فتنوں کے مقابلہ کی صلاحیت پیدا کرنے والی چیز تقریباً مفقود اور ثانوی درجہ میں تھی، ندوۃ العلماء کی تحریک کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ عہد کے مطابق اور چیلنجوں کے مطابق لوگ تیار کئے جائیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور یہاں ایسے داعی پیدا ہوں، ہم علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبی ﷺ کو اور سید صاحب کے ''خطبات مدراس'' کو ،مولانا شبلی کی کتاب ''الفاروق'' کو اور دارالمصنفین کے کام کو یہاں تک کہ ندوۃ العلماء کے نصاب کو بھی دعوت کا جزو سمجھتے ہیں جب ان کتابوں کا ذکر آ گیا تو ہم عرض کرتے ہیں کہ جب ہم نے یہ سوال اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے پاس بھیجا کہ آپ کی محسن کتابیں کیا ہیں؟ ان کو لکھیئے تو میاں بشیر احمد نے لکھا کہ جب میں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا تو کئی بار مجھ پر الحاد کے حملے ہوئے۔ جب کبھی حملہ ہوتا تو ''الفاروق'' میرے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی تھی کہ جس کی یہ سیرت ہے وہ گمراہی پر نہیں ہو سکتا یہ سارا علمی کام جو کچھ ہوا ہے دار المصنفین ،ندوۃ العلماء یا اس سے استفادہ کرنے والوں کے ذریعہ یا شعبہ کے ذریعہ ہوا، اور ان سب کی قدر مشترک دعوت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

مدارس و مکاتب سائنس کا علم رکھتے ہیں!

یہ فکر انگیز تقریر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ فیض الاسلام پھلت ضلع ''مظفر نگر'' کے ایک افتتاحی جلسہ کے موقع پر فرمائی تھی۔

پھلت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جائے پیدائش ہے، اس علاقہ کی ایک بڑی تعداد حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے جہاد میں شریک رہی اور شاید یہیں کے لوگوں نے سب سے زیادہ جام شہادت نوش فرمایا۔

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين، وعلى آله واصحابه اجمعين، ومن تبعهم باحسان ودعى بدعوتهم الى يوم الدين اما بعد!

حضرات علماء کرام، برادران عزیز!

''پھلت'' کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہر صاحب علم کو خاص طور پر جو تاریخ کا طالب علم رہا ہو خصوصاً ہندوستان کی تاریخ کا طالبعلم ہو اس کے لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ اسے پھلت کے وہ نامور (افراد) یاد آجائیں جو صرف پھلت ہی کے لئے باعث فخر نہیں، بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے باعث فخر اور سرمایہ افتخار ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا مسلک و مزاج

بارہویں صدی ہجری جس میں اس عہد کا سب سے بڑا عالم [illegible]
بصیرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اسرار شریعت کا سب سے بڑا شارح مسلمانوں [illegible]

کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کا قائد یعنی حضرت شاہ ولی اللہؒ، مجھے تاریخ لکھنے کے سلسلے میں، خصوصاً شاہ ولی اللہؒ کے عہد کی شخصیتوں، تحریکوں پر قلم اٹھانے کے سلسلہ میں اس عہد کا مطالعہ کرنا پڑا۔ علامہ اقبالؒ نے مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں کہا تھا ؂

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

میں اسی مطالعہ اور فکر کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے برصغیر میں اب تک حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شروع کیا ہوا دور چل رہا ہے، عربی مدارس، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنو اور جتنے بھی مدارس اسلامیہ ہیں، یہ سب امتداد اور تسلسل ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے مسلک ومزاج کا۔ ان کا مزاج ولی اللہی ہے اور اس وقت تک ہی ان میں خیر وبرکت اور افادیت ہے جب تک ان میں ولی اللہی مزاج قائم ہے، اس لحاظ سے ہمارے لئے ''پھلت'' سیر گاہ نہیں، بلکہ زیارت گاہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اخلاف اور خلفاء دونوں عطا کئے ہیں۔ اخلاف میں امام الہند شاہ عبدالعزیز، علوم عقلیہ کے امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور شاہ عبدالقادرؒ جن کا ترجمہ قرآن پاک مشہور ہے۔ غیر عربی میں اب تک کسی بھی زبان میں ان سے بہتر کسی نے نہیں کیا۔ پھر ان کے چوتھے صاحبزادے شاہ عبد الغنیؒ جن کو موقع نہیں ملا، اللہ نے ان کو نعم البدل عطا فرمایا کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسا من اذکیاء العالم فرزند ملا۔ یہ تو ان کے اخلاف تھے اور خلفاء میں آپ دیکھیں سید احمد شہیدؒ، خلیفہ شاہ عبدالعزیز، مولانا عبدالحیؒ، شاہ محمد اسحاق جو درس وتدریس کے بھی امام ہیں اور سلسلۂ تصوف شریعت کے بھی ہیں۔ دہلی کو یہ خانوادہ پھلت کا عطیہ ہے۔ پھلت میں داخل ہوتے ہی یہ تمام تاریخ سامنے آجاتی ہے اور یہ تاریخ ہی ہے عالم اسلام کی کہ جب دارالحکومت میں عہدوں کو حاصل کرنے کی وجہ سے مصنوعی زندگی کی وجہ سے رقی کی سست

ہونے لگے، رگوں میں خون منجمد ہونے لگا، تو قصبات نے نیا خون عطا کیا۔ آپ نے نہ صرف سلطنت مغلیہ کے دارالخلافہ بلکہ مرکزِ علم وسلوک و جذبۂ جہاد دہلی کو پھلت نے اتنا بڑا تحفہ عطا کیا، خانوادۂ ولی اللٰہی، اس سے بڑھ کر تحفہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ جس طرح لکھنؤ کو سہالی کے ایک قصبہ نے خانوادۂ علماء فرنگی محل عطا کیا ایسے ہی جب بغداد میں اضمحلال پیدا ہوا، حکومت کے شر نے قویٰ کو مضمحل کر دیا، اور سوائے حصولِ منصب کے کوئی مقصد لوگوں کے سامنے نہیں رہا، تو ایران کے ایک قصبہ جیلان نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا تحفہ دیا جس نے پورے عالمِ اسلام کو عشق الٰہی کے سوز سے بھر دیا، جس کی لہریں افریقہ تک پہنچیں، ایسے ہی ایران کے ایک معمولی قصبہ نے امام غزالیؒ جیسا مفکر عطا کیا، الغرض قصبات نے ہر دور میں دارالحکومت کو ایسا چمکتا ہوا دھکتا ہوا، نیا خون عطا کیا جس نے پورے پورے ملکوں کو گرما دیا، بہت سے لوگ اس کو بھول جاتے ہیں کہ یہ نیا خون کس نے عطا کیا، بڑے بڑے شہروں کی تاریخ سامنے آجاتی ہے اور وہ آڑ بن جاتی ہے، جہاں ایسے مردم خیز قصبوں میں جا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں کیسے کیسے باکمال پیدا ہوئے، خدا کی دین (عطاء) کی بھی کوئی حد نہیں اس کی قدرت کی وسعت معلوم ہوتی ہے وہاں یہ ذہن بھی جاتا ہے جو نفسیاتی ردِ عمل بھی ہے کہ اب ایسے لوگ پیدا نہیں ہوسکتے اور خدا مردے سے زندہ کو پیدا کرنے کی جو خدا کی قوت ہے (**یخرج الحی من المیت**) اس کو بھول کر ذہن کے کسی گوشہ میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اب تو بس تاریخ اور ان کے کارناموں کو پڑھنا چاہئے، اور اپنے معاش میں لگنا چاہئے تو آپ کے سامنے **پھلت** کا جو تاریخی تعارف کرایا گیا ہے اس نے مجھے آمادہ کیا کہ میں یہ آیت پڑھ کر سناؤں۔ **كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا**۔ ہم ان کو بھی بھر بھر کر دیتے ہیں، اور ان کو بھی **ھولاء وھولاء** اور دیتے رہیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ مضارع کا صیغہ حال اور مستقبل دونوں کے معنی دیتا ہے یعنی یوں کہنا کہ ''ہم

دیتے ہیں"، صحیح نہیں۔ اور "دیں گے" یہ بھی صحیح نہیں، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "دیتے رہیں گے" تمہارے رب کی دین میں کوئی راشنگ ہی نہیں ہے کہ اب اگر دے دیا تو انتظار کروائے گا برس کا ہمارے رب کی عطاء میں کوئی راشن نہیں ہے، کیونکہ اس کی بخشش لامحدود ہے وما کان عطاء ربک محظورا۔

اکبرالہ آبادی مرحوم نے کہا تھا

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی، آثار و نشان بھی قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پر چلنا چھوڑ دیا

لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں، ہمت بلند ہو، اخلاص و سعی ہو، اللہ تعالیٰ نے کوشش کی بھی جا بجا تاکید کی ہے، اللہ تعالیٰ کسی کوشش کرنے والے کی کوشش کو بھی ضائع نہیں کرتا، تو یہ ملت تو محبوب ہے،

رحمت للعالمین ﷺ کی ملت ہے، کیونکہ یہ تو اشرف الامم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو انسانیت بھی عزیز ہے۔ اپنی پیدا کی ہوئی دنیا بھی عزیز ہے، جس ماحول کا ہمارے لئے انتخاب کیا گیا ہے یا ہمارا جس ماحول کے لئے انتخاب کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہمارا جوڑ ہو، اور ہم اس فضا میں اپنی افادیت ثابت کریں۔ ہمارے اکابر مجدد الف ثانیؒ ہوں یا شاہ ولی اللہ ہوں، یا شاہ عبدالقادر ہوں، انہوں نے زمانے کی نبض پہچانی، انہوں نے دیکھا کہ زمانے کو روحانیت کی ضرورت ہے۔ علمِ صحیح کی ضرورت ہے، توحید خالص کی، عہدوں اور انانیت سے بلند ہو کر اعمال میں روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے طلبِ رضاء الٰہی کی ضرورت ہے ایسے ہی انہوں نے دیکھا کہ اس وقت انسانیت کس چیز کی پیاسی ہے؟ وہ زندہ رہنے کا استحقاق کھوئی چلی جا رہی ہے۔ اس سے جو مظالم سرزد ہو رہے ہیں، اس سے جو حق تلفیاں ہو رہی ہیں، اس سے جو خونِ انساں ارزاں سستا اور ضائع ہو رہا ہے اور پانی کی طرح بہہ رہا ہے، کہیں اللہ تعالیٰ نسلِ انسانی

کے خاتمہ کا فیصلہ نہ کرلے کیونکہ وَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ.

جو جھاگ ہے وہ چلا جاتا ہے، اور جو چیز نافع ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے، معلوم ہوا کہ بقا مربوط ہے نافعیت کے ساتھ جو چیز اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے جو گروہ، کوئی مرکز، دعوت ،یا تحریک اپنی نافعیت کھو بیٹھتی ہے وہ اس کی مستحق نہیں رہتی کہ قائم رہے، یہی سنت اللہ ہے۔

ان بزرگان دین نے ملت کو کیا دیا

ان بزرگانِ دین نے دونوں کام کیے ہماری نظر اس پر تو جاتی ہے کہ انہوں نے ملت کو کیا دیا۔ حدیث وتفسیر میں کیا نئی راہیں نکالیں علوم اسلامیہ میں کتنا عمق پیدا کیا ماحول میں کیا روحانیت پیدا کی لیکن ہماری نظر اس پر نہیں جاتی کہ انہوں نے غیر مسلموں کی نظر میں اسلام کا کس درجہ احترام پیدا کیا، سیرت نبوی ﷺ کو غور سے دیکھنے، پڑھنے، مطالعہ کرنے پر کس طرح آمادہ کیا؟ مؤرخین نے بھی اس پر پردہ ڈالا جہاں انہوں نے علم کے دریا بہائے، سندِ درس بچھائی، وہیں اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا، اسلام کے حقانی ومطابقِ عقل ہونے کا اور اسلام کے اس دنیا کی پیاس بجھانے کا ثبوت دیا، یقین دلایا، ہمارے سوانحی لٹریچر میں یہ پہلو بہت مغلوب رہ گیا ہے، آج میں کہتا ہوں کہ ملتِ اسلامیہ کو یہ دونوں کام کرنے ہیں، عقائدِ صحیحہ، عباداتِ مقبولہ، طلب خداوندی کے ذریعے ملت کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے صحیح بھی ہو، قوی بھی ہو، دونوں چیزیں ضروری ہیں، صرف صحیح ہونا کافی نہیں، قوی بھی ہو اور صرف قوی ہونا کافی نہیں، صحیح بھی ہو، عبادت تو مشرکین بھی کرتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّ تَصْدِيَةً لیکن اس کے ساتھ ساتھ خصوصاً اس زمانے میں ملت کا یہ فریضہ بھی ہو گیا ہے کہ اپنی نافعیت ثابت کرے، ہماری وجہ سے کتنی بلائیں ہیں جو ٹل رہی ہیں، ہم اس ملک کے لئے باعثِ رحمت و برکت ہیں، یہ جب ہی

ہوگا، جب آپ صحیح انسان بن کر بازاروں اور دفتروں میں جائیں، جو انہیں سوچنے پر مجبور کرے کہ وہ کون سا مذہب ہے جس نے ہمیں ایسا انسان بنا دیا، ہم بتائیں کہ اس ملک کے لئے پہاڑ، دریا، سمندر اتنے ضروری نہیں جتنے کہ ہم، ہمارا پیام انسانیت، ہماری خدا ترسی ضروری ہے، ہم ایسے دوراہے پہ آ گئے ہیں کہ ایک راستہ ارتداد کی طرف جا رہا ہے، میں اس سے کم درجہ کا لفظ استعمال کرنے پر تیار نہیں اگر کوئی آسمان سے ویسا اشارہ نہ ہوا، قدرتِ خداوندی کی کوئی مداخلت نہ ہوئی تو اس کے صاف آثار ہیں، آثار ہی نہیں بلکہ آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے تصور کی آنکھ سے جس میں صرف تصور نہیں، بلکہ تصویر بھی شامل ہے کہ آئندہ نسل شاید اسلام کے بنیادی عقائد سے بالکل نا آشنا ہو صرف آشنا منفی طور پر ہی نہیں بلکہ اس کے بالمقابل اسلام کے برخلاف عقائد و تصورات کی حامل ہو، مشرکانہ عقائد کی قائل ہو، ایسے خطرناک دوراہے پر آ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ اس کے لئے اپنی ساری توانائی صرف کر ڈالیں تو شاید آنے والی نسل ۲۵ برس بعد یہ تو زیادہ کہہ دیا بلکہ ۱۵ برس کے بعد خطرہ ہے کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے نام سے بالکل نا آشنا ہو، اس کی مثالیں سامنے آنے لگی ہیں کہ اسکولوں کے بچے بہت سے اللہ کا لفظ صحیح نہیں لکھ سکتے پوچھتے ہیں کہ ہم ''اللہ'' کس طرح لکھیں اور آج نوجوانوں کی ایک تعداد یہ سمجھتی ہے کہ اس دھرتی کو کرشن یا رام چلاتے ہیں۔ ہندو علم الاصنام، ہندو دیو مالا، بچوں کے ذہنوں پر اثر کر رہی ہے، ابھی ٹی وی پر ''رامائن'' جو سیریل چل رہی ہے۔ کالج کی جو کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں اس سے جوانوں کے ذہن و دماغ متاثر ہو رہے ہیں۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا.

معاملہ جہنم سے بچانے کا ہے

معاملہ عالم و فاضل، یا مفسر و محدث بنانے کا نہیں، بلکہ معاملہ ہے جہنم سے بچانے کا، دوزخ کی آگ سے بچانے کا، ایک جلسہ میں ایک بہن ایسی تھیں کہ جن کے چہرے پر

ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ عورتوں نے پوچھا کہ بہن! سر میں درد ہے؟ کچھ پیٹ میں تکلیف ہے؟ بولیں کہ کچھ نہیں پھر مزید اصرار پر بتایا کہ میں بچہ سوتا ہوا چھوڑ آئی تھی اس سے کچھ فاصلہ پر دیا سلائی رکھی ہوئی ہے، اگر وہ بچہ جاگ گیا اور چل کر وہاں تک گیا اور دیا سلائی سے تیل نکال لی، پھر اپنے کپڑوں میں آگ لگالی تو کیا ہوگا؟ عورتوں نے پوچھا کہ بچے کی عمر کیا ہے؟ بولی ''ڈھائی سال کا ہے'' سب نے کہا کہ ہوش کی باتیں کرو، وہ اتنا چھوٹا بچہ چار پائی سے کیسے اترے گا؟ اور پھر چل کر وہاں تک جائے گا؟ اور جا کر وہ یہی ایک کام کرے گا؟ جواب دیا کہ تمہارا بچہ ہوتا تو جانتیں؟ میرا بچہ ہے اس لئے مجھے ڈر ہے۔

حضرات میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آج ہمارے ماں باپ کے دل میں یہ خیال پیدا کیوں نہیں ہوتا کہ اگر ہم نے بچہ کو کلمہ، نماز نہ سکھائی، توحید کا سبق یاد نہ کرایا، ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی نہ سمجھائی تو کل وہ مشرک اٹھے گا یہاں تو بالکل خطرات نہیں، بلکہ مشاہدات ہیں وہاں تو ایسا دور دراز کا اندیشہ تھا، میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک لڑکا ڈھال کی سڑک پر سائیکل پر جارہا ہے اور آگے گہری کھائی ہے۔ وہ کھائی ہندو دیومالا کی ہے، بت پرستی ہے، مسلمانوں کے دلوں سے شرک و بت پرستی کی طرف سے ایسے گھن آنا ضروری ہے جیسے پاخانہ پیشاب سے بلکہ اس سے زیادہ گھن آنا ضروری ہے۔ یہ تکدر، یہ تنفر، یہ وحشت دور ہوتی جارہی ہے، حالانکہ ایک مسلمان کو سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا ہونا تھا کہ کل وہ مشرکانہ عقائد لے کر نہ اٹھے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا ایک بچہ کو قتل کر دینے کا واقعہ تشریعی نہیں ہے اس پر عمل آج نہیں ہوسکتا، مگر یہ قصہ قرآن میں قیامت تک پڑھا جائے گا۔ اس کا مقصد وافادیت یہ ہے کہ مسلمان سمجھے کہ خاندان کے لئے فتنہ بننے والا بچہ کتنا منحوس ہوتا ہے، اس قصہ کو قرآن نے جگہ دی تا کہ معلوم ہو کہ یہ خطرہ کتنا بڑا تھا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کو کھلی ہوئی بت پرستی سے، مشرکانہ عقائد سے بچانے کے لئے اپنے گھٹنے ٹیک دیجئے، ہر ممکن کوشش کر ڈالیے، اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے خالی وقتوں میں پرائیوٹ کلاسز کا انتظام کرائیے، یا ان کو

مدارس و مکاتب میں داخل کرائیے، یہ مدارس و مکاتب آج ہماری ریڑھ کی ہڈی ہیں، سانس کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر سانس چل رہی ہے تو ہم زندہ ہیں ورنہ ختم اور اپنے ماحول کو مانوس کریں فضا اگر یونہی اشتعال انگیز رہی تو کسی وقت چنگاری سے آگ لگ سکتی ہے۔ اگر ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر ناگواری کے آثار نمودار ہوتے رہے، وہ دیکھتے رہے کہ نہ ہم میں اخلاقی کردار، نہ افادیت ہم بھی وعدہ خلاف اسی طرح یہ بھی جس طرح ہم جھوٹ بولتے ہیں اسی طرح یہ بھی، تو ہم صرف اپنے لئے ہی نہیں، بلکہ اسلام کے باقی رکھنے کے لئے بھی اس ملک میں خطرہ پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارے اکابر جو افریقہ، مراکش، اسپین تک اسلام کو پھیلاتے چلے گئے، یہ صرف زبانی کام نہیں، بلکہ اس میں کردار بھی شامل تھا، جنہیں دیکھ کر خود بخود غیر مسلموں میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اسلام کو قبول کریں، مسلم پرسنل لاء کی لڑائی اسی لئے لڑی گئی تھی کہ عائلی تعلقات میراث، طلاق، نکاح، سب اسلامی طریقہ پر ہوں جس کے لئے سب مطالعہ کرنے والے علماء اپنے کمروں سے نکل کر میدان میں آئیں اپنے عائلی قانون کی بھی حفاظت کرنی ہے، اپنے ملی تشخص کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ اس کا قریب ترین ذریعہ یہ دینی مدارس و مکاتب ہیں، دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ یہ تلخی جو پانی، ہوا، سانسوں اور ماحول اور فضا میں آگئی ہے اسے دور کریں، اسلام کا تعارف کرائیں، ورنہ کسی چیز کا موقع باقی نہ رہے گا۔

حضرات ''پیامِ انسانیت کی تحریک'' یہ ایک چہار دیواری ہے، یہ ایک حصار ہے اس میں بیٹھ کر آپ قرآن شریف پڑھیئے، مسجد بنائیے، نماز پڑھیئے۔ خدانخواستہ یہ ٹوٹ گئی تو؟

خدا ہمیں اس دن کے لئے زندہ نہ رکھے۔ جب یہ مسئلہ چہار دیواری کے اندر آجائے اور مدارس و مساجد سب خطرے میں پڑجائیں۔

میں جسمانی طور سے اس حالت میں نہیں تھا کہ اتنا بھی کہہ سکوں آپ حضرات کے خلوص اور تعاون اور سکون نے اتنا کہلوادیا۔ اللہ عمل کی توفیق بخشے!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

مدارس دینیہ کی ضرورت اور علومِ دینیہ میں اخلاص واختصاص کی اہمیت!

۳ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ بمطابق ۵ مئی ۱۹۹۲ء کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے ملک نیپال (جو دنیا کا واحد ہندو اسٹیٹ ہے) کا پہلا اور آخری دورہ کیا اس موقع پر مولانا موصوف دارالعلوم نورالاسلام جلپا پور سنسری کے ناظم حضرت مولانا محمد ایوب ندوی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی دعوت پر دارالعلوم تشریف لائے اور دارالعلوم کے پروگرام ہال میں طلبۂ دارالعلوم نورالاسلام میں اخلاص وعلمی اختصاص پیدا کرنے والا بصیرت افروز بیان فرمایا، اس جلسہ میں چونکہ عوام الناس کی کثیر تعداد بھی موجود تھی ان کو اور خصوصاً مسلمانانِ نیپال کو باوجود غیر مسلم ملک میں رہنے کے اسلامی زندگی کا صحیح نمونہ پیش کرنے، اسلامی طرز اختیار کرنے اور نئی نسل کی دینی تعلیم کا انتظام واہتمام کرنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر دارالعلوم کے اساتذہ کے علاوہ ملک بھر کے اکثر علماء کرام کی بڑی تعداد جلسہ گاہ میں موجود تھی۔ اسی موقع پر جامع اکاظم (دارالعلوم کی جامع مسجد) **کا** سنگ بنیاد بھی حضرت مولانا قدس سرہ کے بدست مبارک **رکھا گیا** جامع اکاظم کا شمار نیپال کی بڑی مساجد میں ہوتا ہے۔ اس بابرکت جلسہ میں پاکستان سے گئے ہوئے جامع مسجد علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے امام وخطیب حضرت مولانا قاری رشید الحسن ندویؒ مہمان خصوصی تھے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسانٍ ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین ، اما بعد!

میرے عزیزو! ایک ہی علمی ودینی وفکری خاندان کے فرزندو اور ذمہ دارو......! اس

موقع پر مجھے بے اختیار عربی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جو حسب حال ہے، شاعر کہتا ہے......

قالوا خراسان اقصیٰ ما یراد بنا

ثم القفول فقد جئنا خراسانا

شاعر کہتا ہے کہ ہمیں جن سے تعلق تھا انھوں نے کہا تم ہمارے یہاں کہاں اور کب آ سکو گے؟ ہم خراسان میں رہتے ہیں تم کہاں رہتے ہو...... خراسان بہت دور ہے، دنیا کے آخری سرے پر واقع ہے، پھر واپس جانے کا بھی مسئلہ ہے تو میں نے کہا لیجئے ہم خراسان آ گئے......

نیپال کی سرزمین یوں تو اپنی جغرافیائی حیثیت سے اور وسائل کے لحاظ سے کوئی ایسے کوہ قاف پر نہیں واقع ہے لیکن اپنی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے میرے لئے اس وقت یہاں کا سفر کرنا بہت مشکل تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات مقدر تھی اور اس کا وقت مقرر تھا کہ میں آؤں۔

حضرات گرامی! مجھے بہت خوشی ہے، میں آپ سے بلا تکلف کہتا ہوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ و اساتذہ سے خطاب کر رہا ہوں۔ ایک ہی خاندان ہے اور جہاں تک آپ کا اور ہمارے یہاں کے رہنے والے مسلمان بھائیوں کا تعلق ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں لکھنؤ میں کھڑا ہوں، یا رائے بریلی اپنے وطن میں ہوں اور ان سے خطاب کر رہا ہوں، مجھے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

تفصیل کے ساتھ سپاسنامہ میں یہاں کے حالات پیش کئے گئے ہیں، وہ تفصیل بہت دل کشا ہے اس کا تقاضا تھا اور ہے کہ میں بھی تفصیل کے ساتھ جواب دوں، لیکن میں اس وقت اس حال میں نہیں ہوں۔ میں آپ کے سامنے چند ضروری باتیں رکھتا ہوں۔

پہلی بات تو مجھے اپنے طلبہ سے کہنی ہے، دیکھیئے دنیا میں ہمیشہ سے، جب سے کہ دنیا

قائم ہے اور دنیا کی جتنی تاریخ ہمارے سامنے محفوظ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں آدمی کی محنت اپنا رنگ دکھاتی ہے اور کمال نے اپنی قیمت وصول کر لی ہے اس میں نہ کسی زمانہ کی خصوصیت ہے نہ کسی ملک کی خصوصیت ہے نہ کسی نسل ونسب کی خصوصیت ہے نہ خاندان و برادری کی، نہ کسی جغرافیائی اختلاف کی...... جس طریقہ سے خوشبو پھیلتی ہے تو وہ اپنا وجود منوالیتی ہے، پھولوں کا حسن ہے، باغ کی رعنائی اور اس کی دلکشی ہے، ستاروں کی چمک ہے، سورج کی روشنی ہے چاند کا حسن و جمال ہے، یہ سب چیزیں خود اپنی قیمت وصول کر لیتی ہیں اور اپنے وجود کو منوالیتی ہیں...... اس کے لئے کسی سند کی بھی حقیقت میں ضرورت نہیں، میں اپنے طالب علموں سے کہوں گا کہ آپ محنت کریں، یوں تو سب میں آپ کو درک ہونا چاہئے اور استعداد ہونی چاہئے، لیکن کسی ایک فن کو آپ اپنا موضوع بنالیں اس میں امتیاز پیدا کریں...... اگر آپ نے یہاں امتیاز پیدا کیا تو آپ یقین جانئے کہ اس کی رسید کی آواز بلاد عربیہ سے آئے گی۔ آپ کے سامنے اس کی مثالیں ہیں، میں نام نہیں لوں گا اور اگر اس میں اپنی خودستائی نہیں تو اپنے خانوادہ کی یا اپنے علمی مرکز دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعریف نکلے گی جو اپنی ہی تعریف ہوتی ہے۔ یہ سنت الٰہی ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلاً ○ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَحْوِيلاً ○ اتنی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ کسی قسم کا تغیر نہیں پاؤ گے...... پہلے کہا "تبدیلا" پھر کہا "تحویلا" کوئی اس میں تبدیلی کچھ الٹ پھیر نہیں پاؤ گے۔

آپ کسی ایک فن میں امتیاز پیدا کریں

ایک بات تو آپ سے کہتا ہوں جو میں بڑے بڑے چوٹی کے مدرسوں میں کہتا رہا ہوں کہ آپ کسی فن میں امتیاز پیدا کریں اور اس میں ایک جملہ جو میری زبان سے اکثر نکلا ہے اور اس کو میں نے وظیفہ کے طور پر یاد رکھا ہے وہ یہ کہ آپ اخلاص واختصاص پیدا

کریں، جہاں تک اللہ کا معاملہ ہے اس میں خلوص ہو، اس میں اللہ کی رضا کی نیت ہو، اللہ کی رضا کی طلب ہو کہ اللہ ہم سے راضی ہو، ہم قرآن وحدیث پڑھ رہے ہیں ہم فقہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں تا کہ ہم اللہ کو پہچانیں اور اس کے رسول کو جانیں اور اس کے کلام کو سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں اور اس کے مطابق عمل کریں۔

اخلاص واختصاص کی اہمیت

پہلی بات تو یہ ہے کہ اخلاص ہو، دوسری بات یہ کہ اختصاص ہو، یعنی کسی ایک فن میں دوسروں کے مقابلے میں امتیاز حاصل ہو اس کی طرف انگلیاں اٹھیں جو اہل کمال ہیں، پہچاننے والے ہیں وہ کہیں کہ یہ اس فن میں بہت بڑھا ہوا ہے، سینکڑوں سے بڑھا ہوا ہے ایک طرف تو طالب علموں سے یہ کہوں گا کہ اخلاص واختصاص پیدا کریں اور اپنی نیت صحیح کریں، صرف اللہ کی رضا کی نیت ہو، باقی چیزیں خود بخود پیدا ہوں گی، یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا قانون ہے وہ خود بخود حاصل ہوں گی اور دوسرے یہ کہ کسی خاص فن میں کسی ایک چیز میں کم سے کم ایک چیز میں (اور اللہ توفیق اور ہمت دے تو اس سے زیادہ میں) اختصاص یعنی امتیاز ہو، یقیناً زمانہ بہت بدل گیا ہے لیکن اس بارے میں کچھ نہیں بدلا، آج بھی جن لوگوں نے کوئی امتیاز پیدا کرلیا ہے، انہوں نے اپنا امتیاز منوالیا ہے، دشمنوں تک سے منوالیا ہے، تسلیم کروالیا ہے، گردنیں جھک گئی ہیں اور لوگ ان کے قدموں پر پڑتے ہیں ان کی خوشامدیں کرتے ہیں، ان کو سر پر بٹھا کر آنکھوں میں جگہ دے کر لے جانا چاہتے ہیں، ایک بات تو یہ ہے اس میں نہ تو نیپال کی خصوصیت ہے، نہ برما کی کوئی خصوصیت ہے آج ہم ان لوگوں کے نام پڑھتے ہیں ان کے نام کے ساتھ نسبتیں دیکھتے ہیں آج اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو نہیں معلوم کہ...... صاحب ہدایہ مرغینانی کہاں کے رہنے والے ہیں کوئی تبریزی ہیں اور کوئی زمخشری ہیں کوئی سکاکی ہیں اب جغرافیہ میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوگئی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے تو یہ نیپال کی، یا ہندوستان کی یا

کسی صوبہ کی کوئی خصوصیت نہیں آپ کمال پیدا کریں گے تو ساری دنیا کم سے کم عالم اسلام آپ کے کمال کو مان لے گا اور اگر آپ کہیں چھپ کر رہنا چاہیں گے تو آپ کو کوئی چھپنے دے گا نہیں...... آپ ہزار پردے میں بیٹھیں، لوگ آئیں گے اور پردے اٹھا لیں گے اور آپ کو سر پر بٹھا کر لے کر جائیں گے وہ خوشامدیں کریں گے، آپ کے پاؤں پر ٹوپی ڈال دیں گے...... آپ ہمارے مدرسہ چلئے! آپ ہمارے کالج چلئے......! ہماری یونیورسٹی چلئے...... یہ فن پڑھائیے!۔

اپنے طالب علموں سے تو یہ کہتا ہوں کہ اخلاص و اختصاص پیدا کریں، اللہ کے معاملہ میں اخلاص، کوئی نیت نہیں نہ کمانے کی نہ کھانے کی، نہ اتنی بڑی تنخواہ اور فن کے لحاظ سے (علم کا جہاں تک معاملہ ہے) اختصاص ہو اس لئے کہ بغیر اختصاص اور بغیر امتیاز کے کوئی چیز نمایاں نہیں ہوتی حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کا قول ہے قیمة کل امری ما یحسنه (ہر شخص کی قیمت وہ ہے جس کام کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر انجام دے سکتا ہے) میں طالب علموں سے یہ کہوں گا کہ تم محنت کرو، تمہاری یہ محنت تمہیں چمکائے گی اور دور تک لے جائے گی کہاں کا ندوہ؟ کہاں کا دارالعلوم دیو بند......؟ اور کہاں کا جامعہ ازہر......؟ تم چمکو گے اور اس میں نیپال کا ہونا اتنی دور ہونا اتنا مشکل اتنا لمبا راستہ ہونا کوئی چیز حائل نہیں ہوگی...... جو لوگ صاحب کمال تھے ان کو لوگ کہاں کہاں سے لائے اور اس کو کیسی جگہ دی؟ طالب علموں سے کہتا ہوں کہ شکر کریں اللہ کا، اللہ تعالیٰ نے ایسی دور افتادہ جگہ میں دینی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا میں آپ سے صاف کہتا ہوں، نیپال کا تعارف صرف فوجی سپاہیوں، پہرے داروں کی وجہ سے تھا، میں آپ سے صفائی کے ساتھ کہتا ہوں بہت پڑھتا لکھتا ہوں دنیا میں پھرا ہوں کہ میں نیپال کو گورکھوں کی وجہ سے جانتا ہوں، نیپال وہ جگہ ہے جو بڑے مضبوط فوجی دیتا ہے بہت امانت دار، بڑے جفاکش پہرے دار دیتا ہے جس کو بڑے بڑے رئیس اور نواب لوگ اپنے دروازے پر

بٹھاتے تھے لیکن ابھی تک عالموں کی حیثیت سے نیپال کا تعارف نہیں ہوا تھا لیکن اللہ جزائے خیر دے اللہ قبول فرمائے کہ یہ دارالعلوم یہاں قائم ہوا اور ندوی فضلا اس کو چلا رہے ہیں جن لوگوں کے نام لئے گئے اللہ ان کے درجے بلند فرمائے۔ اس کی وجہ سے اب انشاء اللہ نیپال کا نام صرف گورکھوں کی وجہ سے اور پہرے داروں کی وجہ سے نہیں ہوگا، عالموں کی وجہ سے بھی ہوگا...... اس معاملہ میں شہروں اور ملکوں کا فرق نہیں ہوتا لکھنؤ، دلی، جونپور (جو شیراز ہند کہلاتا تھا) بھوپال، ٹونک جو کبھی بڑے بڑے اہل کمال کا مرکز بن چکے ہیں، رام پور میں بڑے بڑے منطقی اور فلسفی تھے اور سنسری کا یہ علاقہ اور آپ کا یہ جلپاپور (نیپال) میں کوئی فرق نہیں ہوگا، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سنت الٰہی ہے کہ اعتراف کمال میں ناموں کا، فاصلوں کا اور ان کی سابقہ روایات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ تو طالب علموں سے کہتا ہوں...... آپ اپنے درجہ میں بھی ممتاز ہوں گے اور نگاہیں اٹھیں گی، انگلیاں اٹھیں گی، دیکھو یہ نیپال کے طالب علم ہیں، یہ صرف ونحو میں ہمارے طالب علموں سے اچھے ہیں، یہ مطالعہ دیکھ کر آتے ہیں اور بعد میں بھی پڑھتے ہیں ان کی استعداد بھی بڑی اچھی ہے اور یہ انشاء اللہ بڑی ترقی کریں گے، اس میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایران کے تھے ان کے بزرگوں میں کوئی بڑے عالم بھی ہوئے ہیں ان کے والد تک عالم نہیں تھے، اور غزالی کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ ان کا خاندان اون کا کام کرنے والا تھا، ایک جلیل القدر بزرگ خواجہ نقشبند کہلاتے ہیں ان کے یہاں نقاشی کا کام ہوتا تھا کوئی بزرگ کچھ کہلاتے ہیں...... تو اس سے آپ سمجھ لیجئے اس کے علاوہ خصاف یعنی جوتا گانٹھنے والے، زیات یعنی تیل بیچنے والے، خیاط کپڑا سینے والے جن کے پیچھے ہم نے بیسیوں نمازیں پڑھی ہوں گی، حرم شریف جو دنیا میں سب سے بڑھ کر عزت واحترام کی جگہ اور عبادت گاہ ہے جہاں کی امامت سب سے فخر اور شرف کی بات سمجھی جاتی ہے اور وہ بیت اللہ کہلاتا ہے اس کے امام خیاط تھے، غالباً بھوپال

کی طرف کے تھے یا کہاں کے تھے؟ وہ شیخ عبد اللہ الخیاط ہندوستانی تھے لیکن اپنے علم کی وجہ سے ان کو حرم کا امام بنایا گیا، اور ایسی کتنی مثالیں دے سکتا ہوں، بڑے بڑے مصنفین کے ساتھ کیا کیا لگا ہوا ہے بعض تو حجار ہیں یعنی پتھر توڑنے والے، ہم نے بھی ان کی زیارت کی ہے، قدوری ایک بہت بڑے فقیہ ہیں جن کی کتاب فقہ کے ضروری نصاب میں داخل ہے، شروع میں وہ قدوری تھے یعنی ہانڈیاں بناتے تھے مٹی کی، اور قدوری کہلاتے تھے انہوں نے کتاب لکھی اور وہ کتاب مقبول ہوئی اس کتاب نے منوالیا اپنے کو، اور مصنف کو بھی، طالب علموں سے یہ بات مختصر کہتا ہوں کہ آپ محنت کیجئے اور اخلاص واختصاص پیدا کیجئے، آپ بھی چمکیں گے اور اپنے ملک کو بھی چمکائیں گے اور آپ کی روشنی دور تک پھیلے گی۔

اب ہم اپنے ان بھائیوں سے جو مدرسہ سے طالب علمی کا تعلق نہیں رکھتے ہیں اپنے دینی جذبہ اور دین کے شوق میں آئے ہیں کہتا ہوں کہ آپ ایسے ملک میں ہیں کہ اگر آپ اس ملک کے رہنے والوں کے دل جیت لیں اور ان کو اسلام کی طرف مائل کر لیں اور ان کے دلوں میں ایمان کا بیج ڈال دیں تو آپ نہ صرف اسلام کی بلکہ انسانیت کی خدمت کریں گے کیونکہ یہ ملک اسلام سے ناآشنا رہا ہے، ابھی ہمارے عزیز بھائی نے جو اس ملک پر ایک تاریخی روشنی ڈالی ہے یہاں کیسے کیسے لوگ ہوئے ہیں، ان میں رام جی کا نام آیا ہے اور بودھ جی کا نام آیا...... اور لچھمن جی کا نام آیا ہے لیکن یہاں کسی سیدنا جیلانی کا نام نہیں آیا، خیر ان کا ہونا آسان کام نہیں، کسی بزرگ کا کسی مرشد کا، کسی فقیہ کا اور کسی مفسر کا نام نہیں آیا تو آپ یہ کوشش کریں کہ آپ اپنے اخلاق اور اپنے کیرکٹر سے زندگی کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ یہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں اور وہ اسلام کا مطالعہ کریں اور آئیں مدرسوں میں کہ ہمیں آپ بتائیں کہ اسلام کی کیا خصوصیات اور کیا تعلیمات ہیں؟ نیپالی زبان میں ہو، انگریزی زبان ہو یا ہندی میں، ہم سمجھیں کہ کیا بات ہے کہ لوگ اتنے

مختلف ہیں ...... میں نے آکسفورڈ میں (جو انگلستان کا بہت بڑا علمی و تعلیمی مرکز ہے) تقریر کی، وہاں کے لوگوں کے سامنے ہندوستان کا ایک واقعہ بیان کیا کہ جب ہندوستان کے مجاہدین نے پشاور فتح کیا اور اس میں کئی ہفتے ممکن ہے کئی مہینے گذر گئے وہاں ایک دن ایک پٹھان نے ایک ہندوستانی کا ہاتھ پکڑا (اودھ کا یا کہیں کا رہنے والا ہوگا) اور کہنے لگا میاں ایک بات پوچھتا ہوں صحیح صحیح جواب دینا، کیا تم ہندوستانیوں کی دور کی نظر کچھ خراب ہوتی ہے، کمزور ہوتی ہے، دور کی چیز تم دیکھ نہیں سکتے ......؟ اس نے کہا نہیں، ہم خوب دیکھتے ہیں ...... کہا نہیں! کوئی بات ہے ضرور، ہندوستانیوں کی دور کی نظر کمزور ہے، اس ہندوستانی نے کہا یہ تو آپ بتلایئے کہ یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، یہ بات تو ہر ایک پوچھتا نہیں یہ کوئی ایسی پوچھنے والی بات بھی نہیں ہے، آپ پوچھ کیوں رہے ہیں ...... ہم بھی اتنا ہی دیکھتے ہیں جتنا آپ دیکھتے ہیں، مگر آپ پوچھ کیوں رہے ہیں؟

پٹھان نے کہا پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ مہینوں سے گھر سے نکلے ہوئے ہو اپنے گھر بار کو، بیوی بچوں کو چھوڑے ہوئے ہو، اور تندرست ہو ...... ماشاء اللہ شکیل ہو، ہم نے تم میں سے کسی کو کسی نامحرم عورت کو دور سے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا، تمہاری نگاہیں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں ایک آدمی کا معاملہ ہو تو آسان ہے سارے کے سارے کیوں نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے، عورتوں کو اور لڑکیوں کو، لوگ جانتے ہیں کہ پشاور میں صوبہ سرحد میں خوبصورتی زیادہ ہے یعنی وہاں کچھ ایسی کشش بھی ہے کہ آدمی دیکھے اور اس کے اندر اس کا خیال پیدا ہو، شوق پیدا ہو تو ہم نے سوچا کہ دو چار زاہد ہو سکتے ہیں عابد ہو سکتے ہیں بڑے محتاط متقی ہو سکتے ہیں ...... لیکن فوج میں تو لوگ عام طور پر زاہد نہیں ہوتے جوان ہوتے ہیں، ہٹے کٹے ہوتے ہیں، ہٹے کٹے لوگ پھر اپنے گھر سے دور، کوئی اپنی بیوی سے دور دو برس سے ملا نہیں کوئی چار برس سے ملا نہیں کوئی چھ مہینے سے نہیں ملا اور جوان بھی ہیں کبھی تو یہ نظر اٹھا کر دیکھتے کہ یہاں کی عورتیں کیسی ہوتی ہیں، دیکھنے ہی سے

کچھ اپنی تسکین کر لیتے، لطف لیتے تو ہم سمجھے کہ یہ کوئی تقویٰ اور زہد کی بات نہیں بلکہ ان کی دور کی نظر ہی نہیں۔

ہندوستانی نے جواب دیا کہ نہیں! الحمد للہ ہماری دور کی نظر خوب کام کرتی ہے، ہم دور کی چیز صاف دیکھتے ہیں لیکن یہ ہمارے امام کی تربیت کا نتیجہ ہے، قرآن مجید کی آیت پر عمل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ.

"(اہل ایمان سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، عفت وطہارت کے ساتھ رہیں)۔"

سننے والوں کو بڑا تعجب ہوا! ہم نے وہاں ہندوستان کے لوگوں سے کہا کہ آپ یہ نمونہ دکھائیں، لوگوں کو یہ شوق پیدا ہو کہ یہ چیز کہاں سے آئی، یہ لوگ گھر چھوڑے ہوئے اتنے دنوں سے یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، کوئی بی اے میں پڑھ رہا ہے کوئی بی ایس سی میں پڑھ رہا ہے کوئی ایم ایس سی میں پڑھ رہا ہے کسی کو چار برس ہوئے کسی کو چھ برس ہوئے اور یہاں بہت خرچ ہوتا ہے ہندوستان جانے میں اور ان میں سے اکثر کی شادی نہیں ہوئی اور یہاں کی لیڈیز اپنی خوبصورتی میں مشہور ہیں، ساری دنیا میں اور خود ہندوستان میں لوگ بڑی للچائی ہوئی بڑے شوق کی نگاہوں سے ان کو دیکھتے تھے یہاں کیوں نہیں دیکھتے ان کے اندر یہ سوال پیدا ہو اور پھر وہ سمجھیں کہ یہ اسلام کا فیض ہے یہ اسلام کی تربیت کا فیض ہے۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک بات تو یہ ہے کہ آپ اس شہر میں چلیں، پھریں، دوکانیں کھولیں، ملازمت کریں، ملیں جلیں اور دور رہنے کی ضرورت نہیں لیکن آپ اپنا امتیاز ثابت کریں، نیپال کی اس سرزمین پر سوال پیدا ہو کہ یہ کون سے لوگ ہیں، یہ کوئی

بے احتیاطی نہیں کرتے یہ کسی نامحرم کو نہیں دیکھتے یہ وہ ہیں کہ اگر ملازمت کرتے ہیں تو بڑی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ کرتے ہیں پھر یہ گرے پڑے لوگوں کو سہارا دیتے ہیں، یہ غریبوں اور کمزوروں پر زیادتی نہیں کرتے، یہ کیرکٹر آپ کو دکھانا چاہئے۔

مجھے امید نہیں کہ اس کے بعد آپ سے ملنے اور کہنے سننے کا موقع ملے گا اور ملے گا تو کب ملے گا؟ ہم آپ پھر جمع ہوں گے یا نہیں ہوں گے اس لئے میں یہ دو تین باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں ایک بات تو یہ کہ آپ اپنی زندگی کا نقشہ، اپنی زندگی کا طرز ایسا بنائیں کہ لوگوں کے اندر سوال پیدا ہو، تجسس پیدا ہو کہ بھئی پوچھنا چاہئے کہ یہ بات ان میں کہاں سے آئی؟ یہی بات تھی جس کی وجہ سے انڈونیشیا مسلمان ہو گیا...... پورا کا پورا ملک مسلمان ہو گیا، مؤرخین کہتے ہیں کہ وہاں کوئی اسلامی فوج نہیں پہنچی، یہ بات مانی ہوئی ہے تاریخی طور پر لیکن پورا کا پورا ملک پہلے سو فیصد ہی مسلمان تھا اب وہاں کچھ شامت اعمال سے، کچھ حکومتوں کی خرابی سے، کچھ امریکہ اور برطانیہ کی سازش سے کہیں کہیں عیسائیت پھیل رہی ہے، ایک بات تو یہ کہ آپ اپنے اخلاق سے، اپنی ایمانداری سے، اپنی سچائی سے، اپنی شرافت سے ثابت کریں کہ...... آپ کوئی اور نمونہ، کوئی اور ماڈل اور کوئی اور چیز ہیں۔

مکاتب و مدارس کی ضرورت

دوسری بات یہ کہ مکاتب اور مدارس قائم کیجئے کوئی بستی کوئی گاؤں ایسا نہ ہو جہاں کوئی مکتب اور مدرسہ نہ ہو، جہاں دینی تعلیم نہ دی جائے اور عورتوں تک کو گھر میں خواتین کو مستورات کو اپنے گھر میں بیٹیوں اور بچیوں کو دین کی تعلیم دیجئے اور ان کو تاکید کیجئے کہ اپنے بچوں کو بھی تعلیم دیں، پیغمبروں کے قصے سنائیں توحید کی محبت پیدا کریں شرک سے نفرت دلائیں، بداخلاقیوں سے نفرت پیدا کریں، دلوں میں حضور سے عشق اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا کریں جب جا کر یہاں ایمان محفوظ رہے گا نئی نسل کا، ورنہ کوئی ٹھکانہ

نہیں، کوئی بھروسہ نہیں اس کا......

تیسری بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ہندوستان میں یہ آفت آئی ہوئی ہے کل ہی بھاگل پور میں بڑا جلسہ ہوا، ہزاروں آدمی تھے، وہاں میری تقریر ہوئی اور بڑے بڑے علماء کی تقریریں ہوئیں، اس سے پہلے مونگیر میں بڑا جلسہ ہوا ہزاروں ہزار آدمی تھے، کرناٹک سے اور آندھرا پردیس سے اور کہاں کہاں سے علماء آئے، وہاں ایک مصیبت ہے شادیوں میں فضول خرچی اور دھوم دھام اور نمائش کی اور سخت درجہ کے اسراف، فضول خرچی کی، بڑی بڑی باراتیں لے جانا، اور بڑے کھانوں کا اہتمام۔

اور پھر وہاں ایک اور مصیبت آئی ہوئی ہے، بلکہ خدا کا ایک عذاب آیا ہوا ہے کہ لڑکی والوں سے فرمائش کی جاتی ہے کہ لڑکی کو اتنا جہیز دیا جائے موٹر دی جائے اور وہ موٹر لے کر آئے اور اتنی رقم لے کر آئے جب ہم اپنے لڑکے سے شادی کریں گے نہیں تو نہیں کریں گے...... خدا کرے آپ کے یہاں یہ نہ ہو۔

دین کی قدر کریں

آخر میں یہ کہ آپ اپنے دین کی قدر کریں اس کو سب سے بڑی نعمت سمجھیں، نمازوں کی پابندی کریں اور کلمہ کے معنی سمجھیں، قرآن مجید کی کچھ سورتیں آپ کو یاد ہونی چاہئیں ان کے معنی مطلب بھی اگر آپ سمجھ سکیں یاد کر سکیں تو یاد کریں اور دین کی ضروری معلومات حاصل کرنے کا آپ کو شوق ہو، آپ مدرسوں میں جائیں اور پھر آپ گاؤں گاؤں میں مکتب مدرسہ قائم کریں، خلاصہ یہ کہ اپنے دین وایمان کی سب سے زیادہ فکر کریں اور اللہ سے دعا کریں اور کوشش کریں کہ اسلام پر قائم رہیں، ایمان پر خاتمہ ہو قرآن شریف میں آتا ہے "وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" (دیکھو نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو) اس کی کوشش کریں سب سے بڑی نعمت، سب سے بڑی دولت، سب سے بڑی خوش قسمتی، سب سے بڑی اقبال مندی، اسلام کی دولت کا مل جانا

اور ایمان پر خاتمہ ہونا، اللہ کے رسول کی شفاعت نصیب ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے جام کوثر پینا اور جنت کا مستحق قرار پانا ہے۔ اس کو سب سے بڑی دولت سمجھیں اور اس کی پوری حفاظت کریں۔

مدارس دینیہ کے وجود کو غنیمت جانیں

میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور آپ سے کہتا ہوں کہ آپ مدرسوں کی قدر کریں کہ یہاں سے پڑھ کر یہ دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں، اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں...... اور ماشاء اللہ یہ آپ کے ملک کا نام روشن کرتے ہیں اور آپ کے ملک کی عزت بڑھاتے ہیں۔ آپ اس کی قدر کریں اور ان مدرسوں کی ضروریات کی تکمیل کریں...... یہاں تعمیرات کی ضرورت ہے، ابھی تعمیرات پوری نہیں ہوئیں، وہاں اس کی کوشش کریں جہاں ضرورت ہے خرچ کر کے لڑکوں کو طالب علموں کو وظیفہ دیا جائے ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا جائے اس میں بھی آپ مدد کریں، یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑے ثواب کا کام ہے، اس کی قدر آپ کو قیامت میں معلوم ہوگی آپ کی وجہ سے کوئی طالب علم دین حاصل کرے اللہ و رسول کا نام ہی نہ سیکھے بلکہ اللہ و رسول کا نام سکھانے کی اس میں قابلیت پیدا ہو جائے اس سے بڑا صدقہ جاریہ کیا ہے......؟

انہیں چند باتوں پر میں ختم کرتا ہوں، ان کو گرہ میں باندھ لیں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں......

آخر میں ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی اس مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے اس مرکز کو اپنی امید اور اپنے تصور سے زیادہ پایا، ہمیں بڑی خوشی ہوتی اگر ہمیں یہاں زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع ملتا لیکن کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ ہم زیادہ وقت نہیں دے سکتے مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم نے آکر خود ہی کہا کہ ہم خطاب کرنا چاہتے ہیں حالانکہ

ہماری حالت کا تقاضہ یہ تھا کہ ہم کہتے بھئی کچھ بات نہیں کرسکیں گے ہمیں تو سلا دینا، لٹا دینا، ہم آرام کرلیں اور کل صبح ہی ہمیں جانا ہے...... لیکن آپ کی محبت کا، آپ کے خلوص کا اور ان بلانے والے بھائیوں کے خلوص کا اثر تھا کہ ہم نے خود ہی اپنی طرف سے کہا کہ اگر کوئی پروگرام ہو یا آپ کرسکیں تو کیجئے، اپنے بھائیوں کو دیکھ لیں کہاں پھر ہم دیکھنے کے لئے آئیں گے...... یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ اپنے کلمہ گو بھائیوں کو اپنے دینی بھائیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھیں، خوش ہوں اور اللہ کا شکر ادا کریں کچھ اللہ و رسولؐ کے دین کی باتیں ہم ان سے کرلیں، سن بھی لیں اللہ کا شکر ہے کہ یہ کام ہوگیا...... بس اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قبول فرمائیں۔

وما التوفیق الا من عند اللہ.

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علماءِ ربانی
ان کا منصب اور ان کے کام کی نوعیت

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على رسوله الكريم اما بعد اعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم انما يخشى الله من عباده العلماء .(۱)
وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم العلماء ورثة الانبيآءِ.(۲)

علماء انبیاء کے جانشیں ہیں

علماءِ حق حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث اور جانشین ہیں۔ ان کی وراثت اور نیابت اسی وقت صحیح اور مکمل ہوگی جب ان کی زندگی کا مقصد اور ان کی کوششوں کا مرکز وہی ہوگا جو انبیاء کرام علیہم السلام کا تھا۔ وہ مقصدِ زندگی اور وہ مرکزِ سعی وعمل کیا ہے؟

دولفظوں میں ''اقامتِ دین'' یا ایک لفظ میں ''توحید'' یعنی انسانوں کو اختیاراً وعملاً اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا ''عبد'' بنانا جیسا کہ وہ فطرتاً اور اضطراراً اس کے عبد ہیں۔ اللہ جل شانہ کی حکومت اور قانون کو انسانوں کے جسموں اور ان کی متعلقہ زمین پر قائم کرنے کی کوشش کرنا۔ جیسا کہ وہ زمین وآسمان پر قائم ہیں۔

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ○ (صف ۶۱: ۹)

---

(۱) سورہ فاطر پارہ ۲۲
(۲) صحیح بخاری کتاب العلم

''وہ ہے جس نے اپنا رسول رہنمائی اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو سب دینوں (تمام قسم کے نظامِ اطاعت) پر غالب کر دے اگر چہ شرک کرنے والوں کو یہ ناگوار ہو۔''

اس دینِ حق کے لئے ہر زمانہ میں چند موانع اور مزاحم ہوتے ہیں جن میں سے اکثر ان چار اقسام میں داخل ہیں:

شرک کیا ہے

یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنانا، اللہ کے سوا کسی ہستی کو مافوق الطبعی طور پر نافع مان لینا اس کو کائنات میں متصرف اور موثر تسلیم کر لینا۔

احتیاج والتجاء (پناہ جوئی) اور خوف ورجاء اس عقیدہ کے بالکل قدرتی اور طبعی نتائج ولوازم ہیں اور دعا واستعانت اور خضوع (جو عبادت کی حقیقت ہے) اس کے لازمی مظاہر ہیں۔

شرک ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہے اس کا اور دین کا کسی ایک جسم یا دل ودماغ یا خطۂ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے۔ یہ غیر الٰہی دین جسم ونفس اور جسم و نفس سے خارج اتنی ہی جگہ گھیرتا ہے جتنی دین اللہ کو کم سے کم درکار ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللهِ. (البقرہ ۲:۱۶۵)

''بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے برابر اوروں کو بناتے ہیں ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی۔''

قَالُوْا تَاللهِ اِنْ كُنَّا لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (شعراء ۲۶:۹۶-۹۸)

''مشرکین نے کہا خدا کی قسم ہم کھلی ہوئی گمراہی مین تھے جو تم کو

(معبودوں کو) سارے جہان کے پروردگار کے برابر کرتے تھے۔''

اس لئے جب تک زمین سے شرک کی تمام جڑیں اور اس کی باریک سے باریک رگیں بھی اکھاڑ نہ دی جائیں اس وقت تک دین اللہ کا پودا لگ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ پودا کسی ایسی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا جس کی مٹی میں کسی اور درخت کی کوئی جڑ ہو یا کوئی اور تخم ہو۔ اس کی شاخیں اسی وقت آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور یہ درخت اسی وقت پھلتا پھولتا ہے جب اس کی جڑ گہری اور مضبوط ہو۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراھیم ۱۴: ۲۴، ۲۵)

''تم نے نہ دیکھا اللہ نے کیسی ایک مثال بیان کی، پاکیزہ بات (کلمۂ طیبہ وغیرہ) ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں اپنا پھل لاتا ہے ہر وقت اپنے رب کے حکم سے۔''

یہ درخت کسی دوسرے درخت کے سایۂ میں بڑھ نہیں سکتا۔ یہ جہاں رہے گا تنہا رہے گا۔ اس کی طبعی نشو ونما کے لئے لامتناہی فضا چاہئے۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ. (زمر ۳۹: ۳)

''یاد رکھو اللہ ہی کی تنہا تابعداری ہے۔''

جاہلیت کی علامت

پس جو لوگ دین اللہ کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں وہ اس کو کسی

جگہ قائم کرنے کے لئے زمین کو پورے طور پر صاف اور ہموار کرتے ہیں۔ وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں چن چن کر نکالتے ہیں اور ان کا ایک بیج بنا بنا کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے اور کتنی ہی زحمت اٹھانی پڑے اور چاہے ان کی دن رات کی اس کوشش اور عمر بھر کی اس جدوجہد کا حاصل حضرت نوحؑ کی طرح چند نفوس سے زیادہ نہ ہو۔ اور چاہے بعض پیغمبروں کی طرح ان کی ساری زندگی کا سرمایہ صرف ایک شخص ہو۔ لیکن وہ اس نتیجہ پر قانع اور اس کامیابی پر مسرور ہوتے ہیں اور نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔

کُفر یعنی اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا انکار، اس کی حکومت سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرتابی ہے خواہ کسی طریقہ اور علامت سے ظاہر ہو۔

اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اللہ اور رسول کے احکام میں سے کسی حکم کو بھی یہ جان لینے کے بعد کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے، نہیں مانتے یا زبان سے تو انکار نہیں کرتے مگر جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خواہ دوسرے احکام کے پابند ہوں اس دائرے سے خارج نہیں۔

اللہ تعالیٰ یہودیوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ؁ (البقرہ ۲ : ۸۵)

”کیا کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو دوسرے حصے کو نہیں مانتے تو اس کی کیا سزا ہے جو تم میں سے یہ کام کرتا ہے سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے اور قیامت کے دن وہ پہنچائے جائیںگے سخت سے سخت

عذاب میں اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔"

صرف اللہ تعالیٰ کی خداوندی اور حاکمیت کے اقرار سے طبعی طور پر خداوندی اور حاکمیت کے تمام دعویداروں کی خداوندی اور حاکمیت کا انکار ہو جاتا ہے۔ لیکن جو اشخاص خداوندانِ باطل کی خداوندی اور حاکمیت کا صاف صاف انکار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے یا دوسرے الفاظ میں انھوں نے اس قبلہ کی طرف منہ تو کر لیا ہے لیکن دوسرے قبلوں کی طرف ان سے پیٹھ بھی نہیں کی جاتی۔ دینِ الٰہی کے مقابلے میں دنیا میں جو نظامِ حاکمیت قائم، اور شریعتِ الٰہی کے مقابلے میں جو قوانین نافذ ہیں ان سے منحرف نہیں ہوا جاتا، وہ کبھی کبھی ان پر بھی عمل کر لیتے ہیں اور بوقتِ ضرورت ان کی طرف رجوع کر لیتے ہیں، وہ در حقیقت اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔

ایمان باللہ کے لئے کفر بالطاغوت[1] ضروری ہے اور اللہ نے اس کو ایمان پر مقدم کیا ہے:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى. (البقرہ ۲:۲۵۶)

"جو سرکشی کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا۔"

اس لئے قرآن نے ایسے اشخاص کا دعویٔ ایمان قبول نہیں کیا۔ جو غیر الٰہی قوانین اور ان کے مرکزوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کو اپنا حاکم اور ثالث بناتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

[1] طاغوت ہر وہ ہستی ہے جس کی خدا کے مقابلہ میں اطاعتِ مطلق کی جائے۔ "اَلطَّاغُوْتُ عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مُتَعَبِّدٍ كُلِّ مَعْبُوْدٍ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ." (امام راغب اصفہانی)
خواہ وہ شیطان ہو، انسان ہو یا سلطان ہو ان سب پر طاغوت کا اطلاق ہوگا۔۱۲

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا○ (النساء ۴ : ۶۰)

''تم نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے جو حق آپ سے پہلے اتارا گیا چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں سرکش کی طرف، حالانکہ ان کو حکم ہو چکا ہے کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر دور لے جا ڈالے۔''[1]

اس کفر کی بو ان اشخاص سے بھی نہیں نکلتی جو مسلمانوں کے دائرے میں آجانے کے بعد بھی ''جاہلیت'' سے منحرف اور عقائد و رسومات جاہلیت سے بے تعلق نہ ہو سکے۔ ان کے دلوں سے ابھی تک ان چیزوں کی نفرت اور کراہت نہیں گئی۔ اور ان کاموں کی تحقیر نہیں نکلی۔ جن کو جاہلیت بُرا سمجھتی ہے ان سے نفرت اور ان کی تحقیر کرتی ہے خواہ وہ اللہ کے دین میں پسندیدہ اور مستحب ہوں اور اللہ کے رسول کی محبوب سنت ہوں۔

اسی طرح ان کے دلوں سے ابھی تک اعمال و اخلاق اور رسوم و عادات کی محبت اور عزت دور نہیں ہوئی جو اہلِ جاہلیت کے نزدیک محبوب و معزز ہیں خواہ وہ اللہ کی شریعت میں مکروہ اور حقیر ہوں۔

اسی طرح جن لوگوں کے دلوں سے ابھی تک جاہلی حمیت اور عصبیت دور نہیں ہوئی اور ان کا عمل جاہلیتِ عرب اور در حقیقت ہر جاہلیت کے اس مقبول و مسلم اصول پر

---

[1] یہ آیت ترمذی کی روایت کے مطابق اس منافق کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اپنے ایک مقدمہ میں (جس کا دوسرا فریق ایک یہودی تھا) مشہور یہودی عالم کعب بن الاشرف کو قاضی اور حکم بنایا تھا۔ (ترمذی کتاب التفسیر)

ہے کہ ''اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا'' ''اپنے بھائی کی ہر حال میں مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم''۔

اس سے زیادہ نازک بات یہ ہے کہ اسلام کو اختیار کر لینے کے بعد بھی یا مسلمان کہلانے کے باوجود بھی حُسن و قبح کا معیار وہی ہو جو جاہلیت میں ہوتا ہے۔ اشیاء کی قیمت وہی ہو جو جاہلیت نے قائم کر دی ہے۔ زندگی کی انہیں قدروں اور انہیں معیاروں کی وقعت ہو جو جاہلیت تسلیم کرتی ہے۔

اسلام کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ کفر اور اس کے پورے ماحول، اس کے تمام متعلقات، اس کی تمام خصوصیات اور شعائر سے نفرت پیدا ہو جائے اور اس کی طرف واپسی اور اس میں مبتلا ہو جانے کے تصور سے آدمی کو تکلیف ہو، اور ایمان کی پختگی یہ ہے کہ وہ کفر کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کے مقابلے میں موت کو زیادہ پسند کرتا ہو۔

بخاری کی روایت ہے:

ثَلٰثٌ مَنْ کُنَّ فِیْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِیْمَانِ اَنْ یَّکُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ یَّکْرَهَ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ کَمَا یَکْرَهَ اَنْ یُّقْذَفَ فِی النَّارِ.

''تین باتیں جس شخص میں ہوں گی اس کو ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ کسی دوسرے انسان سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت ہو۔ تیسرے یہ کہ کفر میں جانا اس کے لئے اتنا ہی ناگوار ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔''

صحابہ کرام کی کیفیت یہی تھی۔ ان کو اپنے زمانۂ سابق (جاہلیت) سے بڑھ کر کوئی

توہین نہ تھی۔ وہ جب اپنے اسلام لانے سے پہلے کے زمانہ کا تذکرہ کرتے تو نہایت شرمندگی اور نفرت کے ساتھ اس زمانے کی تمام باتوں اعمال و اخلاق اور کفر و فسق اور اللہ کی نافرمانی سے ان کو نہ صرف شرعی اور عقلی بلکہ طبعی کراہت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی یہ صفت اس طرح بیان کرتا ہے:

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ

(حجرات ۴۹:۷)

''لیکن اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کے محبت ڈال دی، اور اس کو کھبا دیا تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈال دی تمھارے دل میں کفر اور گناہ نافرمانی کی۔''

جاہلیت کی ایک علامت یہ ہے کہ جب اللہ و رسول کا حکم سنایا جائے تو قدیم رسم و رواج اور باپ دادا کے طور طریق کا نام لیا جائے اور اللہ و رسول کے مقابلے میں گذشتہ زمانہ اور پرانے دستور کی سند پیش کی جائے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَ نَا ؕ اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ ○ (البقرہ ۲: ۱۷۰)

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی راستہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے دادوں کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ۔''

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ

مُّهْتَدُوْنَ ○ (زخرف ۴۳: ۲۲)

''بلکہ کہتے ہیں ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انھیں کے نقشِ قدم پر ٹھیک چل رہے ہیں۔''

اللہ کے حکم اور وحی کے مقابلے میں اپنے باپ دادا کے عمل اور اپنی خواہش اور مرضی کی پیروی کرنا خاص جاہلی دین ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود ۱۱: ۸۷)

''انہوں نے کہا اے شعیب! کیا تمہاری نماز نے تم کو یہ سکھایا ہے کہ ہم چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا ہم چھوڑ دیں جو ہم اپنے مالوں میں اپنی من مانی باتیں کرتے ہیں۔''

پس ایسے تمام لوگ جاہلیت سے نکل کر اسلام میں پورے طور پر داخل نہیں ہوئے۔ جو اللہ کے مقابلے میں ہر چیز سے دستبردار نہیں ہوئے، اور جنہوں نے اپنے تئیں مکمل طور پر اللہ کے حوالے نہیں کیا۔ یہ مکمل دستبرداری اور تسلیمِ کامل وہ اسلام ہے جس کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا اور انہوں نے اس کو قبول کیا:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

(بقرہ ۲: ۱۳۱)

''جب (ابراہیمؑ سے) ان کے رب نے کہا کہ اپنے رب کے حوالے ہو جاؤ، اور اس کی مکمل تابعداری کرو انہوں نے کہا میں نے اپنے تئیں سارے جہان کے پروردگار کے حوالے کر دیا''

اور جس کا تمام مسلمانوں کو حکم ہے:

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا.

''تمہارا معبود و حاکم ایک ہی معبود و حاکم ہے پس اسی کے حوالے ہو جاؤ اور مکمل تابعدار بن جاؤ۔

(حج ۲۲: ۳۴)

اگر یہ نہیں ہے تو گویا اللہ سے جنگ ہے اس لئے اس مکمل اسلام کو ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے سِلم کہا ہے یعنی یہ اللہ سے صلح ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ[1]

(بقرہ ۲: ۲۰۸)

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ صلح و اسلام میں پورے پورے، اور شیطان کے قدموں پر مت چلو، بیشک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔''

یہ بات یاد رہے کہ جاہلیت سے مراد صرف بعثتِ نبوی کے قبل کی عرب کی زندگی ہی نہیں ہے بلکہ ہر وہ غیر اسلامی زندگی اور نظام ہے جس کا ماخذ وحی و نبوت اور کتابِ الٰہی و سنت انبیاء نہ ہو اور جو اسلام کے مسائل و احکامِ زندگی سے مطابقت نہ رکھتا ہو خواہ وہ عرب کی جاہلیت ہو یا ایران کی مزدکیت یا ہندوستان کی برہمنیت یا مصر کی فرعونیت، یا ترکوں کی طورانیت، یا موجودہ مغربی تمدن یا مسلمان قوم کی غیر شرعی زندگی اور ان کے

---

[1] مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا ہے کہ بعض مسلمانوں کو ایسی چیزوں کے کھانے پینے میں تأمل ہوا جو ان کے قدیم مذہب میں ان کے لئے جائز نہیں تھیں، اور جن کے استعمال کے وہ عادی نہ تھے، یہ آیت اگرچہ عام اصول تفسیر کے مطابق کچھ اسی واقعہ سے مخصوص نہیں اور نہایت پُر معانی اور جامع آیت ہے جو تمام احکامِ اسلام پر مشتمل ہے لیکن اس سے اس پہلو کی بھی وضاحت ہوتی ہے جس کو ہم نے اوپر بیان کیا۔

مخالف شریعت رسوم و عادات، اخلاق و آداب اور میلانات و جذبات خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، ماضی ہوں یا حال۔

کفر ایک سلبی (منفی) چیز نہیں ہے بلکہ ایک ایجابی اور مثبت چیز بھی ہے۔ وہ صرف دین اللہ کے انکار کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مذہبی و اخلاقی نظام اور مستقل دین ہے جس میں اپنے فرائض و واجبات بھی ہیں اور مکروہات و محرمات بھی، اس لئے یہ دونوں دین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ایک انسان ایک وقت میں ان دونوں مذاہب کا وفادار اور ماننے والا نہیں ہو سکتا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کفر کی پوری بیخ کنی کرتے ہیں اور کفر کے ساتھ کسی برادری اور مصالحت کے روادار نہیں ہوتے۔ کفر کے پہچان لینے کا بھی ان کو بڑا ملکہ ہوتا ہے اور اس بارے میں ان کی نگاہ بڑی دور رس اور باریک بین ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کو اس بارے میں پوری حکمت اور عزیمت عطا فرماتا ہے۔ ان کی خداداد فراست اور بصیرت پر اعتماد کئے بغیر چارہ نہیں۔

دین کی حفاظت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کفر و اسلام کی جو سرحدیں انھوں نے قائم کر دی ہیں اور ان کے جو نشانات مقرر کر دیئے ہیں ان کی حفاظت کی جائے۔ اس میں ادنیٰ تساہلی اور رواداری دین کو اتنا مسخ کر کے رکھ دیتی ہے کہ جتنا یہودی، عیسائی اور ہندوستان کے مذہب مسخ ہو گئے۔

انبیاء علیہم السلام کے صحیح جانشین بھی اس بارے میں انہی کی فراست اور عزیمت رکھتے ہیں۔ وہ کفر کا ایک ایک نشان مٹاتے ہیں اور جاہلیت کا ایک ایک داغ دھوتے ہیں۔ کفر کا ادراک کرنے میں ان کی حس عوام سے بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کفر جس لباس اور جس صورت میں ظاہر ہو وہ اس کو پہچان لیتے ہیں اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔

کہیں ہندوستان جیسے ملک میں بیواؤں کے نکاح ثانی کو حرام سمجھنے اور اس سے شدید نفرت رکھنے میں ان کو کفر کی بو محسوس ہوتی ہے اور وہ اس کو رواج دینے اور اس سنت کو زندہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اس پر اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

کہیں قانونِ شریعت پر رواج کو ترجیح دینا اور بہنوں کو میراث نہ دینے پر اصرار کرنا ان کو کفر معلوم ہوتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کی مخالفت اور ان کا مقاطعہ فرض سمجھتے ہیں۔ کبھی اللہ و رسول کا صاف صاف وصریح حکم سن لینے کے بعد اس کو نہ ماننا اور غیر الٰہی عدالت اور غیر الٰہی قانون کے دامن میں پناہ لینا اور غیر اسلامی احکام و قوانین نافذ کرنا ان کو اسلام سے خروج کے مترادف معلوم ہوتا ہے اور وہ مجبوری کی حالت میں وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔

کبھی کسی نو مسلم یا ایسے مسلمانوں کے جو ہندوؤں کی صحبت میں رہتے ہوں اور ان سے متاثر ہوں، گائے کا گوشت کھانے سے احتراز کرنے میں اور اس سے نفرت کرنے میں ان کو ایمان کی کمزوری اور ان کے قدیم مذہب یا غیر مسلموں کی صحبت کا اثر نظر آتا ہے کبھی بعض حالات میں ایک سنت یا فعل جائز و مستحب کو وہ واجب اور شعائرِ اسلامی سمجھنے لگتے ہیں اور ان کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے کہ:

''ذبحِ بقر در ہندوستان از اعظم شعائرِ اسلام است''

کبھی وہ غیر مسلموں کے رسوم و عادات اور ان کی تہذیب اور وضع و لباس اختیار کرنے اور ان سے تشبہ پیدا کرنے کی شدومد سے مخالفت کرتے ہیں اور کبھی ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت کی ممانعت کرتے ہیں۔

غرض کفر یا کفر کی محبت یا اس کی اعانت جس لباس اور جس صورت میں جلوہ گر ہو اور اس کی روح جس قالب میں بھی ظاہر ہو وہ اس کو فوراً بھانپ لیتے ہیں ان کو اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اور اس کی مخالفت کرنے میں کوئی مصلحت ان کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی وہ

کفر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

بہر رنگے خواہی کہ جامہ می پوش
من اندازِ قدت رامی شناسم

ان کے زمانے کے کوتاہ نظر یا رند مشرب و مصلح کل جو دیر و حرم کعبہ و بت خانہ میں فرق کرنا ہی کفر سمجھتے ہیں۔ ان کی تضحیک کرتے ہیں اور تحقیر کے ساتھ ان کو فقیہِ شہر، محتسب، واعظ، اور خدائی فوجدار کا لقب دیتے ہیں۔

لیکن وہ اپنا کام پورے اطمینان و استقلال کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبروں کے دین کی حفاظت ہر زمانے میں انھیں لوگوں نے کی ہے اور آج اسلام یہودیت و عیسائیت و ہندویت سے ممتاز شکل میں جو نظر آتا ہے وہ انھیں کی ہمت و استقامت اور تفقہ کا نتیجہ ہے۔

جَزَاھُمُ اللّٰہُ عَنِ الْاِسْلَامِ وَوَلِیِّہٖ وَ نَبِیِّہٖ خَیْرُ الْجَزَآءِ

بدعت کیا ہے

کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ و رسول نے دین میں شامل نہیں کیا ہے اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا اور اس کا ایک جُزو بنا لینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لئے کرنا، اور اس کی کسی خود ساختہ یا اصطلاحی شکل اور وضع کئے ہوئے شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی حکم کی پابندی کی جاتی ہے بدعت ہے۔

شرک اور کفر (جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے) اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہے، اور شرک و کفر اگر اسلام کے مقابلے میں خارج کی چیزیں ہیں تو بدعت دینِ الٰہی کے اندر شریعتِ انسانی کی تشکیل ہے جو اندر اندر نشو و نما پاتی رہتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات (اگر اس کو آزادی کے ساتھ نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے) اصل

شریعت سے دو چند و سہ چند ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ شریعتِ الٰہی کی ساری جگہ اور انسان کے سارے وقت کو گھیر لیتی ہے۔

اس شریعت کی فقہ الگ ہے، اس کے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات مستقل ہیں۔ اور بعض اوقات تعداد میں شریعتِ الٰہی کے احکام سے کہیں زیادہ۔

بدعت سب سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ تشریع (قانون سازی) اللہ کا حق ہے۔ کسی چیز کو قانونی حیثیت دینا، اس کی پابندی ضروری قرار دینا، یہ منصب صرف شارع (اللہ) کا ہے انسانی قانون سازی اسی منصبِ الٰہی کے خلاف بغاوت ہے اس لئے قانون ساز انسان کو قرآن ''طاغوت'' کہتا ہے۔

يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ.

(النساء۴: ۶۰)

لیکن کسی چیز کو دین وشرع قرار دینا، اور اس کو کسی خاص شکل اور شرائط کے ساتھ قربتِ خداوندی اور اجر وثواب کا ذریعہ قرار دینا تو اس سے بھی بڑھ کر بات ہے۔

یہ تو شریعت سازی ہوئی اور قرآن کہتا ہے کہ دین وشرع قرار دینا اللہ ہی کا کام ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَّالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ.

(شوریٰ ۴۲: ۱۳)

''تمہارے لئے دین کی وہی راہ مقرر کی جس کا حضرت نوح کو حکم دیا تھا اور ہم نے آپ کی طرف حکم بھیجا۔''

اہلِ عرب نے جب اپنی طرف سے تحلیل وتحریم کا کام شروع کیا اور مستقل احکام جاری کئے تو قرآن نے یہی جرح کی:

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ.

(شوریٰ ۴۲: ۲۱)

''کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین بنایا جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا تھا۔''

یہ اللہ کی اجازت کے بغیر قانون سازی کیا تھی؟ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ○

(انعام ۶: ۱۳۸)

''اور انھوں نے کہا کہ یہ مویشی اور کھیتی ممنوع ہے اس کو صرف وہی کھائیں گے جن کو ہم چاہیں اپنے خیال کے مطابق اور یہ مویشی ہیں جن کی پیٹھ پر چڑھنا منع ہے، اور کچھ مویشی جن کے ذبح پر اللہ کا نام نہیں لیتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے، اللہ ان کے جھوٹ کی ان کو سزا دے گا۔''

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ.

(انعام ۶: ۱۳۹)

''اور انہوں نے کہا ان مویشیوں کے جو کچھ پیٹ میں ہے وہ ہمارے مردوں ہی کے کھانے کے لئے مخصوص ہے اور ہماری

عورتوں کے لئے حرام ہے اور اگر مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ اللہ ان کو ایسی باتیں بتانے کی سزا دے گا وہ حکمت والا اور خبردار ہے۔''

عرب کے ان شریعت سازوں کا یہ جرم جس کو قرآن ''افتراء'' کہتا ہے کیا تھا؟ یہی کہ انھوں نے بلا کسی آسمانی کتاب اور سند کے محض اپنے اتفاقِ رائے اور اصطلاح سے ایک چیز کو ایک کے لئے حلال اور دوسرے کیلئے حرام کر دیا، اور اس کے لئے ایسے قواعد و احکام اور اصول وضوابط مقرر کئے جن کا کوئی آسمانی مآخذ نہ تھا اور پھر ان کی ایسی پابندی کی اور دوسروں سے کرائی جیسی پیغمبروں کی شریعتوں اور احکام الٰہی کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو سخت گنہگار سمجھا جائے اور ملزم وملعون ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی جرم قرآن نے بیان کیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ.

(توبہ ۹:۳۱)

''انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو، اللہ کو چھوڑ کر الٰہ ٹھہرالیا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتمؓ کے سامنے اس آیت کی یہی تفسیر کی عیسائی علماء ومشائخ نے جس چیز کو ان کے لئے حلال یا حرام قرار دے دیا انھوں نے بے چوں وچرا اس کو مان لیا اور ان کو مستقل شارع قرار دے دیا۔

درحقیقت تحلیل وتحریم میں اور کسی چیز کو بلا دلیل شرعی فرض وواجب قرار دے دینے اور کسی خاص شکل اور آداب وشرائط کے ساتھ کارِ ثواب وذریعہ تقرب الی اللہ قرار دینے میں کوئی اصولی فرق نہیں دونوں شرع ''مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ'' کے حکم میں آتے ہیں۔

بدعت جس دوسری حقیقت کو نظرانداز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی

ہے جس کا تعین ہونا تھا اس کا تعین ہو گیا۔ ایک انسان کی نجات کے لئے جتنے اعمال ضروری ہیں اور تقرب الی اللہ کے لئے جتنے وسائل تھے ان سب کی وضاحت کر دی گئی اور دین کی ٹکسال بند کر دی گئی۔ اب جو نیا سکہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًاo

(مائدہ ۵: ۳)

’’آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔‘‘ (بیان القرآن)

امام مالکؒ نے کیا خوب فرمایا:

من ابتدع فی الاسلام بدعةً یراها حسنةً فقد زعم ان محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالة فان اللہ سبحانه یقول.

’’اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ‘‘ فما لم یکن یومئذٍ دیناً فلا یکون الیوم دیناً.‘‘

’’جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کی اور اس کو اچھا سمجھتا ہے وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) پیغام پہنچانے میں خیانت کی۔ اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ پس جو بات عہد رسالت میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔‘‘

شریعت منزل من اللہ کی ایک خصوصیت اس کی سہولت اور اس کا ہر ایک زمانے میں قابل عمل ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر ہے اس کو انسانوں کی فطری کمزوری، ان کے مصالح اور ان کے مختلف و متفاوت حالات کا پورا علم ہے۔ اسی کے ساتھ وہ رؤف و رحیم (بیحد مہربان) اور شفیق بھی ہے۔ اس علم محیط اور شفقت بے پایاں کی بنیاد پر اس نے انسانوں کے لئے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ نہایت آسان شریعت نازل کی، احکام شریعت میں ان کی کمزوریوں، مشکلات اور کوتاہیوں کا پورا لحاظ رکھا اور ان کی قوت و وسعت اور زمان و مکان کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ان کے لئے ایک عالمگیر اور ابدی قانون مقرر فرمایا۔ اس کا ارشاد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (بقرہ ۲: ۲۸۶)

''اللہ کسی کو اس کی گنجائش سے بڑھ کر مجبور نہیں کرتا۔''

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۝

(نساء ۴: ۲۸)

''اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے بار کو ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ

(الحج ۲۲: ۷۸)

''تم پر اللہ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ.

(توبہ ۹: ۱۲۸)

''تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آیا جس پر تمہاری

تکلیف شاق ہے۔ تمہاری اس کو بڑی فکر ہے، ایمان والوں پر
نہایت شفیق و مہربان ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شریعت کے متعلق فرمایا:

بعثت بالحنیفة السمحة انّ ھٰذا الدین یُسْرٌ ۝

"مجھے نہایت سیدھے سادے آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا۔
بے شک یہ دین آسان ہے۔"

امت کی مشقت کا آپ کو اتنا خیال تھا کہ فرمایا: "**لو لا ان اشقّ علی امتی لا مرتھم بالسّواکِ عند کلِّ صلوٰةٍ.**" اگر مجھے اپنی امت کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنا فرض قرار دے دیتا۔

لیکن دین کی یہ سہولت اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ضمانت اسی وقت تک ہے جب تک کہ اللہ شارع ہے اور شریعت اسی کی ہے لیکن جب انسان شارع بن جائے اور وہ شریعتِ الٰہی میں مداخلت اور اضافہ شروع کردے تو پھر دین کی یہ سہولت باقی نہیں رہ سکتی، نہ انسان کا علم محیط ہے، نہ وہ مختلف انسانوں کی ضروریات، مصالح اور زبان و مکان کے اختلاف کا لحاظ رکھ سکتا ہے۔ نہ اس کو اپنے بنی نوع پر وہ شفقت ہو سکتی ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کو ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو دین خالص ہونے کی صورت میں ہر ایک کے لئے قابلِ عمل اور بالکل سہل ہوتا ہے وہ ان بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافہ کے بعد اس قدر دشوار، پیچیدہ اور طویل ہو جاتا ہے کہ اس پر پورے طور پر عمل کرنا رفتہ رفتہ ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔

لوگوں کو گریز اور حیلہ جوئیوں کی عادت پڑ جاتی ہے اور بہت سے لوگ ایسے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترک مذہب کی بکثرت نوبت اور الحاد و لامذہبیت کا آغاز عموماً ان لامتناہی بدعات

کے بعد ہوا۔ جن کی پابندی ایک متوسط درجے کے انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہو گئی تھی اور آدمی ان کا پابند رہ کر کسی اور کام کا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں بھی علم و عقل کی بغاوت کلیسا کے اسی مذہبی نظام کے خلاف تھی جس سے اصل مسیحیت کو ذرا نسبت بھی نہ تھی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ الٰہی دین و شریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالمگیر یکسانیت ہے۔ یہ یکسانیت زمانوں کے لحاظ سے بھی ہے اور مکانوں کے لحاظ سے بھی۔ اللہ کی ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ چونکہ ''رب المشرقین والمغربین'' ہے وہ زمان ومکان کی حدود و قیود سے بالاتر ہے اس لئے اس کی شریعت میں کامل یکسانی پائی جاتی ہے اس کی آخری شریعت جس کی تکمیل آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو چکی ہے۔ آفتاب کی طرح سب کے لئے ایک اور زمین و آسمان کی طرح سب کے لئے یکساں ہے۔

اس کی شکل جو قرنِ اول میں تھی وہی شکل چودہویں صدی ہجری میں بھی ہے وہ جیسی اور جتنی مشرق والوں کے لئے ہے ویسی ہی اور اتنی ہی مغرب والوں کے لئے بھی۔ جو قواعد و احکام، عبادت کے جو اشکال، تقرب الی اللہ کی جو متعین شکلیں اہل عرب کے لئے تھیں وہی اہل ہندوستان کے لئے بھی۔

اسی لئے اگر دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان باشندہ کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو فرائض اسلام کے ادا کرنے میں اور مسجد میں عبادت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی نہ اس کے لئے کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبر کی ضرورت ہوگی۔ اس کو دینی حیثیت سے کوئی اجنبیت اور مسافرت محسوس نہیں ہوگی علاوہ مقتدی ہونے کے کہ وہ اگر صاحبِ علم ہے تو ہر جگہ امام بن سکتا ہے اور ہر جگہ فتویٰ دے سکتا ہے۔

لیکن بدعات کا یہ خاصہ نہیں۔ ان میں یکسانی اور وحدت نہیں ہوتی ان میں زمان

و مکان کا پرتو ہوتا ہے وہ ہر جگہ کے مقامی سانچہ اور ملکی وہ شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں اور خاص تاریخی و مقامی اسباب اور ماحول میں بنتی ہیں۔ ان کو تمام عالمِ اسلام میں رواج نہیں دیا جا سکتا، نہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کا علم ہونا ضروری ہے۔ علم ہونے کے بعد ضروری نہیں کہ وہ سب ان کو قبول کر لیں۔

اس لئے ہندوستان کی بدعات مصر کی بدعات سے مختلف ہیں اور ایران و شام کی بدعات میں کوئی اشتراک نہیں۔ ملکوں سے گذر کر بعض اوقات شہر شہر کی بدعات مختلف ہوتی ہیں۔ ایک شہر کے مسلمانوں کو دوسرے شہر کی مخصوص بدعات کا علم نہیں ہوتا یہ بات بڑھتے بڑھتے محلوں اور گھروں تک پہنچ سکتی ہے اور گھر گھر کا دین مختلف ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تمام دوسری شریعتوں اور مذاہب کا عبرتناک انجام تھا۔ یہودیت اور عیسائیت کی مسخ شدہ اور محرف شکل موجود تھی۔ اس لئے آپ نے شریعتِ اسلامی کو اپنی حقیقی شکل اور اصلی مقدار میں رکھنے کی پوری کوشش فرمائی اور اس کے لئے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔

آپ نے اپنے جانشین صحابہ کرام کو بدعات سے بچنے اور سنت کی حفاظت کی بڑی تاکید و تلقین فرمائی۔ آپ کے براہِ راست جانشین صحابہ کرامؓ نے اس وصیت کی پوری تعمیل کی اور بدعات کے بارے میں کسی قسم کی رواداری اور کمزوری روا نہیں رکھی۔

صحابۂ کرام کے بعد ائمۃ وفقہاءِ اسلام نے اعلیٰ درجہ کے فہم دین اور ایسی عزیمت و استقامت کا ثبوت دیا جو انبیاءِ کرام کے جانشینوں کے شایانِ شان ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے زمانے کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی۔ مبتدعین کا علمی و عملی مقاطعہ کیا۔ اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول اور ان کے علمبرداروں کو وقیع اور باوقار بننے سے روکنے کی کوشش کی اور ان کو اہل علم کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے گرا دیا۔

بالخصوص فقہاء حنفیہ نے جو شدید احتساب کیا اور جس باریک بینی اور نکتہ فہمی کے ساتھ اپنے زمانہ کے بعض بظاہر معمولی مبتدعانہ اعمال ورسوم کی مخالفت کی اور شریعت کی حفاظت اور سنت و بدعت کے امتیاز کے لئے جو حکیمانہ انتظامات اور فقہی احتیاطیں کیں وہ ان کی اصولِ دین سے گہری واقفیت اور ان کے تفقہ کی بہترین مثالیں ہیں۔

جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ بدعات خوش عقیدہ و شائقین دین کے لئے کیسی مقناطیسی کشش رکھتی ہیں اور کس سرعت کے ساتھ رواج و مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں۔ وہ ان علماء اسلام کی ہمت دلیری و کامیابی کی داد دیں۔ جن کی کوششوں اور اظہار حق سے بعض بدعات کا بالکل سد باب ہو گیا اور اب ان کا فقہ کی بعض کتابوں یا تمدن کی بعض تاریخوں میں ذکر آتا ہے۔ بعض بدعات جو باقی رہ گئیں ان کا بدعت ہونا بھی مشتبہ نہیں رہا اور ایک جماعت ہمیشہ ان کی مخالفت کرتی رہی ہے اور اب بھی کرتی ہے۔

ان مخالفینِ بدعت اور حاملینِ لواء سنت کو اپنے زمانے کے عوام یا خواص کالعوام سے اس طرح جامد اور روایت پرست وغیرہ کے خطابات ملے جس طرح ہر زمانہ کے مذاقِ عام اور رواجِ عام کے خلاف کہنے والوں اور کرنے والوں کو ملا کرتے ہیں۔

مَا يُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِکَ.

اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ علماء ربانی کو دینی تقاضے پورے کرنے کی اور اپنے منصب کو پہچاننے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علم کا مقام اور اہلِ علم کی ذمہ داریاں

یہ تقریر حضرت مولانا رحمت اللہ کو کشمیر یونیورسٹی کے ساتویں کنونشن منعقدہ ۲۹/ اکتوبر میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری پیش کئے جانے کے موقع پر کی گئی!

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین. امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، اقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربک الاکرم، الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم.

جناب چانسلر صاحب (بھی۔ بے نہرو۔ گورنر کشمیر) پرو چانسلر صاحب (شیخ محمد عبد اللہ چیف منسٹر کشمیر) وائس چانسلر صاحب (ڈاکٹر وحید الدین ملک) اساتذۂ جامعہ فضلائے کرام اور معزز حاضرین!

میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے، جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید مشرق و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں جو خدا کی وہ دین ہے، جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں اور نہ ہونی چاہئے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے، وہ ''وحدت'' سچائی ہے

سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے، اور اس کو پانے کی خوشی ہے، اس کے باوجود میں جناب چانسلر صاحب، وائس چانسلر صاحب، اور اس جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے ایک علمی اعزاز کے لئے ایک شخص کا انتخاب کیا جس کا انتساب اور تعلق قدیم طرزِ تعلم سے ہے۔

میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکمت کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی ''وردی'' پہن کر آئے وہی ''عالم'' اور ''دانشور'' ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے نہ لائق سماعت، بدقسمتی سے ادب وشاعری میں بھی یہی حال ہے، جو ادب کی دکان نہ لگائے اور اس پر ادب کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے، اور ادب کی وردی پہن کر ادبی محفل میں نہ آئے وہ ''بے ادب'' ہے، لوگوں نے ان پیدائشی ادیبوں اور شاعروں کا قصور کبھی معاف نہیں کیا، جن کے جسم پر وہ وردی دکھائی نہ دیتی ہو، یا جن کو بدقسمتی سے ان وردیوں میں سے کوئی وردی نہ مل سکی ہو، میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں، جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے، اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے کسی وقت فیضان میں کمی نہیں۔

علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے

حضرات! اس موقر دانش گاہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو فلک بوس ہمالیہ کی ایک سرسبز وحسین وادی میں منعقد ہو رہا ہے، مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آتا ہے، جب عرب کے ایک خشک علاقہ میں ایک پہاڑ پر جو نہ بلند تھا اور نہ سرسبز، (۱) تقریباً چودہ سو سال پہلے پیش آیا تھا

۱؎ اس موقع پر مقرر نے کہا کہ وہ سرزمین خشک اور وہ پہاڑ غیر سرسبز تھا، لیکن حفیظ جالندھری نے خوب کہا ہے

نہ یاں پر گھاس اگتی ہے نہ یاں پر پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمین سے آسماں بھی جھک کر ملتے ہیں

اور جس نے تاریخ انسانی ہی نہیں بلکہ تقدیر انسانی پر ایسا گہرا اور لازوال اثر ڈالا ہے، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، اور جس کا اس "لوح و قلم" سے خاص تعلق ہے، جس پر علم و تہذیب، اور تحقیق و تصنیف کی اساس ہے، اور جس کے بغیر نہ یہ عظیم دانش گاہیں وجود میں آتیں اور نہ یہ وسیع کتب خانے جس سے دنیا کی زینت اور زندگی کی قدر و قیمت ہے، میری مراد پہلی وحی کے واقعہ سے ہے جو ۱۲ فروری ۶۱۱ء کے لگ بھگ نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ کے قریب غار حرا میں نازل ہوئی، اس کے الفاظ یہ تھے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ o

(سورہ علق آیت ۱ تا ۵)

"(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔"

خالق کائنات نے اپنی وحی کی اس پہلی قسط اور باران رحمت کے اس پہلے چھینٹے میں بھی اس حقیقت کے اعلان کو مؤخر و ملتوی نہیں فرمایا کہ علم کی قسمت سے وابستہ ہے غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی امی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا، اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود بھی نہیں سیکھا تھا جو قلم کے فن سے یکسر واقف نہ تھا، کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے؟ اور اس بلندی کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ اس نبی امی پر ایک امت امی اور ایک ناخواندہ ملک کے درمیان (جہاں جامعات اور دانش گاہیں تو بڑی چیزیں ہیں حرف شناسی بھی عام نہیں تھی) پہلی بار

وحی نازل ہوتی ہے، اور آسمان وزمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے تو اس کی ابتدا ہوتی ہے "اقرا" سے جو خود پڑھا ہوا نہیں تھا، اس پر جو وحی نازل ہوتی ہے، اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ "پڑھو" یہ اشارہ تھا اس طرف کہ آپ کو جو امت دی جانے والی ہے وہ امت صرف طالب علم ہی نہ ہوگی بلکہ معلم عالم اور علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور آپ کے حصہ میں آیا ہے، وہ دور "اُمّیت" کا دور نہیں ہوگا، وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دور ترقی کا دور ہوگا۔

علم کی ابتداء اسم رب سے ہونی چاہئے

بِسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا)

بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستے سے ہٹ گیا تھا، اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو یہاں جوڑا گیا، جب علم کو یاد کیا گیا اس کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھی آگاہی دی گئی کہ اس علم کی ابتداء اسم رب سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ علم اسی کا دیا ہوا ہے، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اسی کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انگیز اور صاعقہ آسا آواز تھی جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی، جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا، اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے کہ جو وحی نازل ہونے والی ہے، اس کی ابتدا کس چیز سے ہوگی؟ اس میں کس چیز کو اولیت دی جائے گی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی بھی جو اس امی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا، یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ "اقرا" کے لفظ سے شروع ہوگی۔

یہ ایک انقلاب انگیز دعوت تھی کہ علم کا سفر خدائے حکیم وعلیم کی رہنمائی میں شروع کیا جانا چاہئے اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل پر پیچ اور بہت پرخطر ہے، یہاں دن دہاڑے قافلے لٹتے ہیں قدم قدم پر مہیب وعمیق گھاٹیاں ہیں، گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہئے اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، مجرد علم وادب نہیں، وہ علم مقصود نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے، جو محض کھلونوں سے کھیلنے کا نام ہے وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدہ کی خندق کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے، بلکہ "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ.

پڑھو تمہارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمہاری ضرورتوں سے تمہاری کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہوسکتا ہے "اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" آپ خیال کیجئے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غارِ حرا کی پہلی وحی نے بھی قلم کو فراموش نہیں کیا وہ قلم جو شاید ڈھونڈنے سے بھی مکہ میں کسی گھر میں نہ ملتا اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو شاید معلوم نہیں کسی ورقہ بن نوفل[1] کے یا کسی "کاتب[2]" کے جو دیارِ عجم سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ کر آیا ہو گھر میں ملتا۔

---

[1] عہد بعثت کے ایک عرب فاضل جو توراۃ وانجیل کے بڑے عالم تھے، اور عبرانی زبان سے خوب واقف تھے۔

[2] عرب میں پڑھے لکھے آدمی کو "کاتب" کہتے تھے۔

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لا فانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ'' انسان کو سکھایا جس کا اس کو پہلے سے علم نہ تھا، سائنس کیا ہے؟ ٹیکنالوجی کیا ہے؟ انسان چاند پر جارہا ہے، خلا کو ہم نے طے کرلیا ہے، دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں، یہ سب ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ'' کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے؟

حضرات! اجازت دیجئے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وادئ علم کے ایک مسافر کی حیثیت سے کچھ مشورے کچھ تجربے پیش کروں۔

جامعات کا پہلا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایسا کیرکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبال ایک کف جو کے بدلے میں بیچنے کیلئے تیار نہ ہو، آج کل فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے، کوئی اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جا سکتا تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا؟ ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کرسکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تخریبی فلسفہ کوئی غلط دعوت و تحریک کسی دام خرید نہ سکے، جو اقبال کے الفاظ میں پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ کہہ سکیں ؎

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں حق و صداقت اور علم و ہدایت کیلئے قربان کرنے کے لئے تیار ہوں جن کو کسی کے لئے بھوکا رہنے میں وہ لذت آئے جو کسی کو پیٹ بھر کر کھانے اور ''نائے ونوش'' میں آتی ہے، جن کو کھونے میں وہ مسرت حاصل ہو جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں ہوتی، جو اپنی جوانی

کی بہترین توانائیاں، ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے، انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لئے صرف کریں۔

دانش گاہوں کو دیکھنا چاہئے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہے ہیں؟ میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں بڑی تعداد میں یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہوگئی ہے، سوال یہ ہے کہ علم کے شوق میں جستجو کی راہ میں علم واخلاق کے پھیلانے، اور برائیوں، بداخلاقیوں، سفاکی ودرندگی، دولت وقوت کی پرستش کو روکنے کے لئے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں، اپنی قوم کو صاحبِ شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کے لئے کتنی تعداد میں نوجوان موجود ہیں، جو اپنی ذاتی سر بلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کر کے اس مقصد کے لئے اپنے کو وقف کرتے ہیں، اصل معیار یہ ہے کہ کتنے نوجوان ایسے ہیں جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کر کے کسی گوشے میں ٹھوس علمی وتعمیری کام کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب شاعری، فنون لطیفہ، حکمت وفلسفہ، تصنیف وتالیف سب کا مقصد یہ ہے کہ ملک وملت میں ایک نئی زندگی اور روح پیدا ہو اور وہ سراب کی نمود اور شعلہ کی بھڑک نہ ہو، میں اس وقت ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال کے یہ شعر پڑھوں گا، جو انھوں نے اگرچہ کسی ادیب یا شاعر سے مخاطب ہو کر کہے تھے، لیکن یہ علم وادب، فلسفہ وحکمت سب پر صادق آتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

حضرات!اب آخر میں مجھے اپنے ان قابل مبارکباد بھائیوں سے جو یہاں سے سند لے کے جارہے ہیں، یا ان خوش نصیب عزیزوں سے جو ابھی اس چمن علم کی خوشہ چینی میں مصروف ہیں، کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ میں اپنی بات کہنے میں (جو شاید کسی قدر خشک اور سنجیدہ ہو) ایک دلچسپ کہانی کا سہارا لوں گا، جو شاید آپ کے کانوں کا ذائقہ تبدیل کرنے میں مدد کرے۔

''راوی صادق البیان کہتا ہے کہ ایک بار چند طلباء تفریح کے لئے ایک کشتی پر سوار ہوئے طبیعت موج پر تھی، وقت سہانا تھا، ہوا نشاط انگیز اور کیف آور تھی، اور کام کچھ نہ تھا، یہ نوعمر طلباء خاموش کیسے بیٹھ سکتے تھے، جاہل ملاح دلچسپی کا اچھا ذریعہ، اور فقرہ بازی مذاق وتفریح طبع کے لئے بے حد موزوں تھا، چنانچہ ایک تیز وطرار صاحبزادے نے اس سے مخاطب ہوکر کہا'' چچا میاں آپ نے کون سے علوم پڑھے ہیں؟''

ملاح نے جواب دیا''میاں میں نے کچھ پڑھا لکھا نہیں''

صاحبزادہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا''ارے آپ نے سائنس نہیں پڑھی'' ملاح نے کہا''میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا۔''

دوسرے صاحبزادے بولے''جامیٹری اور الجبرا تو آپ ضرور جانتے ہوں گے۔''؟

ملاح نے کہا''حضور یہ نام میرے لئے بالکل نئے ہیں۔''

اب تیسرے صاحبزادہ نے شوشہ چھوڑا''مگر آپ نے جوگرفی اور ہسٹری تو پڑھی ہی ہوگی''؟

ملاح نے جواب دیا''سرکار یہ شہر کے نام ہیں یا آدمی کے''؟ملاح کے اس جواب پر لڑکے اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے اور انھوں نے قہقہہ لگایا، پھر انہوں نے پوچھا'' چچا میاں

تمہاری عمر کیا ہوگی''؟ ملاح نے بتایا ''یہی کوئی چالیس سال'' لڑکوں نے کہا ''آپ نے اپنی آدھی عمر برباد کی اور کچھ پڑھا لکھا نہیں۔''

ملاح بیچارہ خفیف ہوکر رہ گیا، اور چپ سادھ لی، قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کشتی کچھ ہی دور گئی تھی کہ دریا میں طوفان آ گیا، موجیں منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی تھیں اور کشتی ہچکولے لے رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبی تب ڈوبی دریا کے سفر کا لڑکوں کا پہلا تجربہ تھا، ان کے اوسان خطا ہو گئے، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، اب جاہل ملاح کی باری آئی اس نے بڑی سنجیدگی سے منہ بنا کر پوچھا ''بھیا تم نے کون کون سے علم پڑھے ہیں''؟

لڑکے اس بھولے بھالے جاہل ملاح کا مقصد نہیں سمجھ سکے اور کالج یا مدرسہ میں پڑھے ہوئے علوم کی لمبی فہرست گنانی شروع کر دی، اور جب وہ یہ بھاری بھرکم اور مرغوب کن نام گنا چکے تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا ''ٹھیک ہے، یہ سب تو پڑھا لیکن کیا پیرا کی بھی سیکھی ہے؟ اگر خدانخواستہ کشتی الٹ جائے تو کنارے کیسے پہنچ سکو گے لڑکوں میں کوئی بھی پیرنا نہیں جانتا تھا، انھوں نے بہت افسوس کے ساتھ جواب دیا۔ ''چچا جان! یہی ایک علم ہم سے رہ گیا ہے، ہم اسے نہیں سیکھ سکے۔''

لڑکوں کا جواب سن کر ملاح زور سے ہنسا اور کہا ''میاں میں نے تو آدھی عمر کھوئی مگر تم نے پوری عمر ڈبوئی، اس لئے کہ اس طوفان میں تمہارا پڑھا لکھا کام نہ آئے گا، آج پیرا کی ہی تمہاری جان بچا سکتی ہے، اور وہ تم جانتے ہی نہیں [۱]

آج بھی دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں جو بظاہر دنیا کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں، صورتِ حال یہی ہے کہ زندگی کا سفینہ گرداب میں ہے، دریا کی موجیں خونخوار نہنگوں کی طرح منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی ہیں، ساحل دور ہے اور خطرہ قریب،

---

[۱] ماخوذ از ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین'' از مصنف

لیکن کشتی کے معزز و لائق سواریوں کو سب کچھ آتا ہے، مگر ملاحی کا فن اور پیرا کی کا علم نہیں آتا، دوسرے الفاظ میں انھوں نے سب کچھ سیکھا ہے، لیکن بھلے مانسوں، شریف، خداشناس اور انسانیت دوست انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کا فن نہیں سیکھا اقبال نے اپنے ان اشعار میں اسی نازک صورتِ حال اور اس عجیب وغریب ''تضاد'' کی تصویر کھینچی ہے، جس میں اس بیسویں صدی کا مہذب اور تعلیم یافتہ فرد بلکہ معاشرہ کا معاشرہ شکار ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

شریفانہ انسانی زندگی گذارنے کا بنیادی فن خداترسی، انسان دوستی، ضبطِ نفس کی ہمت وصلاحیت، ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی عادت، انسانیت کا احترام انسانی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کا جذبہ، حقوق کے مطالبہ پر ادائے فرض کو ترجیح مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت وحفاظت اور ظالموں و طاقتوروں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ، ان انسانوں سے جو دولت وجاہت کے سوا کوئی جوہر نہیں رکھتے، عدم مرعوبیت و بے خوفی، ہر موقع پر اور خود اپنی قوم اپنی جماعت کے مقابلے میں کلمۂ حق کہنے کی جرأت، اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور ترازو کی تول، کسی دانا و بینا، طاقت کی نگرانی کا یقین اور اس کے سامنے جوابدہی اور حساب کا کھٹکا، یہی صحیح خوشگوار و بے خطر اور کامیاب زندگی گذارنے کی بنیادی شرطیں، اور ایک اچھے وخوش اسلوب معاشرہ، اور ایک طاقتور و

محفوظ و باعزت ملک کی حقیقی ضرورتیں اور اس کے تحفظ کی ضمانتیں ہیں، اس کی تعلیم اور اس کے لئے مناسب ماحول مہیا کرنا دانشگاہوں کا اولین فرض، اور اس کا حصول تعلیم یافتہ نسل اور ملک کے دانشوروں کی پہلی ذمہ داری ہے، اور ہم کو اس جیسے تمام مواقع پر دیکھنا چاہئے کہ اس کام کی تکمیل میں ہماری دانش گاہیں کتنی کامیاب اور ان کے سند یافتہ افراد و فضلاء کتنے قابلِ مبارکباد ہیں، اور آئندہ ان مقاصد کے حصول اور تکمیل کے لئے ہم کیا عزائم رکھتے ہیں اور ہم نے کیا انتظامات سوچے ہیں۔

آخر میں پھر آپ کی عزت افزائی، اعتماد اور جذبۂ محبت و احترام کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے اپنے اس اقدام کی شکل میں اظہار فرمایا ہے۔

وما علینا الا البلاغ المبین

علومِ دینیہ کے طلبہ وفضلاء کی کامیابی کی تین لازوال شرطیں

یہ تقریر ۱۲رجولائی ۱۹۷۸ء کو جامعہ دارالعلوم کراچی میں علماء، اساتذہ دار العلوم اور طلبہ کے سامنے کی گئی، حضرت مولانا موصوف کا تعارف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع (۱) صاحبؒ (بانی دارالعلوم کراچی) کے فرزند گرامی مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (۲) زید مجدہ رکن اسلامی نظریاتی کونسل نے کرایا۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور پاکستان کے علمائے کبار کی یاد

حضرات اساتذہ دارالعلوم اور عزیز طلبہ!

میں اس دور کے جن علماء کے رسوخ فی العلم اور تبحر کا معتقد وقائل ہوں ان میں اس دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا خاص مقام ہے۔ علمی تبحر فقہ و فتاوی پر وسیع اور گہری نظر، قوتِ تدریس یہ سب چیزیں بھی قابلِ قدر اور قابلِ احترام اوصاف و کمالات ہیں، لیکن ایک دوسری چیز ہے جس کی بنا پر کسی فقیہ و مفتی کو "فقیہ النفس" کہتے ہیں، یہ امتیاز علمائے زمانہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کو حاصل تھا، اور میرے اساتذہ کی عمر اور صف کے بزرگ تھے، یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے براہ راست ان سے درسی طور پر استفادہ کا موقع نہیں ملا۔ جب میں دیوبند پہنچا تو حضرت مفتی صاحب وہاں درس دیتے تھے، لیکن میں چونکہ صرف دورہ کے اسباق میں شریک ہوتا تھا اس لئے مجھے

---

(۱) سابق مفتی اعظم پاکستان

(۲) حال نائب صدر و شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی پاکستان

ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے بائیس برس کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھا ہے ۱۹۵۶ء میں ایک بیرونی سفر سے آتے ہوئے دو تین دن کے لئے کراچی ٹھہرا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج اس نے ان کی اس بہترین یادگار دارالعلوم میں پہنچایا۔

اس وقت پاکستان کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ صاحب، مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ جیسے **راسخ فی العلم والدین** علماء کی ضرورت تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حالات ومسائل ایسے ہیں کہ اس وقت اس ملک اور اس عہد کو حجۃ الاسلام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ کی ضرورت تھی، لیکن اگر اس پایہ کے علماء اور دینی رہنما نہ ہوتے تو کم سے کم ان حضرات کے پایہ کے علماء تو ہوتے جن کا میں نے ذکر کیا، مگر افسوس کہ اس وقت وہ بھی ہم میں موجود نہیں ہیں۔

انقلابِ زمانہ کا شکوہ

عزیز طلبہ! چونکہ میں اس وقت دارالعلوم میں خطاب کر رہا ہوں اس لئے جو کچھ کہوں گا وہ علم کے متعلق کہوں گا اور طلبہ واساتذہ کے مستقبل، ان کے فرائض، ذمہ داریوں، وقت کی نزاکت اور زمانہ کے فتنوں کے متعلق عرض کروں گا۔

آپ کے کان میں بار بار یہ بات پڑی ہوگی کہ زمانہ بدل گیا ہے، دنیا بدل گئی ہے، زمین آسمان بدل گئے ہیں، سوچنے کے طور طریقے بدل گئے ہیں، اس زمانہ میں علومِ دینیہ کی تحصیل میں عمر صرف کرنا، ان میں کمال پیدا کرنا، ان کے دقائق اور جزئیات میں جانا، ایک بے وقت کی شہنائی اور ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' نہیں تو کیا ہے؟

صرف یہی زمانہ نہیں بلکہ ہر زمانہ میں زمانہ کی تبدیلی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ آپ کسی زمانہ کے ادب وشاعری یا تاریخ کا مطالعہ کریں، آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ یہی رونا رویا گیا ہے کہ زمانہ بڑا خراب ہے، علم کی قدر نہیں، اہلِ کمال کی قدر نہیں، بے کمالی اور بے کمالوں کا دور دورہ ہے۔ عربی شاعری اور ادب کو دیکھیں تو ابوالعلاء معرّی کو کہتے ہوئے

سنیں گے:

تطاولت الارضُ السمآء مفاهة
وفاخرت الشهب الحصاو الجنادل
وقال السُّها للشمس انتِ ضئيلةٌ
وقال الدُّجى للصبح لونک حائل
اذا نسب الطّائتی بالبخل مادرٌ
وحَيَّرَ قُسًّا بالفهامة باقل

آخر میں کہتا ہے:

فیا موتُ زُرُ اِنَّ الحیاۃَ ذمیمةٌ
ویانفس جدی ان دھرک ھازل

یعنی اے موت تیرا آ جانا ہی اچھا ہے، اس لئے کہ زندگی کا کوئی مزا نہیں رہا اور اے نفس تو ہی سنجیدگی اور وقار کے راستہ پر چل، تیرا زمانہ تو دل لگی اور مذاق کر رہا ہے۔

دوسری طرف حافظ شیرازی اس طرح شکوہ سنج ہیں ؎

ایں چہ شوریست کہ درد ورِ قمری بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شری بنیم

آگے زمانہ اور اہل زمانہ کی سفلہ پروری و ناقدری کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ درگردنِ خوی بنیم

اردو کی طرف آیئے گا تو آپ کو آبِ حیات اور دوسرے تذکروں میں شہرِ آشوب ملیں گے، جن میں شعراء نے اپنے زمانہ اور اپنے ملک کی خستہ حالت اور انقلابِ روزگار پر آنسو بہائے ہیں۔ اس سلسلہ میں استاد ذوق کا ایک ہی شعر کافی ہے ؎

پھرتے ہیں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

یہ چند اشعار ہیں جو مجھے اس وقت برجستہ یاد آئے ورنہ ایسے اشعار اور زمانہ کے شکوہ شکایت سے دیوان کے دیوان بھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ جو کتاب دیکھئے گا زمانہ کا ماتم ہوگا اور شکوہ کا دفتر، اپنی جنسِ کمال کس کے سامنے پیش کی جائے جوہری کہاں ہیں، اہل نظر کہاں ہیں؟ یہ بے کمالی اور بے ہنری کا دور ہے، کس کے لیے انسان محنت کرے، کس کے لئے اپنا پتا پانی کرے، کس کے لئے اپنا خونِ جگر بہائے؟ اگر آپ ان باتوں پر اعتبار کرلیں گے تو آپ کا نہ مدرسہ میں جی لگے گا نہ پڑھنے میں، نہ محنت کرنے میں۔

سننِ الٰہیہ ناقابل تبدیل ہیں

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زمانہ کا انقلاب ایک حقیقت ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، سو برس پہلے کا زمانہ دیکھئے کیا خیر و برکت کا زمانہ تھا، خواص تو خواص اس وقت کے عوام بھی اس زمانہ کے خواص سے بہتر تھے، کیا قوتِ ایمانی تھی، کیا دینی حمیت و غیرت تھی، دین کا علم، قرآن کا حفظ، مرد تو مرد عورتوں میں کتنا عام تھا۔ اس وقت غفلت و مادیت کا دور دورہ ہے، دین وعلمِ دین کے محرکات و دواعی بہت کمزور پڑ گئے ہیں لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان تمام انقلابات کے باوجود جو پہلے ہو چکے اور ان تمام انقلابات کے باوجود جو اب ہو رہے ہیں اور ہوں گے، اور جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ، اللہ تعالیٰ کی سنن ناقابل تبدیل ہیں، اور ان پر ان انقلابات کا کوئی اثر نہیں، جہاں اس حقیقت کا قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے، وہاں اس قرآن مجید کے عام اسلوب کے خلاف زور دینے کے لئے دوہرایا گیا ہے اور مکرر فرمایا گیا ہے "ولن تجد لسنة الله تبديلا، ولن تجد لسنة الله تحويلا" اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور علم کامل کی بنا پر اس کائنات اور فطرتِ انسانی کے متعلق جو آئین و قوانین بنا دیئے ہیں اور جو اصول طے

کر دیئے ہیں ان میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اب یہ قرآن مجید کے استقراء اور حدیث وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ قوانین کیا ہیں؟ ان قوانین کی فہرست بہت طویل ہے اور مجھ جیسے طالب علم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ پوری فہرست مرتب کر سکے، نہ وقت میں اس کی گنجائش ہے، لیکن میں اپنے علمِ ناقص کی بنا پر ان سننِ کونیہ میں سے تین سنتوں کا ذکر کروں گا جن کا ہماری زندگی اور ہمارے مدارس و مقاصد سے خاص تعلق ہے۔

نافعیت کا احترام واعتراف

ان میں سے ایک سنت اللہ لوگوں کا نافعیت وافادیت کے سامنے جھکنا، اس کی قدر کرنا اور اس کو تسلیم کرنا ہے، نافعیت اور اس کے محل ومرکز کے ساتھ محبت کا ہونا، نافع کو تلاش کرنا، اس کی طرف رجوع کرنا اور وہ مل جائے تو اس کی قدر کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے، نافعیت کی بقا اور اس کی زندگی اور سرسبزی کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت لی ہے، اور جو اس سے خالی ہے اس کے لئے یہ ضمانت نہیں، سورۂ رعد میں صاف فرمایا گیا:

فاما الزبد فیذهب جفآء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذالک یضرب اللہ الامثال.

''سوجھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے اسی طرح خدا (صحیح اور غلط کی) مثالیں بیان فرماتا ہے۔ (تاکہ تم سمجھو)''

''بقائے اصلح'' نہیں بلکہ قرآنی زبان واصلاح میں ''بقائے نفع'' کا یہ قانون ہزاروں لاکھوں برس سے چل رہا ہے اور ہزار تبدیلیوں کے باوجود چلتا رہے گا، نافعیت کے لئے پنپنا، پھلنا پھولنا اور اپنی قیمت اور اہمیت تسلیم کرا لینا مقدر ہو چکا ہے، نافع بن جانا ہزار

مخالفتوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے، اس کے لئے پروپگینڈہ اور پبلسٹی کی ضرورت نہیں، نافع کے اندر محبوبیت کی صفت ہے اس میں رنگ و مذہب اور قوم و وطن کی بھی تفریق نہیں ''نافع'' اگر پہاڑ کی چوٹی پر بھی جا کر بیٹھ جائے گا تو دنیا اس کو تلاش کرنے کے لئے وہاں پہنچے گی، اور اس کو ہاتھوں ہاتھ سر پر بٹھا کر بلکہ آنکھوں میں جگہ دے کر لائے گی، یہ اللہ کی سنت ہے جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلی آرہی ہے۔

نافع کی تلاش وطلب

میرے عزیز طلبہ! آپ اپنے اندر نافعیت پیدا کرنے کی کوشش کیجئے، آپ سے زندگی کی شبِ تاریک میں راہ روؤں کو روشنی ملتی ہو، آپ کی مدد سے علمی عقدے حل ہوتے ہوں، آپ کی صحبت میں بیٹھ کر ایمان میں طاقت پیدا ہوتی ہو، آپ کے پاس جا کر آدمی کچھ لے آتا ہو، اس کے بعد اگر آپ اپنے اور لوگوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیجئے، اپنے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیے، لوگوں کو اگر یہ معلوم ہوگا کہ یہاں ایک ''نافع'' رہتا ہے، اس سے فلاں قسم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے (روح کا فائدہ اور ایمان کا فائدہ تو بہت بڑی چیز ہے) تو لوگ دیواریں پھاند کر اور دروازہ توڑ کر آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

اس موقع پر مجھے حضرت محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کی ایک حکایت یاد آئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑے بڑے حقائق کو آسان و عام فہم تمثیلوں میں بیان کرنے کی بڑی حکمت عطا فرمائی تھی۔ ان سے ایک مرتبہ نواب صاحب کوروائی نے شکایت کی کہ حضرت میں نے بڑے شوق سے ایک مسجد بنوائی، اس پر بڑا روپیہ خرچ کیا، لیکن وہاں کوئی نماز پڑھنے نہیں آتا، حضرت کے سمجھانے کا عجیب طریقہ تھا، بعض مرتبہ وہ امتحان بن جاتا، فرمانے لگے کہ نواب صاحب! اس کا دروازہ چن دیجئے اور بالکل تیغہ کر دیجئے۔ نواب صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت الٹا علاج بتا رہے ہیں، کہنے لگے کہ حضرت

میں نے تو مسجد اس لئے بنوائی ہے کہ لوگ آئیں اور نماز پڑھیں اور وہ آباد ہو، آپ فرماتے ہیں کہ اس کا دروازہ چن دیا جائے، حضرت نے فرمایا کہ ابھی میری بات تو پوری نہیں ہوئی، دروازہ چن دیجئے اور اندر ایک آدمی کو بٹھا دیجئے جس کے ہاتھ میں پچاس پچاس کے نوٹ ہوں یا دس دس پانچ پانچ ہی کے نوٹ ہوں اور باہر اعلان کرا دیجئے کہ اس مسجد میں نوٹ تقسیم ہو رہے ہیں، آپ نے مسجد تو بنا ڈالی لیکن نماز کا جو ثواب اور فائدہ ہے وہ لوگوں کو معلوم نہیں، اب مسجد میں کیسے آئیں؟ ان کو نوٹ کا فائدہ معلوم ہے، ان کو معلوم ہے کہ پانچ روپیہ کے نوٹ سے کیا کیا چیزیں خریدی جاسکتی ہیں، اور اس سے کیا کیا کام نکالے جاسکتے ہیں، ان کو یہ معلوم نہیں کہ نماز سے کیا کیا چیزیں خریدی جاسکتی ہیں، اور اس سے کیا کیا فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں، اب آپ ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ گرمی یا سردی میں تکلیف اٹھا کر، اپنا حرج کرکے اور دور سے چل کر کے آئیں گے، آدمی بٹھانے کے بعد کچھ ڈھنڈورا پٹوانے کی بھی ضرورت نہیں، ذرا سی دیر میں یہ بات پھیل جائے گی کہ نواب صاحب نے خدا جانے کس بنا پر یہ کام کیا ہے کہ مسجد کے دروازے تو چن دیئے ہیں اور اندر ایک آدمی ہزار روپے کے نوٹ لئے بیٹھا ہے اور تقسیم کر رہا ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دروازہ توڑ کر مسجد میں داخل ہو جائیں گے اور کوئی ہزار کہے گا تب بھی وہ رکیں گے نہیں، تو نافعیت ہی اصل چیز ہے، جس پر لوگ پروانہ وار ہجوم کرتے ہیں۔ پروانوں کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ شمع جل رہی ہے، کون یہ اعلان کرتا ہے کہ پروانو! شمع پر ہجوم کرو، ان پروانوں اور شمع کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ جہاں پانی کا چشمہ ہوتا ہے وہاں مور و ملخ، انسان و چوپائے جمع ہو جاتے ہیں، انقلاب کا شکوہ بے خبری، بے بصری اور کم ہمتی کی دلیل ہے۔

نافعیت کی قوتِ تسخیر

آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں، ہمارے شہر لکھنؤ میں ایک چوٹی کے مسلمان ڈاکٹر عبد

الحمید صاحب مرحوم جن کی حذاقت، وسیع تجربہ اور استادی کا ہندو مسلمان سبھی ڈاکٹر لوہا مانتے تھے، انھوں نے مجھے لطیفہ سنایا کہ بارہ بنکی کے ایک غیر مسلم سرمایہ دار اور کاروباری شخص نے تقسیم کے بعد ایک دن ان سے طنزاً کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ پاکستان نہیں گئے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں میں نے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ تاجر کسی سخت مرض میں مبتلا ہوا۔ ہر طرح کے علاج اس نے کئے، بڑے بڑے ڈاکٹروں کو بلایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہار کر اس نے ڈاکٹر صاحب کو تکلیف دی۔ ڈاکٹر صاحب جب اس کو دیکھنے گئے اور علاج شروع کیا تو کہا کہ دیکھئے۔ اگر میں پاکستان چلا جاتا تو آپ مجھے کہاں بلاتے اور میں آپ کی خدمت کیسے کر سکتا۔ اللہ کا کرنا کہ انھیں کے علاج سے اس کو فائدہ ہوا اور اس کو شرمندہ ہونا پڑا۔

میرے عزیزو! میں آپ کی ہزار مشکلات کا حل یہ سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے زمانہ سے اپنا نافع اور مفید ہونا تسلیم کرا لیجئے آپ اس سے یہ اقرار کرا لیجئے کہ آپ کے پاس جو علم ہے وہ دنیا کے پاس نہیں ہے، دنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ جو سودا جس دوکان پر ملتا ہے آدمی اس کی خریداری کے لئے وہیں جاتا ہے، ایک صاحبِ کمال بھی اس دوسرے صاحبِ کمال کی طرف رجوع کرتا ہے جس کے پاس اپنے دل کا مدعا اور اپنے مرض کی دوا پاتا ہے، امام احمد بن حنبلؒ حدیث وفقہ میں اپنے زمانہ کے امام اور بغداد میں مرجع خلائق تھے لیکن اپنے قلب کو غذا اور روح کو تقویت پہنچانے کے لئے اپنے شہر کے ایک ایسے صاحبِ دل بزرگ کے حلقۂ صحبت میں تشریف لے جاتے تھے جن کو علم میں ان سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ایک مرتبہ ان کے ایک صاحبزادے نے ان سے کہا، ابا جان! آپ کے وہاں جانے سے ہم لوگوں کا سر نیچا ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، فرمایا کہ بیٹے! انسان جہاں اپنا فائدہ دیکھتا ہے وہاں جاتا ہے، مجھے وہاں اپنے دل کا فائدہ نظر آتا ہے۔

یہ درسِ نظامی جو آج ساری دنیا میں سکہ کی طرح چل رہا ہے، ملا نظام الدینؒ فرنگی محلی

کا مرتب کیا ہوا ہے جو استاذ الہند اور استاذ العلماء تھے۔ وہ باایں علم وفضل اودھ کے ایک قصبہ بانسہ کے ایک بزرگ حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قادریؒ کے مرید تھے جو اودھ کی پوربی زبان بولتے تھے اور انھوں نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ ملا صاحب نے حضرت کے ملفوظات بھی لکھے ہیں اور بڑی محبت وعقیدت سے ان کا نام لیتے ہیں، اس لئے کہ ان کو اپنے سارے علم وفضل کے باوجود اپنے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا جو وہاں جا کر پر ہوتا تھا، وہ سب کے استاد تھے لیکن ان کو ایسے آدمی کی تلاش تھی جہاں جا کر یہ معلوم ہو کہ میں کچھ نہیں ہوں اور ابھی سیکھنے اور پڑھنے کی ضرورت ہے حضرت مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ جن میں سے اول الذکر کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ شیخ الاسلام اور ثانی الذکر کو حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے دست گرفتہ اور ان کے دامن سے وابستہ تھے، جن کی تعلیم کی تکمیل بھی نہیں ہوئی تھی۔ دیوبند کے بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ جب سید صاحب یہاں تشریف لائے تو دونوں بزرگوں کا حال یہ تھا کہ سید صاحب آرام فرماتے ہوتے تھے اور دونوں حضرات چارپائی کے دائیں بائیں بیٹھے ہوتے، سید صاحب بیدار ہوتے اور کچھ فرماتے تو یہ حضرات دیر تک اس کا مذاکرہ کرتے اور لطف لیتے۔

استغناء و بے غرضی کی طاقت وتاثیر

دوسری صفت استغناء اور بے غرضی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جو مانگے لوگ اس سے گھبرائیں اور جو دامن پھیلائے اس سے بھاگیں اور جو اپنی مٹھی بند کرلے اور دامن سمیٹ لے اس کے قدموں میں پڑیں اور خوشامد کریں کہ وہ کچھ قبول کرلے، استغناء میں ازل سے محبوبیت ومقبولیت ہے اور طلب میں ذلت، گویا مستغنی سے احتیاج کا معاملہ ہے، اور طالب سے استغناء کا یہ بھی ایک ایسی سنتِ خداوندی ہے جس میں زمانہ کی تبدیلی کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں، چوتھی صدی کے حالات آپ پڑھیں تو یہی نظر

آئے گا، آٹھویں صدی کے پڑھیں گے تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے اور چودھویں صدی میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ میں اس کے زیادہ واقعات نہیں بیان کرتا اور تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا کہ بزرگانِ دین کے تذکرے اور تصوف کی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے اور آپ کو خود بھی اس کے تجربے ہوئے ہوں گے، نہیں تو اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے ان کے اساتذہ و بزرگوں کے واقعات سنے ہوں گے۔

کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی

تیسری اور آخری خصوصیت کمال، امتیاز اور کسی چیز میں مہارتِ تامہ ہے، علوم عالیہ تو بڑی چیز ہیں، علومِ آلیہ میں بھی اگر کسی فن میں کمال پیدا ہو جائے اور اس سے بھی نیچے اتر کر اگر کسی کو خطاطی، دراتی میں کمال حاصل ہو تو اچھے اچھے اہلِ علم پیچھے پیچھے پھرتے ہیں، بڑے بڑے مصنفین بڑے بڑے ناشر کاتبوں کی ناز برداری کرتے ہیں، ان کے نخرے سہتے ہیں، ان کی خوشامد کرتے ہیں کہ وہ وقت پر لکھ دیں کم سے کم کتاب کا نام ہی لکھ دیں جس کا بلاک بنایا جا سکے۔

آپ اگر کسی صاحبِ کمال کو یا علم کے کسی ماہر خصوصی کو دیکھتے ہیں یا اس کے متعلق سنتے ہیں کہ وہ عسرت و بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں تو آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اس صاحبِ کمال کے ساتھ کوئی ایسی کمزوری یا مزاجی خرابی لگی ہوئی ہے جس نے اس کے سارے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے، مثلاً غصہ بہت ہے، مزاج میں تلون ہے، کاہلی ہے، محنت نہیں ہوتی، پڑھانے میں جی نہیں لگتا، بے ضابطگی کی عادت پڑ گئی ہے، کسی کی کوئی بات برداشت نہیں ہوتی، اس سے آگے بڑھ کر کچھ مراق ہے، سنک ہے، کسی جگہ ٹھہر نہیں پاتے، فوراً ان بن ہو جاتی ہے، ایسی کوئی نہ کوئی بات آپ ضرور پائیں گے جس کی وجہ سے ان کے کمال اور علم سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا اور گوشۂ گمنامی یا کسمپرسی میں دن گزار رہے ہیں۔

یہ وہ تین لازوال شرطیں اور صفتیں ہیں جن کے ساتھ سنت اللہ یہ ہے کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے اور اہل زمانہ کتنے ہی بگڑ جائیں ان کے اندر تسخیر کا مادہ اور محبوبیت کی صفت ہے اور آج ہمارے فضلاءِ مدارس اور طلبہ علوم دینیہ کو انھیں شرطوں کو پورا کرنے اور انھیں صفات سے متصف ہونے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی ومددگار رہے۔

اجازت چاہتا ہوں۔

وما علینا الا البلاغ المبین

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جو علم خدا کے نام کے بغیر ہو وہ انسانیت کی تباہی کا سبب بنے گا

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے مدرسہ ہدایت العلوم صحبتیا باغ کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر یہ تقریر فرمائی۔

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد وآله وصحبه اجمعین . اعوذ بالله من الشیطن الرجیم . اقراء باسم ربک الذی خلق ○ خلق الانسان من علق ○ اقرأ وربک الاکرم ○الذی علم بالقلم○علم الانسان مالم یعلم○

آپ ﷺ کو پہلا پیغام الٰہی

بزرگو! دوستو اور بھائیو۔ ابھی ہم نے آپ کے سامنے جو آیتیں پڑھی ہیں وہ سورۃ اقراء کی آیتیں ہیں۔ عرصہ سے دستور چلا آرہا ہے کہ جب تسمیہ خوانی بچہ کی ہوتی ہے تو اسی آیت کو پڑھایا جاتا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے اس مدرسہ کی عمارت کے افتتاح میں ایک بچی کو مندرجہ بالا آیت پڑھا کر آرہا ہوں۔ میں آپ کے سامنے اس سلسلہ میں کچھ حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

حضرات! یہ بات بڑے سوچنے اور غور کرنے کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو اللہ

تبارک وتعالیٰ کے اشارے اور الہام سے نبوت کا منصب جب ملنے والا تھا، اس وقت حالات کے تقاضے، مکہ مکرمہ، جزیرۃ العرب اور ساری دنیا کے حالات کو دیکھ کر جو تڑپ آپ کے اندر پیدا ہوئی اور پھر اس سوچ بے چینی اور فکر نے آپ کو غار حراء میں کئی کئی دن عبادت کرنے پر مجبور کر دیا اور جب اللہ تعالیٰ کے فیصلہ اور حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پانچ سو سال بعد پہلی مرتبہ آسمان کا زمین سے وحی کے ذریعہ پہلا تعلق قائم ہو رہا ہے اس وقت اگر تمام دنیا کے ذہین ترین دانش وروں مفکروں، معلموں، فلسفیوں اور جینیس ترین انسانوں سے کہا جاتا ہے کہ آپ غور وفکر کر کے بتایئے کہ پانچ سو سال بعد پہلی مرتبہ وحی آنے والی ہے ایسے موقع پر اس دنیا کو کیا پیغام ملنے والا ہے، اس کو کس بات کی تعلیم دی جانے والی ہے، آپ کے سامنے ساری دنیا کے حالات ہیں، پوری نوع انسانی کی بیماری، اس کی جہالت، ناسمجھی، خالق کائنات سے ناواقفیت کروڑوں معبودوں کی پرستش ہو رہی ہے، تمام لوگوں پر گویا شرک کا شامیانہ سا تنا ہوا ہے، یہ وحی ایسے ملک میں نازل ہو رہی ہے جو ناخواندہ ہے جس پر یہ وحی نازل ہو رہی ہے وہ خود بھی ناخواندہ امی ہے، اس کی پوری قوم ان پڑھ ہے یہودیوں نے بھی ان کو امیین کے لقب سے پکارا ہے اور کہا ہے "لیس علینا فی الامیین سبیل" اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو امی کے لقب سے نوازا ہے جو آپ کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ ایسے موقع پر ذہین ترین انسان بھی یہ پیشن گوئی نہیں کر سکتے تھے کہ پہلی وحی میں اقراء، علم اور قلم کا تذکرہ ہوگا، اس لئے کہ پورے مکہ مکرمہ میں بڑی مشکل سے تلاش بسیار کے بعد بھی شاید دو چار قلم مل سکتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے تو وہ آپ کو اپنے عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ جن کے متعلق اس وقت کہا جاتا تھا کہ وہ لکھتے پڑھتے تھے گویا یہ بڑا کارنامہ تھا کہ وہ پڑھے لکھے تھے۔ ایسے ناخواندہ ماحول میں ایک امی پر وحی کا جو پہلا لفظ

نازل ہوتا ہے وہ اقرا ٔ کا لفظ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو دور آنے والا ہے وہ پڑھنے لکھنے کا دور آنے والا ہے۔ علم اور قلم کا عہد شروع ہونے والا ہے لیکن صرف پڑھنا کافی نہیں کہ بعض اوقات صرف پڑھنے نے زہر کا کام کیا ہے، اس پڑھنے نے فکری غارت گری اور وحشت و بربریت سکھائی ہے، جنگوں کا طریقہ سکھایا ہے، ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو ایٹم بم اور زہریلی گیس کے ذریعہ مارنے اور انسانی آبادی کو تہس نہس کرنے کا طریقہ سکھلایا ہے۔ علم کی تباہی و بربادی کے بہت سے کام لئے گئے، اب بھی سائنس اور ٹیکنالوجی سے انسانوں کو تباہ و برباد کرنے کا کام لیا جارہا ہے۔ اس لئے خالی علم معتبر نہیں۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے۔ اس نے پہلا لفظ اقراء کہا، آپ پڑھیئے۔ اب پڑھنے کی ضرورت ہے، علم کو دنیا میں پھیلنا چاہئے، علم صحیح علم توحید، علم ربانی، علم اخلاق، علم خود شناسی وخدا ترسی، جس علم میں یہ نہ ہوں وہ علم معتبر نہیں۔ آج دنیا میں جو تباہی و بربادی آ رہی ہے، یہ انسان کشی ہی نہیں قوموں کی قومیں اور ملکوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جو ایٹم بم ایجاد ہوئے ہیں جرائم کے لئے جو ایجادات ہو رہی ہیں وہ سب اس علم کا کارنامہ ہے جو خدا کے نام کے بغیر ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اقراء کے ساتھ یہ شرط لگاتا ہے کہ اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھیے گا جب اس علم کا فائدہ ہوگا۔

ہمارا خالق ہم سے کیا چاہتا ہے

میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں انصاف کے ساتھ تاریخ لکھی جائے اور یہ تحقیق کی جائے کہ علم نے کب اپنا راستہ بدلا، وہ کب تعمیر کے بجائے تخریب کا ذریعہ بنا تو ایک مصنف آدمی یہ بتائے گا کہ جب سے علم کا رشتہ خالق اور مالک اور رب کائنات سے ختم ہو گیا جب ہی سے یہ تباہی و بربادی آئی جو علم اللہ تعالیٰ کے نام سے الگ ہو کر چلا وہ قابل اعتبار نہیں رہا، اس علم سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے تو پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ہمارا خالق کون ہے، ہمارا مالک اور پالن ہار کون

ہے۔ بڑے بڑے دانشوروں، معلموں اور فلسفیوں کو جب یہ نہیں معلوم کہ ان کا پیدا کرنے والا کون ہے، نیکی اور بدی میں کیا فرق ہے، ہمارا خالق ہم سے کیا چاہتا ہے، وہ ہمیں کون سا عقیدہ دیتا ہے، وہ ہمیں کس راستہ پر لگانا چاہتا ہے، وہ ہمیں اس کائنات، عام انسانوں اور اس دنیا اور اس کے انجام کے متعلق اور اپنی ذات کے متعلق ہمارا کیا طرز عمل ہونا چاہئے، جب ان بنیادی سوالات کا صحیح علم نہ ہو تو پھر اس زہر میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک منٹ میں سیکڑوں انسانوں کو تباہ و برباد کر سکتا ہے لیکن یہ نہ معلوم ہو کہ ہمارا پیدا کرنے والا کون ہے ہماری صلاحیتیں اور ارادے سب اس کے قبضے میں ہیں، وہ عالم الغیب ہے تو اس علم کا کوئی فائدہ نہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے پڑھیئے اپنے اس رب کے نام سے جس نے انسان کو پیدا کیا خون کے ایک لوتھڑے سے۔ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے خون کے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا وہ انسان کس طرح اپنی حقیقت کو فراموش کر کے غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر خون ریزی اور جبر و تشدد کا بازار گرم کر دیتا ہے آج انسان اپنی حقیقت بھولتا جا رہا ہے۔ آج یورپ و امریکہ اس حقیقت کو بھولتا جا رہا ہے، ہمارا ہندوستان بھی اب اس حقیقت کو بھولتا جا رہا ہے حالانکہ یہاں اس کے جاننے کے ذرائع جتنے پہلے تھے اتنے اب بھی ہیں۔ پھر جب اسلام آیا تو گھر گھر یہ بات پھیل گئی۔

"اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ."

حضرات! آپ دیکھئے کہ اس امت نے تھوڑی سی مدت میں کتنے بڑے بڑے کتب خانے قائم کر دیئے۔ یورپ کے بڑے بڑے بادشاہوں کے پاس درجنوں کی تعداد میں بھی کتابیں نہیں تھیں، لیکن جب سے مسلمانوں میں کتب خانوں کا رواج ہوا تو ہر فن میں انھوں نے ہزاروں اور لاکھوں کتابیں تیار کر کے پوری دنیا میں پھیلا دیں۔ یہ سب قلم اور علم کی بدولت ہوا، پہلی وحی نے یہ بتا دیا کہ اب علم اور قلم کا دور شروع ہونے والا

ہے اور اس امت کا رشتہ قلم کے ساتھ قائم رہے گا، ہزاروں انقلابات آئیں گے لیکن مسلمانوں کا رشتہ قلم سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

ہندوستان ہی کو دیکھ لیجئے، مسلمانوں میں کتنے بڑے بڑے مصنفین اور مفکرین پیدا ہوئے، حضرت مجدد الف ثانی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، پھر اردو ادب وشاعری کی تاریخ میں علامہ اقبالؒ جیسے شاعر و فلسفی ومبصر و مفکر کو دیکھ لیجئے کہ دنیا ان کے کلام پر سر دھن رہی ہے۔

حضرات! آج پوری کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کا مخصوص کلچر ختم ہو جائے، علم سے ان کا رشتہ ٹوٹ جائے، اردو سے ناواقف رہیں، اپنے مخصوص عقیدے اور اسلامی تہذیب سے ان کا واسطہ ختم ہو جائے اس کی پوری تیاری کر لی گئی ہے کہ مسلمان فکری و اعتقادی اور تہذیبی ارتداد میں مبتلا ہو جائیں۔ اس کا پورا منصوبہ تیار ہے، ایسے سنگین حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان جگہ جگہ مکاتب و مدارس قائم کریں، محلوں اور مساجد میں صباحی وشبینہ مکاتب قائم کیے جائیں۔ یہ امت محمدی ہے، علم اور قلم سے اس کا رشتہ جوڑ دیا گیا ہے، بغیر علم کے مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا، قرآن و حدیث علم کے ذریعہ ہمیں جو حقائق بتائے گئے ہیں۔ ان کے جانے بغیر یہ دین نہیں رہ سکتا، بعض مذاہب اور ان کے پیشوا چاہتے ہیں کہ علم پھیلنے نہ پائے کہ علم میں ان کو اپنی موت نظر آتی ہے اس کی مثال میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں اس واقعہ سے دیا کرتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ ایک بار مچھروں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں مقدمہ دائر کیا کہ ہوا کی وجہ سے ہم کو پریشانی ہوتی ہے اور ہم کہیں ٹھہر نہیں پاتے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ ہوا کو حاضر کیا جائے۔ جب ہوا دربار میں حاضر کی گئی تو مچھر اڑ گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ جب تک مدعی نہ ہو اس وقت تک فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ یہی حال علم کا ہے کہ جب تک علم صحیح نہ ہوگا اس وقت تک، یہ

دین باقی نہیں رہے گا۔

ہمارا اور آپ کا بنیادی کام

حضرات! اب ہمارا اور آپ کا بنیادی کام یہ ہے کہ علم دین کو پھیلانے کے لئے یا مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے کے لئے آئندہ نسلوں کے دین اور عقیدے اور تہذیب اور اسلامی تشخص کی حفاظت اور بقاء کیلئے بڑے پیمانے پر دینی مکاتب اور مدارس قائم کریں اپنے بچوں کو کفر و ایمان کا فرق بتائیں، شرک و بت پرستی کی شناعت ان کے دل و دماغ میں بٹھا دیں اور اس بات کی ضمانت حاصل کریں کہ ہمارے بچے آئندہ اسلام پر قائم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو اپنے دین پر قائم و دائم رکھے۔ صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد و علی آله و اصحابه اجمعین.

انسانیت کے زوال کا سبب علم سے اللہ کے نام کا جدا ہونا

حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ''انسٹیٹوٹ آف انگلر ٹکنالوجی جس کی بنیاد حضرت مولانا رحمہ اللہ ہی کے ہاتھوں ۱۹۹۳ء میں رکھی گئی تھی اس کی نئی بلڈنگ میں کمپیوٹر کا افتتاح کرتے ہوئے یہ تقریر فرمائی اس تقریب افتتاح کے موقع پر مہتمم صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع الحسنی صاحب ندوی مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی صاحب صدر شعبہ عربی، کرنل محسن شمسی، ڈاکٹر مسعود صاحب عثمانی، ڈاکٹر نعیم انصاری کے علاوہ دیگر معززین شہر موجود تھے موضوع کی مناسبت سے تقریر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ،وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ، ومن تبعھم باحسان ودعیٰ بدعوتھم الی یوم الدین.

حضرات! میرے لئے یہ خوشگوار اور مسرت بخش انکشاف ہوا کہ میں اس موقع پر آج یہاں حاضر ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس گنہگار کے ہاتھوں سے جس عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنا کے بعد یہ بنیاد اتنی بلند ہوگی اور ایسی وسیع ہوگی جو اس وقت ہمارے اور آپ کے سامنے ہے، اس وقت میں اپنے عزیز رفقاء اور ساتھیوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔

بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں جو روح کام کر رہی ہے وہ حقیقت پسندی، تعمیری

ذہن اور ملّی تقاضوں کو پورا کرنے کا جذبہ ہے،علوم کے پیدا ہونے اور پھیلنے اور ترقی اور پھلنے پھولنے کے باوجود اس وقت ساری دنیا خطرہ سے دوچار ہے اور وہ خطرہ ایسا ہے کہ جس طرح سے تلوار لٹک رہی ہو کسی کے سر پر عالم انسانی پر آج ساری مالی ترقیات اور جدید ترین انکشافات کے باوجود پوری انسانیت جو خطرہ میں ہے اس کا راز یہ ہے کہ خدا نے علم کو اسم کے ساتھ جوڑا تھا، خدا کے آخری نبی خاتم النبین سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ اپنے اندر تفکر، تدبر، بصیرت دانش ذہانت اور عظیم ترین صلاحت رکھتی ہے دنیا کے اخلاقی احساس کا، خدا نے علم کو اسم کے ساتھ جوڑا تھا، اور خدا نے جو پہلی آیت نازل کی تھی وہ یہ ہے **اقرا بسم ربک الذی خلق** اس میں سمجھنے، سوچنے اور بصیرت کا بہت بڑا سامنا ہے، خدا نے انسانوں کو یہ سہولت عطا کی اور یہ طریقہ عطا کیا کہ وہ اپنی زندگی کی فکر کریں اپنے اہل وعیال کی فکر کریں اپنے ماحول کی فکر کریں اور یہ سب اس کی مربوبیت کے سایہ میں ہو وہ رب العالمین ہے اس پر یقین کرنا چاہئے، اور اس کا اثر ہم پر ہونا چاہئے، لوگوں کی آسائش کا لوگوں کے امن وامان کے ساتھ رہنے کا زندگی سے لطف اٹھانے کا ان کو موقع دینا چاہئے۔ پہلی جو آیت نازل ہوئی نبی امی بلا دامی اور عالم امی میں وہ حکام کے یہاں ڈھونڈھنے سے نہ ملے گی۔

اور نبی سے صاف صاف کہا گیا کہ کبھی آپ نے نہ پڑھا اور کبھی آپ نے نہ لکھا، اور کہا گیا کہ پڑھو، اقرأ اب جو امت پیدا ہوگی وہ قرات والی امت ہوگی اور اس کا رشتہ علم کے دامن سے باندھ دیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی جارہی ہے جس کو اکثر قوموں نے نظر انداز کیا اور ترقی یافتہ مغرب میں جب سے وہاں بیداری شروع ہوئی، اقرا پڑھو لیکن صرف پڑھنا کام نہیں آئے گا، بلکہ وہ علم بہت تخریبی بن جائے گا وہ تخریبی ذہن پیدا کرے گا، اور انسانوں میں خود پرستی پیدا کرے گا، دوست پرستی پیدا کرے گا، اور شہوانیت کی طرف لے جائے گا۔ اقرا پڑھو لیکن خالی اقرا، پڑھنا کام نہیں

آئے گا، اقرا بسم ربک الذی خلق اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ پڑھو دنیا میں
اب اگر تاریخ منصفانہ طریقہ پر حقیقت پسندانہ طریقہ پر لکھی جائے اور دیکھا جائے کہ دنیا
میں انسانیت کا زوال کب سے شروع ہوا تو یہ عنوان قرار دینا ہوگا جب سے علم اور اسم کا
رشتہ ٹوٹا جب علم اسم سے آزاد ہوا، اور انسان نے اسم کو بھلاتے ہوئے فراموش کرتے
ہوئے انکار کرتے ہوئے بلکہ بغاوت کرتے ہوئے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے
اگر اس کائنات کا کوئی خالق ہے بھی تو اس کا مالک نہیں اور وہ اس کا منتظم نہیں ہے وہ کریٹر
ہے ایڈمنسٹریٹر نہیں ہے کہ یہ تاج محل ہے، دنیا کا شاہجہاں بنا کر رخصت ہوا اور جو انتظامی
ڈھانچہ ہے اس کے رحم وکرم پر ہے وہ جو چاہے سلوک کرے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا یہ دنیا تاج
محل نہیں ہے قطب مینار نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا بنایا ہوا کارخانہ ہے وہ تنہا چلا رہا ہے اسی کا
کام ہے **الا لہ الخلق والامر** حکم دینا اور چلانا اس وقت ضرورت تھی کہ ہمارے اس
طرح کے ادارے سائنٹیفک ادارے ٹکنالوجی کے ادارے، ایجوکیشن کے ادارے،
انجنیئر نگ کے ادارے اسی اسم کے ساتھ وابستہ ہوں اور یہ کام وہی جماعت کرسکتی ہے
جس کی بنیاد ہی اس صفت پر پڑی اس کی زندگی اس کی تاریخ ہی سے شروع ہوئی اور
امت مسلمہ پیدا ہوئی۔ وحی آسمانی سے اور نبی امی کی رہبری سے اور اس کے پیغام سے اور
اسی سے امت کی تاریخ شروع ہوئی ہے اور اس کے مذہب کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ علم
کو اسم سے برابر جوڑے رہیں، آج یورپ وامریکہ میں جو سانحہ اور المیہ پیش آیا وہ انسانی
المیہ ہے کہ اس وقت ان کے ہاتھ میں باگ ڈور ہے دنیا کی، وہ اس کی قیادت کررہے
ہیں، فکری قیادت کررہے ہیں۔ انھوں نے علم کا رشتہ اسم سے توڑ دیا ہے، یہ وہ حقیقت
ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے، ضرورت اس کی تھی کہ علم کو اسم کے ساتھ لے کر چلا
جائے علم اسم کی رہنمائی میں اسم کے سایہ میں اس کی سرپرستی میں آگے بڑھے اور اسم کی
برکت بھی اس کے ساتھ ہو، تب جا کر ہماری ٹکنالوجی اور سائنس کی جتنی شاخیں ہیں اور

جتنے تعمیری کام ہیں اور تعمیری ادارے ہیں اور ہماری دانش گاہیں ہیں ہمارے تحقیق کے مراکز ہیں وہ سب اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں کہ جب اسم کے سایہ میں ہوں اور وہ اسم کو نہ بھولیں، اور نہ بھولنے دیں، خدا کا شکر ہے کہ اس راستے میں مقامی طور پر یہ ایک قدم اٹھایا گیا ہے لیکن یہ بہت مبارک قدم ہے، میں اپنے عزیزوں ورفیقوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے یہ قدم اٹھایا اور الحمد للہ ترقی کے آثار ہمارے سامنے ہیں میں آپ کے سامنے موقع سے فائدہ اٹھا کر اتنا عرض کروں گا، کہ میں علامہ اقبال کے شعر کا پہلا مصرعہ نہیں بلکہ دوسرا مصرعہ پڑھوں۔

مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

حضرات! مجھے عزت بخشی گئی کہ میں کمپیوٹر سیکشن کا افتتاح کروں۔ میں آپ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس سے پہلے کمپیوٹر کا کوئی تجربہ نہیں تھا میں لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں کتابوں اور قلم سے تعلق ہے میں نے جب انگلی رکھی تو فوراً کچھ نقوش سامنے آ گئے اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو درحقیقت اور خاص طور سے مسلمانوں کو کمپیوٹر ہی بنایا تھا اس میں وہ سب چیزیں موجود تھیں لیکن اس کی ضرورت تھی کہ انگلی رکھی جائے اور وہ چیزیں ابھر آئیں اور وہ سامنے آ جائیں۔ وہ انگلی پیغمبر کو پہچانے والوں کی انگلی اپنے اپنے زمانے میں اور زمانے کے تقاضے کی انگلی جو قوم وملت کی ضرورت کی انگلی ہے وہ بھی انگلی ہے اور وہ ایسی انگلی ہے جس نے قوم کو رخ دیا ہے اور قوموں کو منزل تک پہنچایا ہے وہ انگلی رکھی جائے اور نقوش ابھر کر سامنے آ جائیں۔ افسوس ہے کہ آج انسان تو انسان خود مسلمان کمپیوٹر نہیں رہا، اس مسلمان میں اس کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور اس کے اندر اس کا شعور بھی باقی نہ رہا کہ ہم کس چیز پر مامور ہیں، ہمیں کیا چیز پلا دی گئی ہے ہمارے اندر کیا چیز سرایت کر گئی ہے، ہمارے اندر وہ تار دی گئی ہے۔ جو ہمارے دماغ اور ہمارے ذہن کا ایک جز بن گئی ہے، عقیدہ تو

عقیدہ ہمارے فہم کا ایک جز بن گئی ہے، جب اس پر اشارہ کیا جائے، جب اس کی تحریک پیدا ہو ہمیں اپنے اندر کے خزانے کو فوراً باہر لانا چاہئے۔ آج جو کام کمپیوٹر کر رہا ہے یہ کام مسلمانوں کو کرنا چاہئے تھا، کہ جس وقت امر الٰہی ہو اور جس وقت شرعی حکم سنایا جائے اور جس وقت ملت کی ضرورت کا اظہار کیا جائے اور جس کو ملت خود پکارے اور ہمیں جیسا کہ بعض عزیزوں و رفیقوں نے اس کا اظہار کیا اپنی تقریروں میں یا جس کی ملت خود ضرورت پیش کر رہی ہے اور فریاد کر رہی ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ انگلی نہیں اٹھتی جو کمپیوٹر پر لگے، اور اگر وہ انگلی نہیں اٹھتی تو وہ کمپیوٹر کام نہیں کر رہا ہے اور وہ چیز وہاں نہیں نکلتی ہے جس کی آج ضرورت ہے اور اس طرح کے ادارے جیسے کہ یہ ادارہ ہے اور یہ ادارہ جس شعور کے ساتھ اور اس عہد معائدہ کے ساتھ اور عزم و ارادے کے ساتھ اور اس فیصلہ و اعلان کے ساتھ یہ ادارے قائم ہوں کہ ہم صرف فن نہیں سکھائیں گے۔ خدا شناسی بھی سکھائیں گے اور جو ہم علم دیں گے خدا کی معرفت اور اس کے وجود کے اقرار کے ساتھ اس کے خالق کائنات اور قادر مطلق ہونے اور اسی کو راضی کرنے کا سب سے ضروری کام سمجھنا اور اس کے پیغمبروں کے پیغام کے احترام نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کی روشنی میں اس کو جوڑ کر وہ علم دیں گے، آج دنیا میں اسی چیز کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ میں اور یورپ کے بعض دیگر ملکوں میں سارے وسائل ہونے کے باوجود مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے، انسانوں کی خدمت نہیں ہو رہی ہے اور وہ حفاظت کا سامان نہیں ہے بلکہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔

میں نے واشنگٹن میں ایک تقریر میں کہا تھا، میں پہلے سے تیار نہ تھا اور وہاں برابر دورے ہو رہے تھے۔ یونیورسٹیوں میں تو میں نے سوچا کہ قاری صاحب جب آیتیں پڑھیں گے اس دن اسلامی سینٹر میں میری تقریر تھی، واشنگٹن ڈی سی میں تو میں نے کہا کہ قاری صاحب کی تلاوت سے مضمون حاصل کروں گا اور پیش کروں گا قاری صاحب

نے سورہ کہف کی آیت پڑھی جس میں ایک باغ والے سے ایک ساتھی نے کہا:

ولو لا اذ دخلت جنتک قلت ماشاء الله لا قوة الا بالله.

اس نے کہا تھا یہ میرا باغ ہے اور ہمیشہ رہے گا، اور بڑے فخر سے کہا تھا اور بڑا غرور کیا تھا تو اس کے مومن صاحب ایمان دوست نے کہا کہ میرے بھائی بہتر تو یہ ہوتا کہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوتے تو یہ کہتے۔ **ما شاء الله لا قوة الا بالله** ۔ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے سب اللہ کا دیا ہوا ہے، میں نے کہا امریکہ میں سب کچھ ہے لیکن ماشاء اللہ یاد دلانے والا نہیں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے آج امریکہ سب کچھ کرتا ہے، احسان بھی کرتا ہے لیکن اس کا شکرانہ نہیں ادا ہوتا اور اس کا جواب نہیں ملتا۔ اور پھر وہ نتائج نہیں ظاہر ہو رہے ہیں جو دنیا کے امن و امان کی شکل میں رفاہ عام کی شکل میں اور ایک دوسرے پر اعتماد اور عزت کرنے کی شکل میں ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کے ساتھ خلوص نہیں ہے اس میں ایمان کی وہ چنگاری نہیں ہے وہ ایمان کا محرک نہیں ہے۔

ہم نے کہا آج امریکہ میں سب نعمتیں موجود ہیں اور ہر طرح کی راحت کے سامان موجود ہیں، لیکن حقیقت میں وہ راحت حاصل نہیں جو ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ ماشاء اللہ نہیں ہے ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ ادارے قائم ہوں لیکن ماشاء اللہ کے سائے میں، اسم الٰہی کے سایہ میں قائم ہوں۔ علم و اسم مل کی چلیں، میں آج صاف کہتا ہوں اگر چہ یہ محدود مجلس ہے اپنے دوستوں اور رفقاء کی یہ بات دنیا کے بہت بڑے وسیع ترین اور بلند ترین پلیٹ فارم پر کہنے کی ہے کہ جب تک علم و اسم ساتھ نہیں ہوں گے اس کا پھر جوڑ نہیں ہوگا اس کا رشتہ علم و اسم کے سایہ میں نہیں ہوگا اس وقت دنیا تخریب کی طرف جائے گی، اور ہلاکت کی طرف جائے گی، اور خودکشی کرے گی، اور وہ امن و امان رفاہ عام اور وہ باہمی اعتماد تعاون نیک کاموں میں دوسرے کا ساتھ دینا، یہ بات حاصل نہیں ہوگی، خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کے سامنے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ الحمد للہ یہ ادارہ اسی بنیاد پر قائم ہے، مجھے امید ہے کہ اسی بنیاد پر قائم رہے گا۔ یہ دین کے سائے میں دینی مقاصد

کے سائے میں اور انسانی ہمدردی کے سائے میں اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو ذمہ داری ڈالی ہے، جس منصب سے انھیں سرفراز کیا ہے اس کے شعور واحساس کے ساتھ یہ ادارہ چلے گا اور ایسے اداروں کی آج ضرورت ہے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ایسے اداروں کا قیام جا بجا ہو اور وہ ترقی کریں اور مسلمان صرف صنعتی ادارے ہی نہیں بلکہ جیسے کہ ہمارے فاضل دوستوں نے کہا کہ یہ دانش گاہوں اور یونیورسٹیوں سے لے کر پرائمری اسکولوں تک بلکہ ابتدائی مکاتب تک اسم الٰہی ضرور موجود ہو، اور اسم الٰہی کی روشنی اور اسم الٰہی کی رہنمائی ہو، اسم الٰہی کا ادب ہو، اسم الٰہی کا احترام ہی نہیں بلکہ اس کے سایے میں اس کی رہنمائی حاصل کر کے کام ہو، اس کے نہ ہونے ہی سے تمام علوم کے ترقی کرنے اور پھیلنے کے باوجود دنیا کو وہ امن وسکون نہیں حاصل ہو رہا ہے اور ان علوم سے وہ منافع نہیں حاصل ہو رہے ہیں جو ہونے چاہیے تھے۔ اس لئے کہ ان کا رشتہ مذہب سے ٹوٹا ہوا ہے، بس میں اس پر ختم کرتا ہوں اور جو آپ نے اعزاز بخشا اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس ادارہ کو قائم ودائم رکھے اور ترقی عطا فرمائے۔

وما علینا الا البلاغ المبین

موجودہ دور کے بے چین ذہنوں کو مطمئن کرنا علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی یہ فکر انگیز، چشم کشا اور رہنما تقریر معمول کے مطابق دارالعلوم کے تعلیمی سال کے آغاز میں ہونا چاہیے تھی، لیکن رمضان المبارک کے بعد ہی پاکستان، ترکی، لندن، الجزائر اور حجازِ مقدس کے سفر پیش آ گئے، پھر اندرون ملک مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جلسوں میں شرکت کی مصروفیت نے اس کا موقع نہ دیا کہ اپنے فرزندان عزیز سے خطاب کر سکیں۔ لیکن اس عرصہ میں مولانا رحمہ اللہ دارالعلوم سے غیر حاضر نہیں رہے، بلکہ اس کے اعلیٰ اور وسیع مقاصد کے لئے سرگرم عمل رہے۔ اس تقریر کی حیثیت اپنے گھر کے جائزے اور محاسبہ ہی کی نہیں، بلکہ یہ ایک تاریخی اور ابدی حقیقت ہے۔

الحمدللہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سیدالانبیاء والمرسلین، وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین، ومن تبعھم باحسان ودعی بدعوتھم الی یوم الدین. امابعد!

میرے عزیزو! دنیا کی تاریخ کا بہت بڑا حصہ محفوظ ہے، اور قابل اعتبار ہے۔ لیکن اس محفوظ تاریخ سے بھی بہت پہلے کی جو تاریخ محفوظ نہیں ہے اور قابل اعتبار بھی نہیں۔ اگر وہ تاریخ محفوظ ہوتی اور اس میں نبوتوں کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا یا سب آسمانی صحیفے جو اپنے اپنے وقت پر نازل ہوئے وہ سب بے کم و کاست محفوظ ہوتے۔ ان صحیفوں کے نزول کا پس منظر اور ان کے حاملین نے صحیفوں کی روشنی اور ان کی مدد سے

اپنے زمانہ کی انسانی نسلوں کو خدا سے جس طرح مربوط کیا انہیں دین سے آشنا کر کے صحیح زندگی پر لگایا، اگر یہ محفوظ ہوتا۔ تو یہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ ہر زمانہ میں مبعوث ہونے والے نبی، اس کی نبوت، اس کے پیغام، دائرہ کار، اس کی ذمہ داریوں اور اس زمانہ کی ضرورتوں اور نسلِ انسانی کی کمزوریوں، طرزِ فکر اور ان کی زندگی کے ان مراتب میں جس کے ذریعہ سے علمی و عملی، اعتقادی و اخلاقی بے راہ روی اور ضلالت میں داخل ہوتی تھی، خاص ربط و مناسبت تھی۔

ہمارے پاس اس وقت جو محفوظ اور قابلِ اعتماد تاریخی ذخیرہ اور ریکارڈ ہے اور قرآن مجید سے ہمیں جو رہنمائی اور اشارے ملتے ہیں۔ اس سے ہمارے اس دعوے کی تائید و تصدیق ہوتی ہے اور اس کے چند نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس زمانے میں مبعوث ہوئے۔ اس زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت کی پوری انسانیت توحید کے مفہوم سے نا آشنا ہو گئی تھی اور پست ترین بت پرستی میں مبتلا تھی۔ شرفِ انسانی اور مساواتِ انسانی کا تخیل لوگوں کے ذہن سے بالکل فراموش ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت وعشق کا عملی تعلق ختم ہو گیا تھا، اور فنائیت و وارفتگی اور اس کو ہر چیز پر ترجیح دینے کا تعلق بھی باقی نہیں رہا تھا۔

عزیزو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت سے جو دور شروع ہوا۔ وہ تقریباً اس وقت تک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک حدِ فاصل ہے پچھلے اور بعد کے دور میں، اور جیسا کہ میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ دنیا میں دو جو متواتر سلسلے ہیں اگر اس کے لئے عنوان تلاش کریں تو دو عنوان ملتے ہیں۔ ایک ابراہیمیت کا دوسرے برہمیت، میں نے برہمیت میں ''نون'' کو قصداً شامل نہیں کیا، کہ لوگوں کو غلط فہمی ہوگی، اور میرا مفہوم ادا ہو جائے گا، اور اس کا تعلق کسی خاص ملک و نسل اور خاص طبقہ سے سمجھا جائے گا اور دو متواتر سلسلے (ابراہمیت اور برہمیت) ہزاروں برس سے چل رہے ہیں، ایک میں خالص توحید

ہے۔ جس میں انسانی شرف کا اعادہ اور تجدید ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور فنائیت کا تعلق ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں توحید کا بار بار تذکرہ ہے۔ پورے پورے رکوع خصاصاً سورہ ابراہیمؑ کے آخری رکوع کی آیت میں، توحید خالص اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی تعلق، محبت، عشق، فنائیت، فریفتگی اور جاں سپاری کا ذکر ہے جس کا ایک ثبوت حضرت ابراہیمؑ کے عزیز فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری پھیرنے سے ملتا ہے۔ اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی:

یَآ اِبْرٰھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○

یہ خصوصیات دین ابراہیمی کی ہیں، یہ مزاج ابراہیمی اور دعوتِ ابراہیمی کی خصوصیات ہیں۔

اس کے بعد حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کا زمانہ آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ سلطنتوں اور صنعتِ انسانی کی ترقی کا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف میں خاص طور سے ملکِ سلیمان کا ذکر کیا ہے۔

رَبِّ ھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اور سَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ.

اس کے بعد جنوں کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں ان کے لئے لوہے کو نرم کرنے کے سلسلے میں وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ کا تذکرہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور صنعتوں کی وسعت و پھیلاؤ اور ترقی کا دور ہے اس کی تنظیم کا دور ہے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے یونان کا دور آتا ہے۔ جو فلسفہ مابعد الطبعیات، ریاضیات اور طب کی ترقی کا دور کہلاتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور اور ان کی پیدائش عین یونانی علوم کے

ارتقاء کے دور میں ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ہم خاص طور سے دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے ہیں، مریضوں کو شفا دیتے ہیں، حضرت عیسی علیہ السلام کی مسیحائی اور ان کے لئے مائدے کے نزول کا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے معجزات کا کثرت سے ظہور حضرت عیسی علیہ السلام کے ہاتھوں ہوتا ہے، غرض کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں جو ماحول تھا۔ ان میں اور حضرت عیسی کے معجزات میں بڑی مناسبت پائی جاتی تھی۔ لیکن حکمتِ الٰہی نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جس دور کا انتخاب کیا ہے۔ وہ دور ہے انسانی ترقی کی وسعت تنوع کا۔ زندگی کی وسعت اطافت، تنوع، پیچیدگی، انسانی ضروریات کا اور علوم وفنون سے انسانوں کے خاص شغف کا دور ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور قیامت تک آپ کی تعلیمات کو باقی رہنا تھا۔ اس لئے انسانی زندگی اور انسانی نسل کو اپنے اندر تمام ودیعت شدہ صلاحیتوں، توانائیوں اور کامیابیوں کا گویا ترکش خالی کر دینا تھا اور اس کے لئے اپنے پورے جوہر دکھانے تھے۔ اب اس کے بعد سوائے قیامت کے کوئی دور آنے والا نہیں تھا۔ اس لئے انسان کو اپنی ذہانت، اپنے امکانات، اپنے یافت ودریافت کے امکانات اور وسعتوں کا پورا اظہار کرا دینا تھا۔ اس لئے کہ اس کے بعد نہ کوئی نبی آنے والا تھا، اور نہ کوئی امت پیدا ہونے والی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید جیسی کتاب آپ کو عطا فرمائی، جو ایک طرف تو ادب وبیان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ جس کا جواب کوئی انسان نہیں لا سکتا، حالانکہ عرب ادب وشاعری کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ دوسری طرف قرآن مجید کے اندر علم کی وسعت کے لئے ایسے امکانات رکھے گئے ہیں اور ایسے اشارے کئے گئے ہیں کہ جب کبھی بھی علم انسانی کی تحقیقات، خواہ کسی میدان کے ہوں، اپنی انتہاء کو پہنچیں تو قرآن مجید نہ صرف اس کے امکانات کو ثابت کرتا ہے بلکہ گویا وہ ان کے حقوق کو بتاتا ہے۔ چنانچہ:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ اور رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا.

کے ذریعہ علم کی جو عظمت و وسعت اور اس کے لامحدود ہونے کو بیان کیا گیا ہے، وہ صرف قرآن مجید ہی میں ملتا ہے اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اس امت کا دامن علم سے باندھ دیا گیا ہے، یعنی یہ امت علم اور عقل انسانی کے قافلے سے تفکر و تدبر کے کام اور تصنیف و تالیف کے کام سے کبھی بے تعلق نہیں ہوسکتی۔ یہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ اس امت کا سفر، اس کی سرگرمیاں اور اس کا ذوق و رجحان اور اس کی کامیابیاں علم کے دامن سے وابستہ رہیں گی۔

حضرات! اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ سب سے پہلی وحی جو آپؐ پر نازل ہوئی۔ اس کی ابتداء اقراء کے لفظ سے ہوتی ہے۔ اگر دنیا کے بڑے عقلاء کو بٹھا کر یہ سوال کیا جائے کہ آسمان کا رشتہ زمین سے پانچ سو برس کے بعد قائم ہونے والا ہے اور انسانوں کو ایک پیغام دیا جانے والا ہے، یہ بتائیے کہ وہ پیغام کس لفظ سے شروع ہوسکتا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سب کے ذہن میں مختلف الفاظ آسکتے تھے۔ کوئی کہتا کہ ''اپنے آپ کو پہچانو'' اس لئے کہ اس وقت الٰہی معرفت ناپید ہوچکی تھی۔ کوئی کہتا ''اعبد ربك'' اپنے رب کی عبادت کرو، کیونکہ صحیح عبادت نہیں ہورہی تھی۔ کوئی کچھ اور کہتا، شاید کوئی بھی یہ نہ کہتا کہ اقراء کے لفظ سے وحی شروع ہوگی۔ اس لئے کہ جس پر وحی نازل ہورہی تھی۔ وہ امی تھا، جس امت میں وہ مبعوث ہوئے تھے وہ امی تھی۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ،

جس کو یہودی امی کہتے تھے، اور جس ملک میں اس کو مبعوث ہونا تھا، وہ امی تھا۔ جس شہر میں وحی نازل ہورہی تھی۔ ڈھونڈنے سے شاید سارے مکہ میں دو چار اہل قلم مل سکتے ہوں، پڑھے لکھے انسانوں کے لئے دنیا میں بہت سے لفظ ہیں۔ عرب کاتب کا لفظ بولا کرتے تھے۔ گویا سب سے بڑا امتیاز جو اس ملک کا سمجھا جاتا تھا وہ قلم سے کام لینا تھا۔

وہاں تحریر سب سے زیادہ مشکل چیز سمجھی جاتی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اندر علم کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کے پورا کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت رکھی ہے اور اس امت اور علم کے درمیان جو رشتہ اس نے رکھا ہے اسے ہم مقناطیس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔اسی لئے ہر دور میں اس امت کا علم سے رشتہ باقی رہا ہے اور اسی لئے ہر دور میں نئے نئے شہسواروں، نئے نئے ماہر فن اور جینیس انسانوں کو یہ امت پیدا کرتی رہی ہے اور اس میدان میں کامیابی حاصل کرنے کا موقع دیتی رہی ہے۔اگر کوئی ایسا انقلاب نہیں آتا۔ جس میں صلاحیتیں بالکل مسخ ہو جائیں اور انسانی ذہن معطل ہو کر رہ جائے اور کام چھوڑ دے۔

جب تک علم کا سفر جاری رہے گا مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، خواہ ان کا تعلق تمدنی، علمی، معاشرتی اور سائنسی اور اقتصادی امور سے ہی ہو۔مذہب کی روشنی میں ان مسائل کو برابر حل کیا جاتا رہے گا۔مثال میں ہم صحابہ کرام، ائمہ اربع اور امت کے دیگر مجتہدین کو پیش کر سکتے ہیں اور یہ محض اتفاقی بات نہیں کہی جا سکتی، صحابہ کرام میں ایسے ذہین اور جینیس انسان تھے کہ انہوں نے روم و ایران جیسی ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کا مقابلہ کرنے میں ایسی صلاحیت کا ثبوت دیا جس کی نظیر کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کر سکتا۔اس طرح ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے جینیس قانون ساز تھے کہ انھوں نے زندگی اور دین کے رہنما اصولوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں ایسی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا کہ اس پورے عہد میں یہ صلاحیت نہ رومیوں میں تھی نہ ایرانیوں میں اور نہ یونانیوں میں تھی نہ کسی اور قوم میں۔ یہ لوگ اپنے زمانے کے جینیس ترین انسان تھے اور ان کے کارنامے صدیوں پر محیط ہیں۔ان کے کارنامے کی صحیح عظمت و اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ آج آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا ہے، کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ جب یونانی علوم عربی میں منتقل ہوئے تو علمی حلقوں پر کتنا غیر معمولی سحر تھا

اور کس طرح لوگ ان کے سامنے مبہوت اور ششدر تھے اور کس طرح فیشن کے طور پر لوگ باتیں کرنا اور ان کی نقل کرنا فخر واعزاز سمجھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے امام ابوالحسن اشعریؒ، سید عبد القادر جیلانی، امام غزالی، مولانا جلال الدین رومی، شیخ معین الدین چشتی، حضرت شاہ ولی اللہ اور دیگر جینیس شخصیتوں کو اپنے اپنے وقت پر پیدا کیا، جنہوں نے زمانہ کا رخ پھیر دیا۔ خطرات کا انہوں نے پوری جرأت سے مقابلہ کیا، نوجوان نسلوں کے دل ودماغ کو شکوک وشبہات سے پاک کر کے ایمان ویقین کی بنیادیں از سر نو فراہم کیں۔ بالکل یہی مرعوبیت ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی تہذیب اور جدید سائنس کے بارے میں تھی اور کس طرح لوگ یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی پر ایمان لاتے تھے اور اس سے ایسے مبہوت ہوتے تھے کہ اگرچہ دین کا صاف انکار نہیں کرتے تھے لیکن کشمکش میں ضرور مبتلا ہو گئے تھے۔ اس زمانہ کے راسخ العقیدہ خاندانوں کے مشائخ اور صالحین کا حال یہ تھا کہ اگر ان کے والدین کی سرپرستی اور بزرگوں کی صحبت ان کو نہ ملی ہوتی، اور ان کے آغوش میں انہوں نے تربیت نہ حاصل کی ہوتی تو ذہنی واعتقادی ارتداد عام ہوتا اور پورا ہندوستان اس کا شکار ہو جاتا۔

اور اگر اللہ تبارک وتعالیٰ عین وقت پر دستگیری نہ فرماتا تو نہ معلوم اس ملک کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا اور یہ صرف ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جب بھی اسلامی تاریخ کے طویل دور میں اس طرح کے حالات پیش آئے تو اللہ تعالیٰ نے ہر وقت ایسے افراد پیدا کئے، جنہوں نے اس امت کا رشتہ دین سے باقی رکھا، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا چاہئے۔

ہمارا یہ فرض ہے کہ اس مہم کو جاری رکھیں، ہم یہ بات اپنے عزیز طلباء سے کہنا چاہتے ہیں۔ کسی جماعت میں کسی بڑے عالم ومصنف کا اور مفکر کا پیدا ہو جانا کافی نہیں ہوتا، ادارے یہاں تک کہ ادیان ومذاہب بھی تاریخ سے نہیں چلتے، بلکہ وہ تحریک اور تسلسل

سے چلتے ہیں، کوئی دینی تحریک کوئی بڑا مفکر پیدا کردے، بلند قامت اور دیو پیکر مصنف پیدا کردے۔ تنہا یہ کافی نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب کبھی اپنی جماعت کے کارناموں پر فخر کرنے کی کمزوری پیدا ہو جائے تو پھر قوائے فکریہ میں تعطل ہو جاتا ہے اور اضمحلال پیدا ہونے لگتا ہے۔ ایک عرب شاعر نے بڑے لطیف انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ:

الهى بنى تغلب عن كل مكرمة

قصيدة قالها عمرو بن كلثوم

بنوتغلب کو ہر قسم کے مردانہ کارناموں اور کسی بڑی فتح کے حاصل کرنے اور کسی بڑے اقدام سے صرف ایک بات نے روک رکھا ہے وہ یہ کہ یہ لوگ صرف عمرو بن کلثوم کا قصیدہ پڑھتے اور سر دھنتے رہتے ہیں، یہ مرض جماعتوں میں بھی پیدا ہوتا ہے اور اداروں میں بھی کہ وہ جماعتیں ان کے لئے سرمایہ فخر، بانی جماعت یا اس جماعت کے کسی نامور فرد کی تصنیفات، تحقیقات اور اس کی ذہنی بلندی ان کے لئے سرمایۂ فخر بن جاتی ہے، لیکن اس سے کام نہیں چلتا۔ جماعت ہو، کوئی ادارہ ہو یا مدرسہ، بلکہ اس سے باہر نکل کر کہتا ہوں کہ امت اسلامیہ کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے اپنے دور میں غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کو پیدا کیا، اور ہم نے فلاں فلاں، شہر بسائے، سمرقند و بخارا اور غرناطہ اشبیلیہ اور دہلی ہم نے بسائے۔ بلکہ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں، اور اپنے اپنے دور کی ذہنی و اعتقادی بے چینیوں کا جائزہ لیتے رہیں۔ ان کے اسباب و محرکات تلاش کریں، دینی حقائق اور اصول و تعلیمات اور زندگی کے واقعات اور زندگی کے عملی مسائل کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کریں، ہر دور میں اسلامی قانون کی برتری کو ثابت کریں۔

علامہ اقبال نے ایک خطہ میں لکھا ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا مجدد وہ ہے کہ جو

اسلامی قوانین کی برتری دوسرے قوانین کے مقابلہ میں ثابت کرے، علامہ اقبال نے جو بات آج سے ساٹھ برس پہلے کہی تھی۔ وہ آج کے زمانہ میں ایک عملی حقیقت بن گئی ہے۔ آج ہمارے سامنے جو سب سے بڑا چیلنج ہے اور ہم لوگ اس کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت خصوصاً عائلی قوانین کی معقولیت، افراد اور خاندانوں کے حقوق کی ضمانت کے لئے اس کا سب سے بہتر ہونا ثابت کریں۔

ہم اپنے عزیز طلباء سے یہ کہیں گے کہ وہ مطالعہ و محنت سے علوم پر ماہرانہ دسترس حاصل کریں پھر جدید مسائل سے واقف ہوں۔ اور ان کا دین کی روشنی میں حل پیش کریں۔ دینی علوم میں اتفاق و گہرائی اور جدید علوم سے واقفیت اور اس کے بارے میں لچک اور نرمی کا مؤقف ان دونوں کو جمع کرنا ضروری ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کو فخر ہے کہ اس کا انتساب مولانا سید محمد علی مونگیری جیسے، بالغ النظر اور روشن ضمیر اور سیرۃ النبی کے مصنف علامہ شبلی جیسے متکلم وقت، مؤرخ زمانہ اور سیرت نگار یگانہ اور ادیب سے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تک علمی و دینی مسائل پر قلم اٹھانے اور ان کو سنجیدہ و مؤثر طریقہ سے پیش کرنے کے لئے کم سے کم میرے علم میں علامہ شبلی کے اسلوب سے بہتر کوئی اور اسلوب نہیں۔ ان ہی کے نقشِ قدم پر سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی اور دوسرے تربیت یافتہ حضرات ہوئے۔ جنہوں نے اپنے اپنے وقت پر اس سلسلہ کو جاری رکھا، لیکن یہ تنہا کافی نہیں اور آپ جب الاصلاح کا جلسہ کریں تو مجبور ہوں کہ ان ہی حضرات کا نام لیں اور اس فہرست میں اضافہ نہ ہو۔ یہ اس ادارے کے زوال اور اضمحلال کی دلیل ہے اور یہ پوری امت کے لئے خطرہ ہے یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کسی دائرے میں اس معیار کے لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو مطلوب ہیں، بعض پڑوسی اسلامی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بھی یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ وہاں بھی اب ایسی علمی وفکری قیادت

موجود نہیں جو اس نوجوان نسل کی تشفی کا سامان فراہم کر سکے جو براہ راست یورپ سے پڑھ کر آ رہی ہے کوئی ایسا رسالہ نہیں جس میں جدید تمدنی مسائل کا دین کی روشنی میں حل پیش کیا جاتا ہو۔ زبان و علم اور تحقیق کا معیار گر گیا ہے۔ ہر رسالہ اپنی جماعت اور اپنے مسلک اور مخصوص سلسلہ کے بارے میں مضامین شائع کرتا ہے۔ اگر کوئی تنظیم یا جماعت ہے تو وہ موجودہ حکومت سے بے اطمینانی ظاہر کرنے اور محدود جماعتی و گروہی اور سیاسی مفاد حل کرنے کے لئے تگ و دو کر رہی ہے۔ یہ صورتحال بڑی خطرناک ہے کہ علماء جن کا کام ہی یہ تھا کہ نوجوان نسلوں کا اعتماد اسلام پر بحال کریں۔

اسلام کی حقانیت اور اس کی ابدیت و صلاحیت کو ثابت کریں اور زندگی کے تمام مسائل میں اس کی افادیت کو ثابت کریں۔ وہ ذاتی و سیاسی مفاد میں الجھ جائیں۔ اگر اس امت میں بڑے بڑے صالحین اور اتقیاء اور دین پر جان دینے والے موجود ہوں۔ جب بھی یہ ضرورت باقی رہے گی۔

وماعلینا الا البلاغ المبین

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

یہ تقریر انجمن تعلیمات دین ضلع گورکھپور کے زیر اہتمام مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو بمقام اسلامیہ کالج گورکھپور ایک بڑے جلسہ میں کی گئی۔ اس موقعہ پر دینی تعلیمی کونسل کے سکریٹری جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ناظم مولانا محمود الحسن صاحب کے علاوہ دین دار طبقہ کی ایک کثیر تعداد شریک تھی۔ حضرت مولاناؒ نے قرآن پاک کے حوالے سے مسلمانوں کو بتایا کہ ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہ ہیکہ وہ اپنے بچے کے جسم سے زیادہ اس کے ایمان کے لئے فکرمند ہو چنانچہ مسلمانوں نے اسلام کو اپنی آئندہ نسلوں تک پہنچانے اور اسکے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ بڑی سے بڑی قربانیاں دی ہیں۔

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، ومن تبعھم باحسان ودعیٰ بدعوتھم الی یوم الدین. امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم . بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ عَلَیْھَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ○

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں

اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں، جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں۔''

حضرات! میں نے آپ کے سامنے قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی ہے جو اس سے پہلے بارہا آپ کے سامنے پڑھی گئی ہوگی، اور قرآن شریف کی تلاوت میں آپ کی نظر سے گزری ہوگی لیکن ضروری نہیں ہے کہ جو چیز بار بار نظر کے سامنے آئے اس پر آدمی غور بھی کرے، آپ سڑکوں پر سے گزرتے ہیں، سائن بورڈ برسوں سے لگے ہوئے ہیں، آپ کی نظر بھی پڑتی ہے، لیکن آپ خود سوچئے کہ آپ نے کتنی بار غور سے پڑھا اور آپ کو یاد رہا، اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ جس سڑک سے گزر کر آتے ہیں، اس میں اہم اہم سائن بورڈ کس چیز کے ہیں تو کم لوگ بتا سکیں گے۔

آیت بڑی چونکا دینے والی ہے اور ایسی ہے کہ اگر اس کا خطرہ نہ ہو کہ بار بار جو چیز سامنے ہوتی ہے اس پر توجہ ہٹ جاتی ہے، وہ روزمرہ کی چیزوں سے سمجھی جانے لگتی ہے تو میں عرض کرتا اور اصرار کرتا کہ یہ آیت جلی حروف سے لکھوا کر دیواروں پر لگوا دی جائے۔ مسجدوں میں بھی آویزاں کردی جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے وہ لوگو جو خود ایمان لا چکے ہو، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ ''اٰمَنُوْا'' ماضی کا صیغہ ہے۔ ہر لفظ پر غور کیجئے، قرآن مجید کا کوئی لفظ اتفاقی یا بھرتی کا نہیں ہوتا، یہ کوئی شاعری نہیں ''اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ'' کہا جا سکتا تھا۔ ''اَیُّھَا الْمُسْلِمُوْن'' کہا جا سکتا تھا۔ اے مسلمانو! اے جماعت مومنین! لیکن فرمایا: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' اے وہ لوگو جو خود ایمان لا چکے ہو ''قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُ النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ'' بچاؤ اپنی جانوں کو، اپنے گھر والوں کو، اپنے متعلقین کو، اپنے ماتحتوں کو آگ سے جس کا ایندھن ہے انسان اور پتھر۔'' اس آیت کے مخاطب مسلمان تھے، وہ صحابہؓ تھے، جو قرآن

مجید کے نزول کے وقت موجود تھے، وہ اولین مخاطب تھے، یوں قیامت تک کی تمام نسلیں اور جو بھی پیدا ہوا اور اپنے کو مسلمان کہے وہ سب مخاطب ہیں، لیکن پہلے مخاطب اس کے وہ لوگ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لا چکے تھے۔ آپ ﷺ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تھا، جن کو شرفِ صحابیت حاصل تھا اور اس میں یقیناً وہ لوگ بھی تھے جو بیعتِ رضوان میں شریک رہے ہوں گے۔ جنہوں نے حدیبیہ میں درخت کے نیچے جان دینے پر بیعت کی تھی اور جن کے متعلق ارشاد ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيْباً۝

(سورہ الفتح: ۱۸)

ترجمہ: ''اے (پیغمبر) جب مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی)''

جن کو یہ انعام ملا تھا اور جن کو قیامت تک کے لئے سند دی گئی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، ایسے سند یافتہ اور بلند مرتبہ لوگ بھی اس آیت کے مخاطب ہیں جو بیعتِ رضوان میں شریک ہوئے تھے اور عشرہ مبشرہ بھی اس میں یقیناً شامل ہیں اور کبارِ صحابہؓ بھی اس میں شامل ہیں، اور بدر اور احد کے ''زندہ شہید'' بھی مخاطب ہیں۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی آدمی جان بوجھ کر اپنے لڑکوں کو اپنے گھر والوں کو آگ میں جھونکتا ہے، آگ میں گھسنے دیتا ہے؟ اس کا کیا مطلب کہ اللہ کہتا ہے کہ اے وہ لوگو جو خود ایمان لا چکے ہو، اب تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو بچاؤ۔ اپنے

گھر والوں کو بچاؤ۔ دوزخ کی آگ سے، کیا کوئی واقعہ آپ نے سیرت میں ایسا پڑھا ہے کہ صحابہ کرام نے (معاذ اللہ) ارادہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو آگ کے حوالہ کر دیں۔ یا بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے اور صحابہ کرام اور اس وقت کے مسلمان خاموش بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے، اور اس صورت حال پر راضی تھے، کیا ایسا کوئی واقعہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ تو کیا بے ضرورت یہ بات کہی گئی ہے کہ اے وہ لوگو جو خود ایمان لا چکے ہو تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ، یہ کون سی آگ تھی، اور کب یہ واقعہ پیش آیا تھا، یا پیش آنے والا تھا کہ مسلمانوں کے گھروں کے بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے، اور ماں باپ سو رہے تھے، فکر نہیں کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس وقت وحی نازل کی، سب چونک گئے اور سب اپنے بچوں کی فکر میں لگ گئے کہ آگ میں چھلانگ نہ لگائیں، پھر اس آیت کا مطلب کیا ہے؟

کیا اس آیت کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو سکتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے گھر والوں کو ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک لے جانے والی ہیں جن کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ دوزخ میں جائیں، ورنہ وہ کون سے انسان ہیں جو اپنے بچوں کو آگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں اور ان کو روک نہ لیں؟ خطرہ صرف اس بات کا ہے کہ آدمی یہ نہ جانتا ہو کہ اس کے نتیجہ میں جلنا ہوتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ ایسے اسباب سے بچاؤ جو دوزخ کی آگ تک پہنچانے والے ہیں۔ اس کو فقہ کی زبان میں "اسباب مؤدیہ" کہتے ہیں، یعنی وہ اسباب جو کسی نتیجہ تک پہنچانے والے ہوں، فقہاء کے نزدیک وہ بھی نتائج کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایسی دوا دے رہا ہے جس کے نتیجہ میں موت ہوتی ہے چاہے وہ دیر سے ہو، یہ عمل قتل ہی کے مترادف ہے، اس لئے کہ اس نے وہ سبب اختیار کیا جس کے نتیجہ میں موت کا آنا یقینی ہے تو قانون بھی اس کو قاتل کہے گا، حکیم صاحبان بھی اس کو قاتل ہی سمجھیں گے، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ

تک پہنچادینے والی ہیں۔

اب میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ صورتِ حال اس وقت یہی ہے، بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ کرنا بچوں کو اس ماحول کے بالکل حوالہ کر دینا اوران کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا جو اس بات کا نہ مکلّف ہے نہ اس بات کا مدعی، نہ اس بات کا اہل کہ وہ بچوں کو وہ تعلیم دے گا جس پر نجات موقوف ہے۔ پیغمبروں کی لائی ہوئی وہ تعلیم جس سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ایمان کا خطرہ ہے۔ آخرت کی ہلاکت ہے، تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بات کو بچے کے لئے کیسے گوارا کیا جا رہا ہے؟ موجودہ تعلیمی نظام صرف لا دینی (SECULAR) ہی نہیں وہ ایک مثبت ومعین نظامِ تعلیم (SYSTEM OF EDUCATION HINDU MYTHOPOSITIVE LOGY) ہے۔ ہندو دیو مالا اس میں شامل ہے، انگریزوں کے زمانہ میں تعلیم سیکولر تھی، بلی، کتے کے قصے ہوتے تھے اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انگریزوں کے عہد حکومت میں انگریزی پڑھی ہے، اس وقت زبان سکھانے والی ابتدائی کتابوں سے نہ کسی کے عقیدہ پر اثر پڑتا تھا، نہ کسی مخلوق کا تقدس پیدا ہوتا تھا اور نہ اس کائنات میں کسی مخلوق کا تصرف واختیار معلوم ہوتا تھا، اس وقت بھیڑیئے، چیتے، بندر اور لومڑی اور بلّی کتّے کے قصے بچے پڑھتے تھے، ویسے کے ویسے ہی گھر آتے تھے جیسے جاتے تھے لیکن اب صورتِ حال یہ نہیں ہے، سرکاری نصابی کتابوں میں عقیدہ پر اثر ڈالنے والے اسباب، قصے کہانیاں اور مضامین ہوتے ہیں اور جو کسر کتابوں میں رہ جاتی ہے وہ ماسٹر صاحبان پوری کرتے ہیں، بچوں کو کچھ اجتماعی کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ہیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ڈھلوان راستہ ہو جس پر پاؤں بھی نہ جمتے ہوں اس پر کوئی بچہ سائیکل پر بیٹھا ہوا جا رہا ہو آگے کھائی ہو، سائیکل کا بریک بھی ٹھیک کام نہ کرتا ہو، باپ دیکھ رہا ہے کہ بچہ سائیکل پر بیٹھا ہے اور اس سے بھی واقف ہے کہ بریک نہیں ہے،

اس سے بھی واقف ہے کہ کوئی اور ترکیب نہیں کہ وہ سائیکل پر جاتے ہوئے کھائی سے بچ سکے گا تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس باپ نے جانتے بوجھتے اپنے بچے کو کھائی میں گرنے دیا، کیا کوئی صاحب اس سے انکار کر سکتے ہیں؟

اگر اس سے انکار نہیں کر سکتے تو اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ موجودہ نظامِ تعلیم سے بچے کا ایمان کیسے سلامت رہے گا اگر خارجی واضافی دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ (جس کو سائیکل میں بریک کا قائم مقام کہا جا سکتا ہے) جس میں تحفظ کا انتظام ہے، کہ اسکول میں بچہ جو کچھ پڑھ کر آتا ہے، اس کی اصلاح کی جاتی رہے اور اگر اس کو کوئی ایمانی توحیدی (DOSE) دیا جاتا ہے۔ صباحی یا شبینہ مکتب ہیں، تعلیمی حلقے ہیں، کوئی دینی کتاب سنائی جاتی ہے۔ ماں باپ دین کی تلقین کرتے ہیں، اچھے اچھے شوق انگیز اور دین آموز قصے سناتے ہیں۔ گھر کا ماحول دینی ہے، تب تو یہ کسی درجہ میں بریک کے قائم مقام ہیں اور اگر ایسا نہیں تو آپ نے گویا اپنے بچوں کے کان میں کہہ دیا ہے کہ ''اسکول کی ہر بات مان لینا'' یہ کان میں کہنے ہی کے مترادف ہے کہ آپ نے بچہ کا نام کسی اسکول میں لکھایا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں کیا، گویا آپ نے اپنے بچہ کو ایک طرح کی ترغیب دی ہے کہ وہ ہر غیر اسلامی بات مانتا چلا جائے۔ اب اگر وہ مانتا چلا گیا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں ہے نہ اردو جانتا ہے کہ دینی کتابیں پڑھ سکے، نہ محلے میں کسی مکتب کا انتظام ہے، تو آپ بتائیے کیا آپ ''قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا'' کے مخاطب نہیں ہیں؟

لکھنؤ کے ایک زنانہ جلسہ میں خواتین کی بڑی تعداد تھی، میں نے کہا ایک ماں کا قصہ آپ کو سناتا ہوں، ایک تعلیم یافتہ خاتون ایک دعوت میں شریک تھیں، بیبیوں نے دیکھا کہ وہ بے چین اور متفکر سی ہیں، باتوں میں ان کا دل نہیں لگ رہا ہے، ان کی عزیز بیبیاں اور سہیلیاں سب بیٹھی دلچسپی کی باتیں کر رہی ہیں، بہت دنوں کے بعد وہ اکٹھا ہوئی تھیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان خاتون کا دل و دماغ کہیں اور ہے؟ طبیعت کچھ خراب ہے؟

کوئی اندرونی تکلیف ہے؟ بہت پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ کچھ نہیں میں گھر میں ماچس کی ڈبیا چھپانا بھول گئی، بچہ وہاں ہے، مجھے کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ اس میں سے تیلی نکال لے اور مسالہ سے رگڑ کر اپنے کپڑوں میں آگ لگا لے۔ بیبیوں نے پوچھا اللہ رکھے بچہ کی کیا عمر ہے؟ خاتون نے جواب دیا یہی دو سال کی! خیال کیجئے بچہ ماچس کے بکس کو کھولنا جانتا ہے یا نہیں؟ اگر جانتا ہے اور کھولے گا تو الٹی تیلی رگڑے گا یا سیدھی رگڑے گا جدھر مسالہ ہے مگر

ع عشق است وہزار بدگمانی

محبت یہ سب چیزیں پیدا کر دیتی ہے۔ وہ چونکہ ماں ہے۔ اللہ نے مامتا دی ہے، محبت دی ہے بچہ کی، اس لئے وہ باتیں جو بہت بعید از قیاس ہیں اور کہیں برسوں میں ہوتی ہیں، سب ان کے سامنے نقشہ کی طرح ہیں۔ بچہ کھیلتے کھیلتے وہاں پہنچا، ماچس کی ڈبیا اٹھائی اس کو کھولا اس نے کبھی دیکھا تھا اپنی بڑی بہن کو یا بھائی کو کس طرح اس سے کام لیا جاتا ہے، اس نے اس کی نقل کی اور اپنے کپڑوں میں آگ لگالی، جب گھر گئے تو معلوم ہوا کہ (خدانخواستہ) یہ واقعہ پیش آیا، اتنے دور کے احتمالات کی وجہ سے وہ بی بی وہاں اس طرح بے چین نظر آتی تھیں کہ جیسے کوئی آدمی دہکتے ہوئے گرم پتھر پر کھڑا ہو، یا کوئی کانٹوں پر بیٹھا ہوا ہو۔

کیا دین کے منافی ماحول میں دین وایمان سے محروم ہو جانے کے احتمالات جانی خطرات کے احتمالات سے زیادہ قوی نہیں ہیں۔ جو اس چاہنے والی ماں کے دل میں پیدا ہوئے؟ ہمارے بچے جو پڑھ رہے ہیں جن کو آپ نے ایک دن نہیں بتایا کہ توحید کیا ہے؟ آپ نے کوئی انتظام اپنے شہر میں دینی مکاتب کا نہیں کیا، جہاں بچے پڑھ کر پھر اسکولوں میں جاتے اور اپنا ایمان بچانے کے قابل ہو جاتے، نہ گھروں میں وہ ماحول نہ محلّہ اور بستی میں یہ فضا، اسکولوں کو میں کیا کہوں، میں عربی مدرسوں کا آدمی ہوں۔ وہاں یہ حالت ہے

کہ اب جو بچے آ رہے ہیں وہ بھی ایسی بنیادی باتوں سے ناواقف ہیں جن کا ہمارے بچپن میں خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ کوئی مسلمان بچہ ان سے ناواقف ہوگا۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ کیا ہوگا؟ نسل کی نسل دین سے بالکل ناآشنا ہوگی، اردو پڑھ نہیں سکے گی، آج یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک بڑے طبیہ کالج کے جس کی ایک تاریخ ہے ایک طالب علم سے کوئی مضمون لکھوانا تھا یا خط لکھوانا تھا، تو سوچا کہ یہ صاحب تو طب کی کتابیں پڑھتے ہیں جو عام طور پر عربی فارسی میں ہیں، بہت نیچے اتر یئے تو اردو میں ہیں ان سے کہا آپ لکھئے، وہ لکھتے رہے لوگ سمجھتے رہے کہ لکھ لیا، دیکھا تو وہ ہندی میں تھا، ان سے کہا گیا کہ آپ یونانی طب پڑھتے ہیں اور اردو نہیں لکھ سکتے؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں تو یہی پڑھایا گیا ہے۔ تو ایک ایسی نسل کے تیار ہونے کا محض اندیشہ نہیں، مشاہدہ میں آ رہا ہے، دین کی بنیادی چیزوں سے ناواقف، بنیادی عقائد سے ناواقف، اللہ و رسول کا ہمارے دل و دماغ میں جو عقیدہ بسا ہوا ہے اس سے ناواقف، یہ نسل پیدا ہوگئی ہے اور جوانی کے قریب اب پہنچ رہی ہے۔ شروع ہونے کا زمانہ تو گیا، آنکھوں سے دیکھا گیا ہے کہ سیرت پر تقریر کرنی ہے...... اسلامیہ اسکول ہے، کالج ہے، جامعہ ہے، اور ایک مسلمان نوجوان طالب علم کو کسی نے سیرت کا مضمون دیا، وہ ہندی میں لکھ کر لایا، اور اردو میں پڑھا، الفاظ تو اردو اور رسم الخط ہندی، اور یہ رسم الخط تو وہ چیز ہے کہ آرنلڈ ٹوائن بی TOYNBEEARNOLD جو اس زمانہ کا بڑا فلسفی، مؤرخ (PHILOSOPHERHISTORAIAN) ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط (SCRIPT) بدل دینا کافی ہے۔ اس سے اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا اور اس کی پوری تہذیب اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور پھر جس طرف چاہے لے جاؤ۔ جو چیز کسی ملت کو اس کے ماضی سے اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے۔ وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلا نسل بدل گئی۔ آج

ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے۔فرقہ وارانہ فسادات محض ملک کو بدنام کرتے ہیں۔ فائدہ ان کا کچھ نہیں ہے، تعلیم کا نظام بدلنا کافی ہے۔آج سے ساٹھ برس پہلے اکبر مرحوم نے کہا تھا ؎

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی ہے، ذرا دیر لگے گی، تیس چالیس برس میں خود ایک ایسی نسل تیار ہو جائے گی جس کے نزدیک کفر و ایمان کا فرق، توحید و شرک کا فرق، عقائد و مذہب کا فرق سب بے معنی باتیں ہو جائیں گی۔ کچھ کرنا نہیں پڑے گا۔

مسلمان ماں باپ اس ڈر سے کہ ہمارے بچے کا کیریر خراب ہو جائے گا۔اس کی مادری زبان اردو نہیں لکھاتے۔ اس کی دینیات کی تعلیم کا انتظام نہیں کرتے بھلا ایمان کے ساتھ یہ بات جمع ہو سکتی ہے؟ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اگر کسی طریقہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے بچے کی تقدیر میں اسلام نہیں ہے یا یہ خدانخواستہ مسلمان نہیں رہے گا تو دعا کرے کہ اللہ اس کو خیر و عافیت سے اٹھا لے، یہ مسلمان کی شان ہے۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ اور اپنے زمانہ کی ایک بڑی شاعرہ خاتون ہیں، وہ بڑا دردمند دل رکھتی ہیں، انھوں نے ساری عمر اپنے دو بھائیوں کے مرثیے کہے جو ان کو داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں عورت کے کہے ہوئے مرثیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں جو انہوں نے اپنے بھائیوں کی یاد میں یادگار چھوڑا ہے، ان کا پورا دیوان صرف بھائیوں کے مرثیے سے بھرا ہوا ہے۔ ایسا دردمند دل رکھنے والی خاتون ایک معرکۂ جہاد میں اپنے ایک بیٹے کو بلاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ بیٹا جاؤ تم کو میں نے اسی دن کے لئے پالا تھا، جاؤ اللہ کے راستے میں جان دے دو، پھر دوسرے بیٹے کو بلاتی ہیں، تیسرے بیٹے کو بلاتی ہیں اور جب سب کی شہادت کی خبر آتی ہے تو کہتی ہیں ''الحمد للہ

الذی اکرمنی بشھادتھم ''اس خدا کا شکر ہے جس نے ان کی شہادت کے ذریعہ میری عزت بڑھائی، یہ ایمان کی شان ہے کہ اسلام پر سب کچھ قربان۔

آج مسئلہ یہ ہے کہ اس نسل کو کیسے بچایا جائے کیسے مسلمان رکھا جائے۔ سرکاری تعلیم کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ دینی تعلیم کا کوئی متوازی نظام بھی ہونا چاہیئے۔ آج اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اللہ ہم کو عمل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

وماعلینا الا البلاغ المبین

صنعتی اور سائنسی علوم کی تعلیمی افادیت واہمیت اسلامی تعلیمات اور دور ماضی سے اس کا ثبوت

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلى آله واصحابه اجمعين ومن تبعهم باحسان ودعى بدعوتهم الى يوم الدين. اما بعد! فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. وانزلنا الحديد فيه بأس شديد ومنافع للناس وليعلم الله من ينصره ورسله بالغيب ان الله قوى عزيز۔

قرآن مجید میں صنعت کا ذکر

حضرات! حاضرین کے اس مجمع کو جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور ان کے ساتھ علمائے کرام بھی تشریف رکھتے ہیں یہ وسوسہ میرے دل میں گزرتا ہے۔ (خدا مجھے معاف کرے) کہ ہمارے معزز سامعین حضرات (خاص طور پر جن کی تعلیم علوم کے اندر محدود رہی ہے) کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوا ہوگا کہ قرآن مجید میں صنعت کا بھی ذکر ہے، اور ان ماہرین کا بھی ذکر ہے جنھوں نے اپنے وقت میں صنعت سے تعمیری کام لیا اور خدمتِ خلق انجام دی اور انسانیت کی اور اپنے ہم اعتقاد اور زیر اثر حلقہ کی حفاظت کی، یہ کم لوگوں کے ذہن میں آیا ہے، میں نے ابھی آپ کے سامنے قرآن مجید کی یہ آیت:

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ

اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ .

''اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطر بھی شدید ہے، اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے خدا اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں، خدا ان کو معلوم کرے، بے شک خدا قوی (اور) غالب ہے۔''

اللہ تعالیٰ احسان رکھتے ہوئے اہمیت کے ساتھ ذکر فرماتا ہے کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا، پہلے خیال کیجئے کہ اس کے لئے عربی میں کئی لفظ ہو سکتے تھے۔ ''خلقنا'' کہا جا سکتا تھا یعنی ''ہم نے پیدا کیا'' لیکن نازل کرنے میں خصوصیت اور اہتمام ہے اور اس کے ساتھ قدرت اور رحمتِ خداوندی کا جو عنصر شامل ہے وہ کسی اور لفظ سے ادا نہیں ہوسکتا، آپ جانتے ہیں کہ ٹیکنالوجی (TECHNOLOGY) اور تکنولوجی ہی نہیں بلکہ فن تعمیر (آرکی ٹیکچر) بھی ہے اور دوسری چیزیں فن حرب وغیرہ ہیں ، جنگی مشقیں ہیں اور جنگی کارروائیاں ہیں اور کتنے تعمیری اور دفاعی وحفاظتی کام ہیں، ان سب میں لوہا ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے، اور کوئی نظام صنعت وحرفت اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ بیسیوں معدنی دھاتوں کو چھوڑ کر حدید (لوہے) کا انتخاب فرمایا، اور وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ہم نے لوہے کو نازل کیا اس میں بڑی طاقت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا مظہر ہے اور اس سے رفعت کا بھی ظہور ہوتا ہے، وہ صرف تلوار بنانے کے لئے نہیں ہے، وہ صرف بندوق ڈھالنے کے لئے نہیں ہے، وہ صرف گولی کو وجود میں لانے کے لئے نہیں ہے، اور اس کو شکل دینے کے لئے نہیں ''فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ'' جو عربی دان حضرات یہاں بیٹھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ نکرہ کا صیغہ جو ہوتا ہے اس میں بڑی عمومیت وکثرت ہوتی ہے تو اس وقت'' وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ''لوگوں کے لئے بہت سے منافع ہیں۔

پھر اس کے بعد اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کررہا ہے کہ:

وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ

''اور ہم نے ان کو زرہ بنانے کا علم دیا۔''

ہم نے ان کو وہ علم دیا کہ جس سے وہ اجسام انسانی کی حفاظت کا کام لے سکیں۔ ہم نے ان کے لئے لوہے کو نرم کر دیا، ان کو وہ حکمت عطا فرمائی جس سے کہ وہ لوہے سے شیشہ کا کام لے سکیں، لوہے سے کسی بہت کمزور سے کمزور دھات کا کام لے سکیں، اور تخریب ہی نہیں بلکہ تعمیر کا کام لے سکیں، یہ ایک ایک لفظ معجزہ کی حقیقت رکھتا ہے۔

پھر ایک فرد کا معاملہ نہیں بلکہ قرآن مجید آگے بڑھتا ہے اور حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے خدام (جن میں جن وانس ہیں) ان کے احکام منشاء کی تعمیل کرتے ہیں اور صنعتی و تعمیری کارنامہ انجام دیتے ہیں اور جو وہ چاہتے ہیں بتاتے ہیں، اس میں اس کی بھی تصریح کر دی کہ وہ تخریبی مقاصد کے لئے نہیں کرتے جب اس میں سلیمان علیہ السلام کی رہبری شامل ہے، اس میں ان کا حکم چلتا ہے اور ان کے اشارہ سے کام ہوتا ہے تو وہ تعمیری ہوگا اور نافع الخلائق ہوگا۔ "يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَآءُ" یہ نہیں کہ جو چاہیں وہ بنا لیں، جو وہ چاہتے ہیں بناتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی طاقتوں کو اللہ کے منشاء کے مطابق اور نبی کو جو پیغام دیا جاتا ہے اور جو مقام عطا ہوتا ہے اس کے تقاضوں اور اس کی خصوصیات کے مطابق اس کو استعمال ہونا چاہئے، ساری دنیا کی خرابی یہ ہے کہ وہ چیزیں تخریبی اور سلبی (DESTRUCTIVE & PASSIVE) مقاصد کے لئے استعمال کی گئیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمادیا کہ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَآءُ وہ آزاد نہیں تھے جو چاہتے بناتے، لوگوں پر حملہ کرتے اور قوتوں کو تباہ کرتے اور ملکوں کو پامال کرتے۔

میرا اندازہ ہی نہیں تجربہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا اس نقطۂ نظر سے اس عنوان کے تحت بہت کم مطالعہ کیا گیا کہ مسلمانوں نے کیا صنعتی ترقی کی اور اس وقت کی موجودہ دنیا جسے ترقی یافتہ دنیا کہتے ہیں۔ سائنسی دنیا (PROGRESSIVE) دنیا ہے وہ علم سے مسلح دنیا ہے، اس میں کتنا حصہ (CONTRIBUTION) مسلمانوں کا ہے۔

مثال کے طور پر ایک بات کہتا ہوں، فلسفہ میں دو چیزیں ہیں، ایک قیاس جس کو (DEDUCTIVE LOGIC) کہتے ہیں، دوسرا استقراء جس کو (INDUCTIVE LOGIC) کہتے ہیں یہ ایک تاریخی حقیقت اور مسلمہ واقعہ ہے کہ سائنس ٹیکنالوجی اور علوم عمرانیہ کا وجود میں آنا اور ترقی کرنا منطق استقرائی کا رہین منت ہے اور یورپ میں سائنس اور اس کی شاخوں کا ظہور اور تجربہ اور ایجاد کا عہد اس وقت سے شروع ہوا جب سے کہ اس نے قیاس کے بجائے استقراء سے کام لینا شروع کیا اور یہ استقراء کا اصول اور منطق استقرائی عربوں کا عطیہ ہے جو اندلس (اسپین) کے راستے سے یورپ میں آیا، موسولی بان (GUSTAVE LEBON) جو مشہور مسلم مورخ و مصنف ہے لکھتا ہے:

> ''لوگ تجربہ اور مطالعہ و استقرائی منطق (INDUCTIVE LOGIC) کو جو علم جدید کی اصل حقیقت رکھتے ہیں بیکن (FRANCISBACON) کی طرف منسوب کرتے ہیں، مگر اب یہ اعتراف کیا جانا ضروری ہے کہ یہ طریقہ مکمل طور پر عربوں کی ایجاد ہے۔''

قیاس یہ ہے کہ آپ پہلے سے ایک نظریہ قائم کر لیں اور کہیں کہ ایسا ہوتا ہے، اس کے بعد جو چیز آئے اس کے ماتحت کر دیں، اس پر APPLY کریں اور کہیں کہ یہ ایسا ہی ہوتا ہے، محض اپنی ذہانت سے یا اپنے محدود تجربہ سے، کیوں کہ یہ غیر محدود نہیں ہوتا آپ نے ایک کلیہ قائم کیا کہ فلاں چیز میں یہ اثر ہے اور اس کے بعد آپ نے جو دوسری چیزیں دیکھیں ان کو اس کے ماتحت اس کی لائن میں جو سمت ہے آپ نے اس کو ڈال دیا، یہ قیاس

دنیا کے تمام فلسفہ پر پوری دنیا پر یہاں تک کہ یونانی فلسفہ پر بھی چھایا ہوا تھا، یونان کے تذکرہ کے ساتھ ذہن خودبخود جاتا ہے کہ یونان نے قیاس میں اس قدر ترقی کی، اور ہمارے یہاں بھی جو منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، وہ زیادہ یونانی فلسفہ پر مبنی ہیں۔

استقراء یہ ہے کہ مختلف جزئیات کا تجربہ کر کے اور ان سب کو برت کر اور ان میں جو چیز قدرِ مشترک COMMON FACTORS ہے اس کو اصول بنائے اس کا نام ہے استقراء اور یورپ کے سائنس کے مؤرخوں نے جنہوں نے سائنس کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں یا یورپ کی ترقی پر کتابیں لکھی ہیں، ان کا اس پر اتفاق ہے کہ یورپ کی ترقی اور اس کی عالمگیر صنعتی فتوحات وایجادات وترقیات کی بنیاد "استقراء" پر ہے اور اس کو سب جانتے ہیں کہ استقراء کا اصول اسپین سے آیا ہے، اسپین سے استقراء کا اصول نہ آیا ہوتا تو یورپ ترقی نہ کر پاتا، اس لئے کہ آپ دیکھیے کہ پانی میں یہ خاصیت ہے، فلاں نے فلاں چیز کو دیکھا اس میں یہ خاصیت اپنی طرف سے ایک اصول آپ نے جلدی میں بنالیا، قیاس کر لیا، بلکہ اتنا بھی نہیں، اس کو دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں، اپنی ذہانت سے آپ نے کہا کہ ایسا ہوا کرتا ہے اور اس کے بعد ساری چیزوں کو اس کے ماتحت لے آئے اور ان سب پر آپ نے اپلائی کیا لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اصل جو چیز ہے وہ استقراء ہے کہ آپ جلدی نہ کریں، چیزوں کو دیکھیں، ان کی خاصیتوں کو دیکھیں، ان کے عمل کو دیکھیں، درخت کو بھی دیکھیں، پتے کو بھی دیکھیں، پھول کو دیکھیں، زمین کو بھی دیکھیں، مختلف اشیاء کو بھی دیکھیں۔

اور پھر اس کے بعد دیکھیں کہ ان میں مشترک چیز کیا ہے اس کے بعد کلیہ اپنائیں کہ جب یہ چیز ہوتی ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے، یہ استقراء جو ہے اس نے یورپ کے دماغ کو ایک نئی روشنی عطا کی اور ایک نیا میدان عطا کیا اور سائنس کی ترقی، اسی دن سے شروع ہوئی،

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ اس کا یوم پیدائش کیا تھا، جیسے انسانوں کا ہوتا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کا یوم پیدائش وہ دن ہے جس دن استقراء کو یورپ نے مانا اور استقراء کو اسپین سے حاصل کیا۔

اسی طرح اس علاقہ میں جس کو ماوراء النہر کہتے ہیں، جس میں بخارا اور سمرقند وغیرہ شامل ہیں، (اور اتفاق سے میں چند دن پہلے وہیں سے ہو کر آیا ہوں) وہاں بڑے بڑے حکماء فلسفی اور موجد و محقق پیدا ہوئے، شیخ الرئیس ابن سینا کی کتاب "القانون" ہے، آج بھی اس سے استفادہ کیا جاتا ہے، اور حیرت ہوتی ہے اس کی حکمت پر اور اس کے وسیع تجربہ پر اور ذہانت پر کہ کس طرح اس نے اعضائے انسانی اور خلقتِ انسانی کے خواص سمجھے ہیں، اور بتائے ہیں، اور امراض کی تشخیص کی اور ان کا علاج بتایا، اس طرح مختلف میدانوں میں عالم اسلام نے وہ ترقی کی جو یورپ کے لئے ایک بنیاد بن گئی اور یہ بات بڑی غلط فہمی اور کم علمی پر مبنی ہے کہ انسانی ترقی سائنس کی ترقی اور جو سائنٹفک علوم ہیں، ان سب کی ترقی یورپ سے شروع ہوئی ہے اور یورپ اس کا گویا معلم اول ہے، یہ بات مطالعہ کی کمی، نظر کی کوتاہی اور عصبیت پر مبنی ہے، مجھے خدا نے موقعہ دیا کہ میں اسپین گیا اور میں نے اسپین کو خوب دیکھا اور میں اس کے ایک کونہ طلیطلہ (TOLETOLA) سے لے کر غرناطہ (GRANATA) تک گیا، میں نے الحمراء کا قصر دیکھا، شہر دیکھا قرطبہ کی مسجد دیکھی اور وہاں کی عمارتیں اور آثارِ قدیمہ دیکھے، اسی طریقہ سے بغداد میں اور جہاں مسلمانوں کے دار السلطنت ہیں وہاں آپ کو مسجدیں ملیں گی جس پر حیرت ہوگی کہ اس زمانہ میں یہاں تک لوگ کیسے پہنچ گئے تھے، یقین نہیں ہوتا ہے کہ ان کو اس طرح بنایا جا سکتا ہے اور یہاں البیرونی جیسے لوگ پیدا ہو گئے جو ہندوستان آئے اور ان کا تاریخ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ بہت سے ایسے نظریات ہیں جو سب سے پہلے ان ہی لوگوں نے پیش کیے ہیں۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ایک بدعت کی جارہی ہے میں اپنی دینی اصطلاح میں بول رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اس بدعت سے روکا جائے، یہ بدعت نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی ایک قدیم سنت کا احیاء ہے اور اس کو زندہ کیا جارہا ہے، اور مسلمانوں کو اس کی بڑی ضرورت ہے، اور مسلمان ان میدانوں میں بھی بہت سی قوموں سے آگے رہے ہیں، میرا مطالعہ یہ ہے کہ سفر کرتا رہتا ہوں اور مختلف تعلیمی حلقوں اور اداروں میں جاتا ہوں اور ہندوستان میں نہیں ہندوستان سے ملحق خطوں میں بارہا گیا ہوں کہ مسلمان اسی زمانہ میں ٹکنالوجی اور سائنس کے میدانوں میں پیچھے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا ذہن ادب اور شاعری میں زیادہ چلتا ہے، فنونِ لطیفہ کی طرف زیادہ چلتا ہے، اور بعض لوگوں نے یہ کلمہ بنالیا کہ مسلمان تو بس جس میں لطف آئے اور جس میں حسن ہو، ذائقہ بھی ہو، اس میں مسلمان کا ذہن زیادہ چلتا ہے، باقی وہ چیزیں جو ذرا جفاکشی چاہتی ہیں، صبر چاہتی ہیں، یا جس میں دیر لگتی ہے اور جو بے مزہ معلوم ہوتی ہیں، اس میں کم چلتا ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ بہت ہی مستعجلانہ فیصلہ ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہے، مبارک باد دیتا ہوں کہ ہمارے شہر میں یہ ایک مرکز قائم ہو رہا ہے، اور ایسے مرکز کی ہر شہر میں ضرورت ہے اور مسلمانوں کو ایسے ادارے چلانے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اب بھی سیاست یا جمہوریت اور علم وفن کے دور میں اب بھی ٹیکنالوجی کی صنعت کی، اور تحقیقات کی اور سائنس کی مختلف شاخوں کی اہمیت ہے، اور افادیت ہے اور خیال ہوتا ہے کہ یہ اہمیت اور بڑھے گی، اور ہم ہندوستان میں عزت کی زندگی اپنی صلاحیت سے گزارنے پر قادر اور خود کفیل بننے کے قابل اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک ہم ان میدانوں میں بھی مہارت حاصل نہ کرلیں اور کم سے کم اس سے ہم کام نہ لے سکیں۔

حضرات! میں اس ادارہ کے قیام پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس کو ترقی دے، اور اس کی شاخیں قائم ہوں، مختلف اضلاع میں اور مسلمانوں کو ان علوم سے جو بے گانگی اور جو بعد پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہو اور وہ ان اداروں سے ایسے ماہرین کو نکالیں کہ وہ پھر ملکوں کو، وہاں کی طاقتوں کو اور ان سب کے راز کو سمجھنے بلکہ ان کو بنانے تک کی صلاحیت پیدا کر لیں تا کہ مسلم ممالک اور مسلم معاشرہ کی جو اقدار (VALUES) اور معیار (IDIOL) اور مقاصد ہیں ان کی حفاظت کر سکیں، یہ بہت بڑی خدمت ہوگی اور اسلام کو طاقت پہنچانے کا بڑا ذریعہ ہوگا، اور یہ اپنے کسب معاش کے ساتھ ساتھ ایک کثیر الفوائد کام ہوگا۔

وما علینا الا البلاغ المبین.

اکوڑہ خٹک میں حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے جہاد اور شہداء کا خون دارالعلوم حقانیہ کی شکل میں رنگ لایا

یہ تقریر ۱۹ر جولائی ۱۹۷۸ء کو صوبہ سرحد کی عظیم قدیمی ومثالی دینی درسگاہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں علماء، اساتذہ، طلبہ اور معززین کے سامنے کی گئی حضرت مولانا رحمہ اللہ کا تعارف مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم حقانیہ نے کرایا۔

الحمد للہ رب العالمین ، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین ، ومن تبعھم باِحسان ودعیٰ بدعوتھم الی یوم الدین. امابعد!

عبادت کی مشقت

میرے بزرگو، دوستو اور عزیزو! ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک عشاء کی نماز کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ مبارک سے باہر تشریف نہیں لائے، بہت دیر ہوگئی، جو معمول تھا معمول کے مطابق آپ وارد نہیں ہوئے۔ مسلمان اس اشتیاق میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جن کی تعلیم سے اور جن کی برکت سے نماز سیکھی ہے ان کے پیچھے اس مسجد میں جو اسس علی التقویٰ کا مصداق ہے عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے گھر جائیں اور آرام کریں، یہ لوگ وہ تھے جو دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہے تھے، بلکہ کھیتوں میں، باغوں میں، دوکانوں پر سارا دن محنت کرتے رہے تھے، وہ گرمیوں کا زمانہ تھا یا جاڑوں کی رات تھی، اگر گرمیوں کا زمانہ تھا تو مدینہ کی گرمی سب کو معلوم ہے، بہت سخت،

ایسی جھلسا دینے والی، جلا دینے والی گرمی، اس میں سارا دن کام کرتے رہے اور اب آئے تھے کہ نماز پڑھ کر جا کر سو رہیں گے لیکن اللہ کا رسول حجرے سے باہر نہیں آیا تھا، لوگ کچھ اونگھنے لگے تھے، کچھ سونے لگے تھے، سب پر نیند کا اور تھکن کا غلبہ تھا، حضرت عمرؓ نے جو امت کے اتالیق تھے اور بڑے شفیق تھے، انھوں نے محسوس کیا اور آواز دی کہ یا رسول اللہ بچے اور عورتیں سونے لگے ہیں، آپ باہر تشریف لائیے، لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ اس وقت روئے زمین پر نماز کے انتظار میں جاگنے والے تمہارے سوا اور کوئی نہیں، یعنی جاگنے والے تو بہت ہیں اور جمع ہونے والے بھی بہت ہیں تقریر کے لئے، ملنے جلنے کے لئے وقت کاٹنے کے لئے، لیکن تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

اسلام ہند میں

ہجرت کے شروع کا یہ قصہ ہے یاد رمیان کا تو اصل میں قیمت اور قدر کی نوعیت ہوتی ہے، قیمت مقصد اور نوعیت کی ہے، تعداد اور اژدحام کی نہیں، اسی طریقے سے ہندوستان میں جب سے اسلام آیا ہے، لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، فتوحات پر فتوحات ہوتی رہیں، اور اتفاق سے فاتح آپ کے اس علاقے سے داخل ہوتے رہے، درۂ خیبر سے یا بولان سے یہاں سے اسلامی فوجیں گزرتی رہیں اللہ ان کو جزائے خیر دے ہم ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ ان کی برکت سے ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا بلند ہوا، اسلام چاہے سندھ میں ملتان تک عربوں کے ذریعہ زیادہ پھیلا ہو لیکن بہر حال اسلام کی عظمت یہاں قائم ہوئی اور بہت سے ایسے لوگ جو تعبیر کی افادیت اور مادی فائدہ دیکھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے، انہوں نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد ان کی اولاد میں ہزاروں لاکھوں اولیاء اللہ اور علماءِ ربانی پیدا ہوئے ہم ان بادشاہوں کا اور فاتحین کا بھی احسان نہیں بھول سکتے اور ہم ان لوگوں میں سے ہونا چاہتے ہیں جن کے متعلق قرآن مجید

میں آیا ہے کہ:

والذین جاء وا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک روف رحیمO

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان مہاجر وانصار کے بعد جو لوگ آئیں گے وہ کہیں گے کہ یا اللہ ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی **الذین سبقون بالایمان** ۔ جو ایمان میں سبقت لے گئے، دنیا سے ایمان کے ساتھ پہلے چلے گئے تو ہم محمود غزنوی اور ان سے پہلے اگر کوئی آیا تو اس وقت سے لے کر احمد شاہ درّانی تک جو اس راستہ سے آنے والوں میں سب سے آخر میں آنے والا تھا اور جس نے مسلمانوں کے خلاف جو طاقتیں جمع ہو رہی تھیں ہندوستان میں اور جن کی قیادت مرہٹے کر رہے تھے ان طاقتوں کی کمر توڑ دی، اور مغلیہ سلطنت ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی عظمت وتہذیب کے گل ہوتے چراغ کو پھر تھوڑا سا تیل اور بتی مہیا کر دی اور ہندوستان کے مسلمان پھر پچاس ساٹھ برس کے لئے یہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے اور اسلام کی شوکت کا نقش قائم ہو گیا، ہم ان سب کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے اور ہم کو یہ راستہ بھی عزیز ہے جس راستے سے یہ فاتح اور کشور کشا آئے لیکن جیسا کہ ابھی مولانا سمیع الحق صاحب نے فرمایا اور بجا فرمایا کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے خالص اللہ کی رضا کے لئے، سنتوں کو زندہ کرنے کے لئے، مسلمانوں کی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اور اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کا پیغام پہنچانے اور عمل کرانے کے لئے، حدودِ شرعیہ کو نافذ کرنے کے لئے، قوانین شریعت کو رائج کرنے کے لئے جو پہلا خون ہندوستان میں صدیوں کے بعد ہی نہیں بلکہ عالمِ اسلام میں تھوڑے بہت مطالعہ کی بنا پر جس کا موقع

مجھے مل سکا ہے یہ کہہ سکتا ہوں کہ عالمِ اسلام میں صدیوں بعد جو پہلا پاک خون، دم ذکی، جس میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی، وہ خون جس سرزمین میں پہلی بار بہا ہے وہ آپ کی سرزمین ہے، یہ اکوڑہ خٹک کی زمین ہے، جس کے متعلق مرزا مظہر جان جاناں کا شعر صحیح ہوگا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جہاد کی تین شرطیں

یہاں بناء رکھی گئی اس جہادِ خالصةً لوجہ اللہ کی کہ جس کا رواج دنیا میں قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ کسی بادشاہ کے متعلق، کسی غازی کے متعلق، کسی فاتح کے متعلق تاریخ نہیں لکھتی کہ جہاد شروع کرنے سے پہلے اس نے اعلان نامہ بھیجا ہو کسی حریف کو جس کے خلاف اسے جہاد کرنا تھا کہ تین چیزیں ہیں، پہلی دعوت ہماری یہ ہے کہ تم اسلام قبول کرلو، اگر تم اسلام قبول کرلو گے تو ہم یہ زمین تمہارے حوالے کر جائیں گے، تم ہمارے بھائی ہو گے پھر ہمیں کوئی حق نہیں ہوگا کہ بستی مٹا کر تمہاری جگہ بیٹھیں، اس لئے کہ یہ آقاؤں کا تبادلہ نہیں، یہ دین کا اور مسلک کا تبادلہ ہے، یہ اللہ کے ساتھ عہد و پیمان کرتے ہو تو تم زیادہ حقدار ہو، اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو تم جزیہ دینا منظور کر و یا جاگذار ہمارے بن جاؤ۔ ہم تمہاری حفاظت بھی کریں گے اور تمہیں اپنے حال پر باقی رکھیں گے، اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر لڑنے کیلئے تیار ہو جاؤ، جہاد کی یہ تین شرطیں تھیں اور یہ بات اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ فتوح البلدان بلاذری میں آتا ہے کہ جب سمرقند فتح ہوا تو وہاں کے لوگوں کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ اصل ترتیب اسلام میں یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی جائے پھر اس کے بعد جزیہ کی پیشکش کی جائے، اگر وہ بھی منظور نہ ہو تو پھر قتال ہے۔ تو انھوں نے دیکھا کہ سمرقند میں فوجیں داخل ہو گئیں بغیر دعوت اسلام دیئے اور بغیر جزیہ کا مطالبہ کئے تو

ان کو ایک عرصہ کے بعد ہوش آیا جب کہ مسلمان وہاں بس گئے تھے، وہاں گھر بنا لئے تھے، تو انھوں نے ایک وفد روانہ کیا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خدمت میں جنہیں خلفاءِ راشدین میں شامل کیا جائے، وہ جنہیں خلیفۂ خامس کہتے ہیں ان کو معلوم ہوا کہ وہ خلیفۂ عادل ہیں لور شریعت پر پورا عمل کرتے ہیں تو ایک وفد ان کے پاس حاضر ہوا اور ان سے شکایت کی کہ سمرقند بغیر اس سنت کے اور بغیر ایک حکم شرعی پر عمل کئے فتح ہو گیا ہے۔ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک پرچہ لکھا وہاں قاضی کے نام کہ جس وقت تمہیں یہ پرچہ ملے تو اسی وقت عدالت کرواور وہاں اس بات پر شہادت لو کہ جس وقت مسلمانوں کے قائد، فوج کے قائد نے سمرقند فتح کیا، کیا اس وقت اس سنت پر عمل کیا گیا تھا یا نہیں۔ اگر ثابت ہو جائے اور کوئی شہادت اس امر پر نہ ہو کہ پہلے اسلام اور پھر جزیہ کی دعوت دی گئی تھی تو تمام مسلمان فوجیں اسی وقت سمرقند چھوڑ کر اس کی حدود سے باہر جا کر کھڑی ہو جائیں، اس کے بعد اس سنت پر عمل کریں، پہلے اہلِ سمرقند کو اسلام کی دعوت دیں، اگر منظور ہو تو فبہا، نہ ہو تو پھر جزیہ کا کہیں، اسے بھی نہ مانیں تب جہاد کریں۔ قاضی صاحب کو پرچہ ملا، انھوں نے عدالت طلب کی، مدعا علیہ مسلمانوں کی فوج کے قائد ہیں، اور دنیا کی تاریخ میں شاید اس واقعہ کی نظیر نہ ملے کہ ایک کمانڈر جس نے اپنی نوک شمشیر سے اتنا اہم علاقۂ ترکستان کا دارالخلافہ فتح کیا تھا وہ مدعیٰ علیہ اور ایک معمولی مسلمان کی حیثیت سے حاضر تھا اس مسجد میں، اس سے پوچھا گیا، اس نے اعتراف کیا کہ ہاں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں یلغار میں اور اسلامی فتوحات کے تسلسل میں اس اہم شرعی حکم پر عمل نہیں کر سکا، اور جب یہ معاملہ ثابت ہو گیا تو قاضی صاحب نے حکم دیا کہ مسلمان اس شہر سے تخلیہ کریں، اسے خالی کریں، مسلمانوں نے گھر بنا لئے تھے، کھیتیاں جوت لی تھیں، بہت سے لوگوں نے اسے اپنا شہر بنا لیا تھا تو سب کچھ چھوڑ کر دامن جھاڑ کر چلے گئے، باہر جا کر کھڑے ہو گئے، جب وہاں کے بت پرستوں نے یا بدھ مذہب کے ماننے والوں نے مشرکوں نے

یہ معاملہ دیکھا کہ شریعت کا اتنا احترام ہے کہ ان کے دلوں میں اور عدل وانصاف کا اتنا لحاظ ہے کہ وہ اپنے قائد اور کمانڈر انچیف پر بھی اسے نافذ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اب لڑائی کی ضرورت نہیں، ہم خود مسلمان ہوتے ہیں، چنانچہ سمرقند سارے کا سارا مسلمان ہو گیا اس واقعہ کے ذریعہ میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس وقت بھی جہاد کی اس سنت پر عمل کسی وقت چھوٹ جاتا تھا اور اس کے بعد تو معلوم نہیں تاریخ کا تعین تو مشکل ہے مگر اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کی تاریخ میں ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ اس سنت پر عمل کیا گیا ہو۔ ہوا یہ کہ فوجیں بڑھتی چلی جاتی تھیں اور جو علاقے اور جو شہر ان کے راستے میں آتے انہیں فتح کر کے آگے بڑھتے جاتے، مگر اس اللہ کے بندے نے اس مردِ مجاہد نے جس کا نام حضرت سید احمد شہیدؒ ہے اور ان کے ساتھی مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جنہیں ان کا وزیر اعظم کہیئے، یا دست و بازو کہیئے یا لشکر کے قاضی مفتی اور شیخ الاسلام کہیئے، ان دونوں نے پہلی مرتبہ اس سنت پر عمل کیا اور یہیں سے وہ اعلان نامہ لاہور روانہ کیا گیا جو لفظ بلفظ کتابوں میں منقول ہے، تو یہی وہ سرزمین ہے جو ان مجاہدوں کے خون سے لالہ زار بنی۔

خونِ شہیداں ضائع نہیں ہوتا

میرے عزیزو! یاد رکھو، خونِ شہیداں ضائع نہیں ہوتا، وہ ہزاروں باغ کھلاتا ہے اور اس کے نتیجے میں جیسے باغ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح مدرسے بھی پیدا ہوتے ہیں، خانقاہیں بھی پیدا ہوتی ہیں، مسجدیں بھی صفحہ وجود میں آتی ہیں اور وہ زمین اللہ کی راہ میں وقیع ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اس پر شہیدوں کا اور مجاہدوں کا خون بہا ہے۔ تو آپ کی اس سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں پر اللہ کی راہ میں اس جہاد کا آغاز ہوا اور ابھی میں راستے میں سنا رہا تھا کہ ہمارے رائے بریلی کے ایک خان صاحب تھے عبد المجید

خانصاحب ان کا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا جنہیں رات کو بھیجا جانا تھا۔ اکوڑہ کے چھاپہ کے لئے رات کو چھاپہ ڈالنا تھا اور یہاں سے مجاہدین کی جو فرودگاہ تھی چھ کوس یا دس کوس کے فاصلے پر اور پھر رات ہی کو شبخون مار کر واپس ہونا تھا تو حضرت سید احمد شہیدؒ کے سامنے جب فہرست آئی تو ان کو معلوم تھا کہ عبدالمجید خان صاحب بیمار ہیں اور کمزور ہیں تو ان کے نام کے سامنے نشان لگا دیا کہ ان کا نام نکال دیا جائے کہ یہ کوئی جہاد کا اختتام نہیں آغاز ہے، پھر بہت سے مواقع آئیں گے ان کے جہاد کے، تو ان کو جب معلوم ہوا کہ میرا نام فہرست سے نکال دیا گیا ہے تو کوئی اور ہوتا تو اس موقع کو غنیمت سمجھ لیتا کہ چلئے سر پر آیا ایک خطرہ تو ٹل گیا کہ چند آدمی دس ہزار کی فوج پر چھاپہ ڈالنے جا رہے ہیں، راستہ کے نشیب و فراز سے ناواقف ہیں، تو پہلا تجربہ تھا۔ سوچتے کہ معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے تو وہ ایسے موقع کو غنیمت سمجھ لیتے کہ مجھے بھی کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی میرا نام امیر المومنین نے خود ہی کاٹ دیا۔ اس سے زیادہ بہتر کیا بات ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں بلکہ وہ خود دوڑتے ہوئے آئے اور شکایت کی میرا نام فہرست سے کیوں کاٹ دیا ہے؟ فرمایا بھئی تمہیں بخار آرہا ہے، میں سنتا ہوں کہ تم بیمار اور کمزور ہو اور یہ بڑا سخت چھاپہ ہے، اس کے لئے جفاکش اور تنومند لوگوں کی ضرورت ہے، تو انہوں نے کہا کہ حضرت آج جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے اور یہ پہلا موقع ہے، تو کیا میں اس بنیاد کے موقع سے محروم رہ جاؤں؟ میرا نام للہ اس فہرست میں شامل کر دیجئے۔ تو ان کا نام اس فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ اللہ نے ان کو قبول فرمایا اور وہ اس چھاپہ میں شہید ہوئے۔

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی ضرورت

تو یہ سارے واقعات اس سرزمین کے ہیں پھر یہاں سے دوسرا مقام سیدو ہیں ہوا جو آپ کے قریب ہے، اس کے بعد پھر ہوتے ہوتے ہنڈ وغیرہ کے معرکے ہوئے،

جہانگیرہ وغیرہ میں۔ میں ان سب ناموں سے مانوس ہوں، اس راستہ پر آج میں پہلی مرتبہ آیا ہوں اور اس سے قبل پشاور اور مردان کے راستہ آنا ہوا تھا جو آج سے چونتیس پینتیس برس پہلے کا واقعہ ہے، جب دار العلوم حقانیہ نہیں تھا اور میں آیا اور گھوم پھر کر چلا گیا کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا اور میری عمر وفا کرے گی اور اللہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے گا کہ میں پھر دوبارہ یہاں آؤں گا اور اپنی آنکھوں سے اس دار العلوم کو دیکھوں گا جہاں ان شہدینؒ کی نہ صرف یاد تازہ ہے بلکہ اپنا انتساب بھی ان کی طرف کیا جاتا ہے، یہ نسبت، یہ نسبتِ گرامی ایسی ہے کہ انشاء اللہ رنگ لائے گی، خون شہیداں رنگ لایا، یہ نسبت انشاء اللہ رنگ لائے گی۔ اس کا نام حقانیہ ہے اس میں حقانیت انشاء اللہ قائم رہے گی اور یہاں سے جو لوگ نکلیں گے وہ حقانیت کے علمبردار ہوں گے، اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث اور شیخ العلماء حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدظلہٗ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے اور اس مدرسہ کی کامیابیوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لگائے ہوئے اس باغ کو سرسبز و شاداب رکھے اور پھلتا پھولتا رکھے۔ یہاں اس سرزمین میں ایک ایسا مدرسہ ضرور ہونا چاہئے تھا جہاں قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں بلند ہوں، اس لئے کہ یہ اسی قال اللہ اور قال الرسول ہی کا نتیجہ تھا کہ کتنے اللہ کے بندے ہتھیلیوں پر سر رکھے ہزاروں میل سے ہندوستان سے کہاں کہاں سے یہاں پر آئے اور کہاں یہ میدان، یہ قال اللہ اور قال الرسول ہی تھا جو ان کو اتنی دور کھینچ لایا اور یہاں جب تک قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی رہیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اللہ کی رحمت برستی رہے گی

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست
خم وخمخانہ با مہر ونشان است

ابھی یہ خمخانہ خالی نہیں ہوا، جاری ہے اور حافظ کے اس شعر پر میں ختم کرتا ہوں۔

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد ست
عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد ست

کہ اپنے مرشد کی سو باتوں میں سے ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے کہ عالم اس وقت تک ویران نہیں ہوگا جب تک کہ میکدۂ معرفت قائم ہے۔قال اللہ اور قال الرسول کا مرکز قائم ہے، اس وقت تک عالم ویران نہیں ہوگا اور یہ حدیث میں آتا ہے کہ جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا باقی ہوگا اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی۔آپ کو مبارک ہو، یہ سرزمین بھی مبارک ہو، کبھی کبھی ؎

تازہ خواہی داشتن گرد اغبائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

اور اس دارالعلوم کی آپ قدر کریں، اس کے اساتذہ اور اس کے علماء کی قدر کریں، یہاں ذہین طالب علموں کو بھیجیں، اس لئے کہ اب ضرورت ہے جیسا کہ مولانا سمیع الحق صاحب نے اشارہ کیا کہ مغربیت کے فتنے میں ذہین لوگ سامنے آئیں کہ جن کے اندر حوصلہ ہو، ولولہ ہو، اچھے خاندانوں کے ہوں، ان میں مجاہدوں کا خون ہو، شہیدوں کا خون ہو، امینوں کا خون ہو، وفاداروں کا خون ہو، وہ آئیں اور وہ لوگ علوم کتاب وسنت پڑھیں اور اس کے بعد اس سرزمین میں جو اس وقت ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں اسلامی قانون کے نفاذ کے ارادے کئے جا رہے ہیں اور مطالعے کئے جا رہے ہیں، وہ رہنمائی کریں۔

بس ان الفاظ کے ساتھ میں ختم کرتا ہوں۔ میں نے یہاں آ کر کسی پر احسان نہیں کیا۔میرا کسی کے اوپر کوئی احسان نہیں بلکہ میں نے اپنے اوپر احسان کیا ہے اور بلانے والوں نے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر احسان کیا کہ یہ عزیز سرزمین ہم کو دوبارہ دکھلا دی جس مقصد کے لئے یہ زمین رنگین ہوئی تھی اللہ تعالیٰ اس مقصد کو دنیا میں عام کرے اور

اسلام کا کلمہ بلند ہو، اسلام کو غلبہ حاصل ہو اور ہمارے گھروں میں، ہمارے دفتروں میں، ہمارے اداروں میں سب جگہ اسلام نافذ ہو۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے:

اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم واجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم.

اللہ تعالیٰ ہم کو اور ہمارے سب دوستوں عزیزوں کو تمام روحانی وجسمانی بیماریوں سے شفائے کلی عطا فرمائے، صحت عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص وللّٰہیت عطا فرمائے، ہمارے قلوب کو منور فرمائے، ہمارے دماغوں کو روشن کر دے، ہمارے اعضاء و جوارح کو قوت عطا فرمائے، ہماری آئندہ نسلوں میں اسلام کو قائم رکھے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عہد حاضر کا چیلنج اور امتِ محمدیہ کے فرائض

جامعہ تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد کے اساتذہ طلبہ اور معززینِ شہر سے خطاب،
یہ جلسہ ۲۳ / جولائی ۱۹۷۸ء کو جامعہ کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ خیر مقدمی کلمات اور
تعارفی تقریر مولانا حکیم عبد الرحیم صاحب اشرف (ناظم و بانی جامعہ) کی ہوئی۔
اختتامی خطاب اور کلمات تشکر مولانا عبد الغفار حسن صاحب (استاد جامعہ اسلامیہ
مدینہ منورہ) نے ادا فرمائے۔

الحمدلله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلىٰ آله وصحبه اجمعين و من تبعهم باحسان و دعى بدعوتهم الى يوم الدين.

هو الذى بعث فى الاميين رسولاً منهم يتلوا عليهم ايٰاته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة.

عہدِ حاضر کا چیلنج اور امتِ محمدیہ کے فرائض

حضرات ذمہ دارانِ جامعہ، اساتذہ جامعہ اور عزیز طلبہ!

مجھے آپ کی اس مجلس میں شرکت سے مسرت ہے اور یہاں میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا اور مجھے محسوس بھی نہیں کرنا چاہیئے، اس لئے کہ یہ سب حاضرین ہم زبان اور ہم خیال ہیں، اور ایک ہی کشتی کے سوار اور ایک ہی قافلہ کے مسافر ہیں، علمِ دین کا قافلہ اور اسلام کی دعوت اور ترجمانی کا قافلہ ہے۔

عصرِ جدید کا چیلنج

میں سمجھتا ہوں کہ عصرِ جدید کا سب سے بڑا فتنہ اور جدید اصطلاح میں چیلنج، مادیت نفس پرستی اور دولت ہے۔ یہ فتنہ ہر زمانہ میں رہا ہے، لیکن یہ فتنہ اس زمانہ میں جس طرح منظّم، طاقتور دلائل اور فلسفوں سے مسلح سامنے آیا ہے، اس طریقہ سے کبھی نہیں آیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ دور میں مادیت کے عروج کے زمانے میں بھی جو لوگ مادیت کے نقطۂ عروج پر تھے وہ بھی احساسِ کمتری کا شکار تھے، وہ اپنی عادتوں کے غلام اور دولت و اقتدار کے پرستار تھے، لیکن ان کو اس پر فخر نہیں تھا، بلکہ وہ کچھ شرمندہ، شرمندہ نظر آتے تھے، ان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم کوئی غلطی کر رہے ہیں، ہم اپنے نفس کی تسکین تو کر رہے ہیں لیکن دماغوں کی تسکین سے عاجز ہیں، آپ اس زمانہ کی تاریخ پڑھئے اور مادیت کے علمبرداروں کی نفسیات کا مطالعہ کیجئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ کی جو روحانی ہستیاں تھیں، بلکہ جو لوگ پستیوں سے بلند تھے، یہ دنیادار ان کے سامنے جھک جاتے، ان کا ادب کرتے تھے، ان کے سامنے آنے سے کتراتے تھے، شرماتے تھے، ان سے آنکھیں ملانے کی تاب نہیں رکھتے تھے، ان کے پہلو میں نفس "لوامہ" تھا، یعنی وہ ضمیر جس کو اپنے جرم کا احساس ہو، ان کا ضمیر بھی اس قسم کا تھا، سارے مظالم کے باوجود وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ٹھیک راستہ سے ہٹ گئے ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ جو مادیت کے بامِ عروج پر تھے وہ بھی مرتبہ خلوتوں میں روتے تھے، اور بعض مرتبہ جب ان کا ضمیر بیدار ہوتا تھا اپنی زبان سے اقرار بھی کر لیتے تھے کہ ہمارا راستہ غلط ہے اور ہم نفس پرستی کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مشرقی اور مغربی کیمپ کا واحد نقطۂ نظر

لیکن اس زمانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ مادیت کو ترقی و شائستگی کا منتہی سمجھا جاتا ہے، مادیت کے بارے میں مغربی اور مشرقی کیمپ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف صرف یہ ہے کہ مادیت کی تنظیم کس طرح کی جائے اور یہ کس فلسفہ اور کس مکتب فکر کے ہاتھ میں رہے؟ امریکہ کا اصرار ہے کہ اپنی ملکیت میں آزادانہ تصرف اور اس کے استعمال کی آزادی رکھنے کا اصول صحیح ہے، اور مشرقی کیمپ روسی کمیونسٹ بلاک اس پر یقین رکھتا ہے اور اس کی دعوت دیتا ہے کہ کسی فرد یا گروہ یا خاندان کی اجارہ داری غلط ہے، وسائل زندگی کو عام کرنا چاہئے اور اس میں پوری مساوات ہونی چاہئے اور اس کا اختیار حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، لیکن زندگی کس طرح گزارنی چاہئے؟ زندگی کی طاقتوں کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ زندگی کی تنظیم کس طرح کی جائے اور وسائل و مقاصد میں کس طرح ہم آہنگی اور تعاون بنانا چاہئے؟ پھر اس کے نتائج سے کس طرح متمتع ہوا جائے اور اپنی زندگی کا منتہی، منزلِ مقصود کس کو بنانا چاہئے؟ انسان کی ترقی کا مدار کس میں پنہاں ہے؟ اس بارے میں ان دونوں فلسفوں میں کوئی اختلاف نہیں وہ دونوں اس چیز کے قائل ہیں کہ اصل چیز لذت، عزت اور ارادہ کی آزادی ہے جو جی میں آئے کرنا اور اپنے نفس کو تمتع کا پورا موقع دینا، اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنا اور نفس کے جو حقوق ہیں ان کو پورا کرنا، اس مادی جسم کو گوشت پوست کے جسم کو آرام پہنچانا یہی اصل مقصود ہے، نہ کہیں سے آئے تھے، نہ کہیں جانا ہے، نہ کسی کے سامنے حساب کتاب پیش کرنا ہے اور نہ اس سے بلند و بالا کوئی فلسفۂ اخلاق ہے، نہ فلسفۂ روحانیت ہے، نہ کوئی فلسفۂ عقائد ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی حقائق ہی ہیں، حقیقتِ مطلق، حقیقتِ کلی یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ ہم اس کے ذخائر اور مواقع سے فائدہ اٹھائیں، ان کو آپس میں بانٹ کر

کھائیں اور زندگی کا لطف اٹھائیں۔اس میں جو چیز بھی حائل ہو اس کو دور کر دینا چاہئے، یعنی مقصد ہے تو نفع اٹھانا،لیکن جو چیزیں حائل ہیں ان کی تعیین میں ان میں اختلاف ہے ،کوئی کہتا ہے اس میں شاہی حائل ہے، ایک خاندان کی مطلق العنانی حائل ہے، کوئی کہتا ہے اس میں ذاتی ملکیت حائل ہے،کوئی کہتا ہے اس میں سرمایہ حائل ہے اور سرمایہ داری کا استحصال حائل ہے،کوئی کہتا ہے کہ غلط تقسیم اس میں حائل ہے۔کوئی کہتا ہے کہ اس میں جہل حائل ہے،کوئی کہتا ہے کہ اسمیں اچھے ادارہ اور طاقت کا فقدان، جو ان سب وسائل کو سب پر تقسیم کرے، حائل ہے،غرض یہ کہ جو اجزاء اور عوائق ہیں ان کے درمیان اختلاف ہے،لیکن مقصود میں کوئی اختلاف نہیں، اس زمانہ میں مادیت کی جو تنظیم ہوگئی ہے، جس طرح اس کو ریفائن (REFINE) کیا گیا ہے، جیسے شاندار نام دیئے گئے ہیں، جس طرح اس پر خوبصورت لیبل لگائے گئے ہیں، جس طرح کی توانائیاں اور صلاحیتیں کام کر رہی ہیں، جس طرح مادیت کو عام کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول بنانے کے لئے کوششیں کی گئی ہیں، ہمارے علم میں انسانی تاریخ کے کسی دور میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔

سب سے بڑا چیلنج مادّیت

اس طرح اس دور کا سب سے بڑا چیلنج مادیت کا چیلنج ہے، یہ ایک ایسی کلی حقیقت ہے جس کے اصول و انواع تو سیکڑوں ہو سکتے ہیں، لیکن جنس ایک ہے، اور وہ جنس مادیت ہے، اب اس کے انواع میں سرمایہ داری ہے، اشتراکیت بھی ہے، اشتمالیت (کمیونزم) بھی ہے اور دوسرے اقتصادی فلسفے بھی ہیں، لیکن سب کا منتہیٰ اور ''نقطۂ جامعہ قدر مشترک (COMMON FACTOR) مادیت ہے، نفس پرستی ہے۔

وہ حقائق جو مادیت پر ضرب کاری لگاتے ہیں

جب انسان اپنے پیٹ کا، اپنے معدے کا غلام تھا، اپنی اندرونی سفلی خواہشات کا غلام تھا، جب انسان دولت، عورت، زمین کے سوا کسی کو حقیقی نہیں مانتا تھا، جب دنیا کی کثیر آبادی مخلوق کے سامنے جھکتی تھی اور اس کے سامنے دبتی تھی، انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں تشریف لائے اور انھوں نے بتایا کہ اس عالم سے ماورا ایک عالم ہے، وہ عالم اس عالم سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ رقیق، کہیں زیادہ حسین وجمیل ہے، اس عالم کو اگر تم دیکھ لو تو اس عالم کا گوارا کرنا مشکل ہوگا۔ اس عالم میں زندگی گزارنا ایسا ہوگا جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، جیسے کسی آزاد پرندے کو کسی پنجرے میں بند کر دیا جائے اور وہ پنجرہ بھی بہت تنگ ہو، وہ پھڑ پھڑانے لگتا ہے، اسی طریقہ سے اگر تم اس عالم کو دیکھ لو تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں اور تم کو اس دنیا سے گھن آنے لگے جس دنیا کو تم سب کچھ سمجھ رہے ہو جس دنیا پر تم اپنی عزیز متاع، روحانیت کی علم کی، اخلاق کی قربان کر رہے ہو، اس عالم سے تمہیں گھن آنے لگے، جس طرح کسی کو ایک منٹ کے لئے گندگی کے کسی بہت بڑے ذخیرے پر کھڑا کر دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور اس کو متلی آنے لگتی ہے، یہ وہ چیز ہے جو قرآن نے صحف سماوی نے اپنے اپنے طور پر بیان کی ہے "**قل متاع الدنیا قلیل**" کہیں **حطام** کے لفظ سے اس کی تعبیر کی، کہیں زرع کے لفظ سے ادا کیا، یہ حطام ہے یعنی چورا ہے، جیسے کھیتی کا چورا ہوتا ہے، ویسے ہی یہ بھوسا ہے، کہیں اس کو "**کزرع اعجب الکفار نباتہ**" کہ کسان کی کھیتی لہلہائی تو اس کو بڑی بھلی لگی اور اس کے رال ٹپکنے لگی، اور اس نے کہا کہ کیسا اچھا یہ چمن ہے جو کھلا ہے، کیسی یہ کھیتی ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد خزاں کا ایک جھونکا چلا آیا کسان کی درانتی اس پر چلی تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

سب سے پہلے اللہ کے پیغمبروں نے دنیا کی یہ حقیقت منکشف کی کہ دنیا بچوں کا کھیل ہے، جیسے ریت پر بیٹھے وہ گھر بناتے ہیں، محل بناتے ہیں، گھروندے بناتے ہیں، پھر اپنے ہاتھ سے توڑ دیتے ہیں پھر بناتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور پھر خود ہی توڑ دیتے ہیں، یہ دنیا بازیچۂ اطفال ہے یہ دنیا ان عقلاء کے سامنے، عارفین کے سامنے جن پر اللہ نے یہ حقیقت منکشف کی، اگر آپ تاریخ پڑھیں تو آپ کو یہ سب کچھ نظر آئے گا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

بغداد میں ایک مرتبہ ہم نے وہ میوزیم دیکھا جو ماقبل تاریخ کے مختلف تمدنوں، تہذیبوں، وادیٔ فرات کی تہذیبیں، نمرود وغیرہ کا زمانہ اور نہ معلوم کون کون سی سلطنتوں کے آثار تاریخی یادگار کے طور پر سجائے رکھے ہیں، پھر اس کے بعد تاریخ کا سفر کرتے کرتے عہد عباسی اس کے بعد سلجوقیوں کا زمانہ، تاتاریوں اور مغلوں کا زمانہ، ترکوں کا زمانہ، انگریزوں کا زمانہ، فیصل بن حسین کا زمانہ سامنے آیا، آپ یقین مانیئے اتنی دیر میں مجھے دنیا کے تغیر وتبدل سے متلی آنے لگی جیسے کوئی کڑوی چیز کھالے یا کوئی اوورڈوز (OVER DOSE) ہوجائے۔ میں تھک گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب تماشا ہی تماشا ہے، یہ وہ سلطنتیں ہیں جن کو زوال کی منزل طے کرنے اور ختم کرنے میں ہزار سال لگے، کسی کو پانچ سو برس لگے ہیں مگر ہم کو یہ معلوم ہونے لگا کہ گھنٹوں کا معاملہ ہے جو محض دھوکا تھا۔ یا خواب تھا، جن کو لوگ سمجھے ایک ہزار برس تھا ہم نے ان کا انجام دیکھ لیا، ہم ایسی جگہ کھڑے ہیں جہاں انسانیت کا ملبہ ہے اور ملبے پر کھڑے ہیں، ایسے ہی ہمارے بعد جو لوگ آئیں گے اور وہ یہی دیکھیں گے۔ ''قل متاع الدنیا قلیل'' ہم جس کو طویل سمجھ

رہے ہیں وہ کتنا قلیل ہے۔

جگہ دِل لگانے کی دنیا نہیں ہے

خدا کو اس دنیا کو آباد رکھنا ہے، اس لئے خدا نے یہ دنیا عام انسانوں پر ایسی منکشف نہیں کی ہے، جیسے عارفین پر منکشف کی تھی، ورنہ یہ دنیا ویران ہو جاتی، اس دنیا میں مکان بنانے میں کسی کا دل لگتا اور نہ کارخانہ اور فیکٹری قائم کرنے میں کسی کا دل لگتا۔ یہ حکمتِ الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو آنکھوں سے روپوش کر رکھا ہے، ورنہ اگر یہ حقیقت منکشف ہو جائے اور آخر میں جو کچھ ہونے والا ہے پہلے اگر دکھا دیا جائے تو انسان سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا، یا تو اس کا دم نکل جائے گا یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا اور انگلی ہلانا اس کا مشکل ہو جائے گا۔ یہ تو انبیاء علیہم السلام کا جگر اور ان کے نائبین کا جگر تھا کہ سب جانتے ہوئے انھوں نے دنیا کے حقوق ادا کئے، اپنے عزیزوں کے حقوق ادا کئے، ہمسایوں کے حقوق ادا کئے اور انسانوں کے حقوق ادا کئے، رہے تو سلیقہ کے ساتھ رہے، ذوق کے ساتھ رہے، اطمینان کے ساتھ رہے، عزم کے ساتھ رہے، اپنی صلاحیت کو انھوں نے استعمال کیا، جس شہر میں رہے، جس محلّہ میں رہے، اس کو صاف کیا، لیکن دل انھوں نے ایک منٹ کے لئے بھی اس میں نہیں لگایا اور برابر کہتے رہے ''اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ'' کیونکہ اس کا انجام جانتے تھے، اور پھر اس کے بعد انھوں نے تعمیر بھی کی مسجدیں بھی بنائیں، اسلام بھی پھیلایا، فتوحات بھی کیں، ملکوں کو اللہ کی قلمرو میں شامل بھی کیا، نئے نئے علوم وفنون وجود میں لائے، تاریخ کی انھوں نے ایسی بنیاد رکھی جو آج تک مستحکم ہے، یہ سب کچھ کیا، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اس دنیا کو آخری منزل نہیں سمجھتے تھے، وہ اس دنیا کو ابتدائی منزل سمجھتے تھے، اور یہ ہم میں اور ان میں فرق ہے۔

مادیت کے راکب یا مُرکب

اس وقت مادیت کا جو جادو تھا وہ جادو لوگ توڑتے تھے جو اس مادیت سے اپنے آپ کو آزاد کر چکے تھے، جو مادیت کے غلام نہیں تھے، جن کا یہ حال تھا کہ مادیت کو انھوں نے تابع کر رکھا تھا، وہ مادیت کے تابع نہیں تھے، مادیت کے راکب (سوار) تھے، مادیت کے مرکب (سواری) نہیں تھے۔ آج اصل فرق یہ ہے کہ مادیت کے ہم مرکب ہیں یا ایسے بے اختیار راکب کہ

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

اور یہ ہماری حالت ہے کہ جیسے کوئی گھوڑا چھوٹ جائے اور اس کا راکب بے اختیار ہو جائے، مادیت ہمیں سرپٹ دوڑائے لئے پھر رہی ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس گھوڑے کو کس طرف موڑیں گے اور اس کو کس طرح چھوڑیں گے، دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں، خندق میں لے کر کود جائے گا، کسی کھائی میں چھلانگ لگائے گا، سمندر میں کود جائے گا، ہمیں پتہ نہیں، تو اس وقت ہمارے پورے تمدن کا یہ حال ہے کہ تمدن ہمارے اختیار میں نہیں رہا، تمدن کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے، مادیت کو ہمیشہ ان لوگوں نے چیلنج کیا اور ان لوگوں کے چیلنج کو اس نے قبول کیا جو اس سطح سے بلند تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے قناعت کی دولت عطا فرمائی تھی، جو بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہ بادشاہوں سے اس طرح باتیں کرتے تھے جس طرح مریضوں سے باتیں کرتے ہیں، وہ ان کو مریض سمجھتے تھے، ان پر رحم کھاتے تھے، اپنے حال پر خوش تھے، ان کو ان بادشاہوں پر ترس آتا تھا کہ غریب کس مصیبت میں گرفتار ہیں، اور اس میں تصنع نام کو نہ تھا، واقعی ان کے دل میں درد ہوتا تھا، دیکھئے ربعی بن عامر سے رستم نے جب پوچھا کہ تم کیسے آئے ہو؟ تو کہا کہ تم کو دنیا کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا کی وسیع فضا میں داخل

کرنے آئے ہیں، میں نے ابوظبی کی ایک تقریر میں کہا کہ اگر وہ اللہ کا بندہ کہتا کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں داخل کرنے آئے ہیں تو مجھے ذرا تعجب نہ ہوتا، یہ تو ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ "الدنیا سجن المومن و جنة الکافر" دنیا تو ایک قفس اور پنجرا ہے، لیکن مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اللہ کے اس بندے نے جو پیٹ پر پتھر باندھتا ہوگا، جس کے پاس ضرورت کا راشن نہیں ہوگا اور جسم پر چیتھڑے لپیٹے ہوگا، کیا دیکھ کر اس نے کہا کہ ہم تم کو دنیا کی کال کوٹھری سے نکال کر، جس میں تم بند ہو، وسیع فضا میں منتقل کرنے کے لئے آئے ہیں، کیا عرب کی فضا وسیع تھی؟ کیا عرب میں وسائلِ معیشت محدود ہی نہیں بلکہ تقریباً معدوم نہیں تھے؟ پیٹ بھر کھانا بھی لوگوں کو نہیں ملتا تھا، جہاں وہ اونٹوں کی کھال کے بنے ہوئے خیموں کے اندر اور مٹی کے بنے ہوئے جھونپڑوں کے اندر رہتے تھے، جہاں ان کو نیا شکار مل گیا یا اپنے ہی اونٹوں کو ذبح کر لیا تو گویا ان کی عید ہوگئی، اس دن معلوم ہوتا تھا کہ رزق کے دروازے کھل گئے، کیا دیکھ کر اللہ کے اس بندے نے کہا کہ تم اپنی خبر لو، تم تو پنجرے میں گرفتار ہو، تھوڑے سے دانے ڈال دیئے گئے ہیں اور تم اس کو کھا کر خوش ہو رہے ہو، ہم آئے ہیں تا کہ تم کو آزادی دلائیں، یہ مسلمان کی اس وقت کی نظر تھی، اور یہ اس وقت کے علمائے ربانی تھے، لوگ ان کے پاس جا کر مادیت کا علاج کراتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی بلا میں مبتلا ہیں اور یہ لوگ کیسا عیش کر رہے ہیں اور کیسی جنت میں رہ رہے ہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مقولہ ہے "الجنة فی صدری" میری جنت میرے سینے کے اندر ہے، اس لئے کہ ان کو اللہ پر بھروسا تھا، وہ کسی چیز سے ڈرتے نہیں تھے، ہر وقت سکر کا غلبہ تھا، نماز میں ان کو لذت اور دعا میں ان کو حلاوت محسوس ہوتی تھی اور ہر وقت جنت ہی جنت میں لوٹتے پوٹتے رہتے تھے، دیکھنے والے دیکھتے تھے وہ دنیا میں ہیں لیکن حقیقت میں وہ جنت الفردوس میں تھے، اور ایک مرتبہ جوش میں آ کر کہا کہ لوگ میرا کیا لے لیں گے مجھ سے کیا چھین لے جائیں

گے، میرے عیش کا سامان تو میرے دل کے اندر ہے، اس کو کون نکال سکتا ہے، بعض عارفوں کا قول سنا ہے کہ ”خدا کی قسم اگر دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم کس عیش میں، کس مزے میں ہیں تو ہم کو بیٹھنے نہ دیں، تلواریں لے کر جس طرح ملکوں پر حملہ کرتے ہیں اسی طرح ہم پر حملہ کریں اور تھوڑی سی جگہ جو ہم نے بنائی ہے، ایک گوشہ میں یا مسجد کے کونے میں، ہمیں یہاں بھی بیٹھنے نہ دیں، سمجھیں کہ یہاں کوئی خزانہ گڑا ہوا ہے یہ جو فرش پر بچھا کر بیٹھا ہے، اتنا مگن ہے کہ اس کو نہ بھوک معلوم ہوتی ہے اور نہ پیاس معلوم ہوتی ہے اس کی جائے نماز کے نیچے ایک سوتا ہے، کنکشن ہے، جہاں سے رزق ملتا ہے، جہاں سے فرحت اُبلتی ہے، تو وہ ہمیں اٹھادیں اس مصلے سے اور ہم سے کہیں کہ جنگل کی راہ لو، اور بیٹھ کر وہاں کھدائی کریں جیسے پٹرول کی کھدائی ہوتی ہے۔

قناعت کا جوہر

حضرات! اصل چیز کا مقابلہ وہ علماء کر سکتے ہیں، جن کے اندر قناعت کا جوہر ہو، جو کسی دام میں نہ تو آسکیں اور کہیں ؎

بردایں دام برمرغِ دگرنہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

جاؤ کسی اور کو آزماؤ ہم بکنے والے نہیں ہیں، ہم سکوں کے عوض یا تمہارے عہدوں کے عوض، کرسی کے عوض، یا عزت کے عوض ہم اپنا ضمیر بیچ ڈالیں، اپنا سکونِ قلب بیچ ڈالیں، یہ نہیں ہوگا، اس کی امید نہ کرو چنانچہ آپ عارفین کو دیکھیں، حضرت مرزا مظہر جاناں شہیدؒ کو بادشاہِ دہلی نے پیغام دیا کہ حضرت مجھے کبھی خدمت کا موقع نہیں دیتے کبھی تو خدمت کا موقع دیں، کبھی تو فرمائش کریں، اور ہزار روپے کی رقم پیش کرنی چاہی تو فرمایا کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”**قل متاع الدنیا قلیل**“ اس دنیا میں سے ایک بر اعظم

ایشا ہے اور اس میں سے ایک ملک ہندوستان ہے، ہندوستان میں سے تھوڑا سا بچا کھچا آپ کے پاس ہے، اب اگر اس میں بھی کمی کردوں جو تھوڑا سا رہ گیا ہے اس میں بھی حصہ بناؤں، یہ میں نہیں کرسکتا، تو انھوں نے بالکل دل سے یہ بات کہی تھی۔ واقعات تو بہت ہیں۔

برہان پور میں ایک بزرگ تھے، ان کے پاس عالمگیر نے جانا شروع کیا وہ فرمانے لگے کہ ایک جگہ میں نے اپنے لئے انتخاب کی تھی، اگر بادشاہ کو وہ بھی پسند آگئی ہے تو میں کہیں اور چلا جاؤں، افسوس ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ان کے اتباع شریعت کا جذبہ، اتباعِ سنت کا جذبہ، ان کی شب بیداری، ان کا قرآن و حدیث سے شغف یہ سب چیزیں تو بالکل منفی ہوگئیں، ان کا ذکر نہیں آتا بقول مصنفِ تاریخ گجرات (مولانا حکیم سید عبدالحیؒ) جس بزرگ کی سوانح پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت توڑنے کے سوا ان کا کوئی محبوب مشغلہ نہیں تھا، اور وہ عناصرِ اربعہ اور موالید ثلاثہ پر ہر وقت اپنی حکومت ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کو مارا، اس کو گرایا، اگر مرا ہوا ہے تو زندہ کردیا، اگر زندہ ہے تو ماردیا، کشتی ڈوب گئی تو اس کو انگلیوں کے اشارے سے نکال دیا۔ ان بزرگوں کی تاریخیں بڑے غلط طریقہ سے لکھی گئی ہیں، یہ حضرات در حقیقت بڑے اہل علم تھے ہوسکتا ہے بعض حضرات سے حدیث کے صحیح نہ پہنچنے یا حدیث کے علم کی کمی کی وجہ سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوگئی ہوں جن کی حدیث سے تائید نہیں ہوتی، لیکن عام طور سے یہ حضرات بڑے اہل علم تھے اور علم کے بغیر کسی کو مسندِ ارشاد پر بٹھا نہیں سکتے تھے۔

میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی:

هو الذى بعث فى الاميين رسولا منهم يتلوا عليهم اياته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة"

یہ ہیں نبوت کے چار شعبے جو اللہ تعالیٰ ان کے نائبین کو بطریقِ نیابت، بطریقِ خلافت عطا فرماتا ہے، ایک تو یہ تلاوت القرآن جس کا آپ نے نمونہ دیکھا کئی قاریوں نے پڑھ کر سنایا اور ہر جلسہ میں سنانے کا رواج ہے اور ہر مدرسہ میں حفظ و تجوید کا انتظام ہے، اور یہ سلسلہ انشاء اللہ تا قیامت رہے گا۔ "انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحٰفظون." اس کے بعد بعض آیتوں میں آتا ہے " یتلوا علیهم ایاته ویعلمهم الکتٰب "، تعلیم کتاب وحکمت کو مقدم کیا ہے اور یہ سیاق وسباق کے مطابق ہے، یہ بڑے اہل نظر کا کام ہے، وہ بتائے گا کہ یہاں کیوں مقدم کیا ہے اور یہاں کیوں موخر کیا ہے، کیا ماحول ہے، سورۃ کا مرکزی نکتہ کیا ہے، یہ تو کام کرنے کا ہے، کتاب کی تعلیم یہ علومِ دینیہ ہیں قرآن وحدیث میں، تفسیر ہے۔

حکمت سے مراد اخلاق

حکمت سے مراد اخلاقِ فاضلہ ہیں جیسا کہ ہمارے استاذ اور اپنے زمانہ کے محقق مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق ہے کہ حکمت کا لفظ جہاں جہاں قرآن میں آیا ہے اس سے مراد اخلاق ہے۔ "ولقد اتینا لقمان الحکمة " اس کے بعد جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اخلاق ہی اخلاق ہے۔ پہلے حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے، پھر اس کی جو انواع بیان کی ہیں، وہ سب اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، سورۂ اسریٰ میں سارے اخلاق بیان کرنے کے بعد فرمایا، ذٰلک مما اوحیٰ الیک ربک من الحکمة (اے پیغمبر یہ ان ہدایتوں میں سے ہیں جو خدا نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں۔ یہاں اخلاق فاضلہ بیان کرنے کے بعد حکمت کا لفظ استعمال ہوا، معلوم ہوا کہ حکمت سے مراد اخلاق ہے، اخلاقِ فاضلہ۔

تزکیہ کے بغیر تعلیم کتاب وحکمت ناقص

اس کے بعد نفس کا تزکیہ آتا ہے، اخلاق رذیلہ کو نکال دیتا ہے، حسد کو، قہر کو دور کرتا ہے، حب دنیا اور حب جاہ کو نکالتا ہے، اس کے بجائے اللہ کی محبت، آخرت کا، جنت کا شوق دل میں بٹھاتا ہے کوئی بھی جامعہ یا دارالعلوم ہو، اس کا مقصد ان فضلاء کو تیار کرنا ہے جو تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ چاروں شعبوں میں انبیاء کرامؑ کی نیابت کا حق ادا کرسکیں تلاوت وحکمت ناقص رہے گی جب تک کہ تزکیہ اس کے ساتھ نہ ہو، یعنی ہمارے علماء نفس کی غلامی کے پھندے سے نکل چکے ہوں، ان کو دولت اور عزت کی بڑی سے بڑی مقدار، اپنے اصولوں سے اپنی دعوت سے اپنے معیار سے، اپنی تعلیم سے، اپنی زندگی کے نہج سے نہ ہٹا سکے۔

آج عرب وعجم میں کسی چیز کی کمی نہیں لیکن اگر کمی ہے..... تو زاہدانہ زندگی اور قناعت کی، آدمی وہاں جھکتا ہے جہاں وہ چیز اس کو ملے جو اس کے پاس نہ ہو، یہ قاعدہ ہے میرے پاس اگر کوئی چیز نہیں ہے تو میں مرعوب ہوں گا، لیکن میرے پاس اگر انیس بیس کے فرق کے ساتھ وہ چیز موجود ہے تو میں مار نہیں کھاؤں گا، میں سر نہیں جھکاؤں گا تو اب جو لوگ مادیت پرست ہیں، مادیت کے زخم خوردہ ہیں، یہ جب علماء کے پاس جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کسی چیز میں بھی یہ ہم سے کم نہیں ہیں اور پھر ان کے گھروں کا نقشہ دیکھتے ہیں، اور ان کے گھروں کی زندگی اور معاشرت دیکھتے ہیں، معیار زندگی دیکھتے ہیں تو متاثر ہونے کے بجائے ان کی بداعتقادی بڑھ جاتی ہے، آج پاکستان میں وہ علماء تیار ہوں جو "یتلو علیھم اٰیاتہ ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکیھم" پر عامل ہوں، جو نبوی وراثت کے حامل ہوں۔ "ان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولا درھما ولکن ورثوا ھذا العلم" عصر حاضر کا چیلنج ہے مادیت اور اس کا جواب ہے۔ مادیت سے بالاتری،

مادیت کی سطح سے بلند ہونا اور یہ ثابت کرنا کہ مادیت ہم کو متاثر نہیں کر سکتی، اور ہم مادیت کے غلام نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم طیبات کو اپنے اوپر حرام کرلیں "**قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده والطيبت من الرزق. ياايها النبي لم تحرم ما احل الله لك.**" جب حضورؐ سے کہہ دیا گیا تو ہم کس شمار میں ہیں ہم مباحات سے پورا فائدہ اٹھائیں، ہم اللہ کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، ہم اگر لذیز کھانا کھا سکتے ہیں تو خواہ مخواہ اس کو بے لذت نہ بنائیں، جیسے بعض بعض غالی صوفیوں کے متعلق سنا کہ سالن میں پانی اوپر سے ڈال دیا تاکہ بے مزہ ہو جائے، پڑوسیوں میں تقسیم کرنے کے لئے نہیں بلکہ بے لذت بنانے کے لئے، یا بہت سا نمک ڈال دیا یا بے نمک کھا رہے ہیں تاکہ کوئی لذت حاصل نہ ہو، یہ تزکیہ اسلام کا تزکیہ نہیں، شریعت اس کی ہمت افزائی نہیں کرتی، آپ کو اگر متوسط درجہ کا خوش ذائقہ کھانا میسر ہے تو ضرور اللہ کا شکر ادا کریں اور ہر لقمہ پر شکر کریں، لیکن ہوس "**هل من مزيد**" جو آج ہر طبقہ میں آگئی ہے، سرمایہ کی کوئی مقدار، عزت کی کوئی مقدار اس کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں ہے اور "**هل من مزيد**" کا نعرہ بلند ہوتا ہے علماء اس سے بالکل ممتاز متمیز اور نمایاں ہوں۔

چند بوریہ نشینوں کی ضرورت

آج پاکستان کو بچانے کے لئے جہاں اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے جن کو کراچی سے اسلام آباد تک اور اسلام آباد سے اس فیصل آباد تک کہتا چلا آرہا ہوں، ان میں سے ایک بڑا عنصر اور ایک بہت بڑی طاقت علماء کی زاہدانہ قناعت والی اور خودداری والی زندگی ہے، علماء ایسی زندگی کا نمونہ پیش کریں کہ یہ معلوم ہو کہ یہ کسی اور ہی طبقہ کے لوگ ہیں، یہ وراثتِ انبیاء کے وارث ہیں، یہ نائبینِ انبیاء ہیں، یہ مادیت کے زخم خوردہ اور اس کے قتیل اور شہید نہیں، جن کے پاس جا کر دنیا کی بے حقیقتی ظاہر ہو اور کم سے کم یہ

معلوم ہو کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہے، جس کو سو بار غرض ہو وہ یہاں آئے، ہم کسی کے دروازے پر نہیں جاتے، اگر جاتے ہیں تو دین کی دعوت لے کر جائیں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے جائیں گے، کسی فریضہ، کسی سنت کے احیاء کے لئے جائیں گے اپنی غرض کے لئے کسی کی سفارش کے لئے نہیں جائیں گے۔

اس خلا کو کوئی چیز پر نہیں کر سکتی

یہ پاکستان کی شدید ترین ضرورت ہے، اس خلاء کو کوئی اور چیز پر نہیں کر سکتی، تصنیف وتالیف، خطابت، تحقیق، سیاست، سحر بیانی، کوئی چیز اس کمی کو پر نہیں کر سکتی، یہاں کچھ آدمی ایسے چاہئیں جن کے پاس طاقت والے، سیاست والے آنے پر مجبور ہوں اور اپنے دردِ دل کی دوا پائیں اور ان کو محسوس ہو کہ خاصانِ خدا کیسے ہوتے ہیں، ہم بالکل بے حقیقت انسان معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تزکیہ واحسان کی اگر آپ کے نزدیک ضرورت نہیں تو اس کی جگہ پر کوئی چیز ایسی ہو جو وہ کام کرے جو وہ کرتی رہی ہے، یعنی جہاں آکر لوگوں کو اپنے اخلاق کی خرابی کا احساس ہو۔ اپنی انسانی پستی، اندورنی بیماری کا کچھ احساس ہو جہاں آکر ایک نئی طاقت، ایک نئی روح آدمی کو حاصل ہو، میں نے عربی شاعر حلیئہ کے اس شعر پر اس مضمون کو ختم کیا تھا

اقلوا علیهم لا ابا لا بیکم
من اللوم أو سُدّ والمکان الذی مقدوا

''بس بہت ملامت ہو چکی، ان کو تم نے بہت مٹی میں ملایا اور بہت ذلیل کیا، اب ملامت کو کم کرو، اس جگہ کو بھرو جس جگہ کو انھوں نے بھر رکھا تھا۔''

آپ ایک ڈاکٹر کا شفا خانہ بند کرتے ہیں تو خدا کے لئے کوئی دوسرا شفا خانہ اس سے بہتر تو قائم کیجئے۔ شفا خانہ تو آپ نے بند کر دیا اور کوئی دوسرا شفا خانہ قائم نہیں کیا اور اس کے بجائے آپ نے سبیل لگادی، اس کے بجائے آپ نے کتب خانہ کھول دیا، کتب خانہ بہت مبارک، لیکن وہ شفا خانہ کی جگہ نہیں لے سکتا، شفا خانہ کی جگہ شفا خانہ ہی لے سکتا ہے، طبیب کی جگہ طبیب ہی لے سکتا ہے، اس زمانہ کا چیلنج ہے مادیت اور اس کا جواب حقیقی، صحیح شرعی، مسنون روحانیت، تزکیہ نفس، جس میں کوئی چیز خلاف شریعت نہ ہو کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی نظیر کتاب وسنت میں اور عہد نبوی اور عہد صحابہ میں نہ مل سکے۔ ایک طرف تو وہ راسخ فی العلم ہوں اور ایک طرف راسخ فی الدین ہوں، بس میں اس پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اس راستہ پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

زبردست چیلنج اور دوررس نتائج
کے حامل خطرات

زیرنظر تقریر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ واسعۃ نے طلبۂ علوم دینیہ اور علماء کرام سے خطاب کرتے ہوئے انہیں مدارس کے مقاصد بڑے اچھے انداز میں سمجھائے ہیں ساتھ ہی موجودہ فتنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے ان کے سمجھنے کی طرف رہنمائی کی ہے، ان فتنوں سے باخبر ہونا اور ان کا موثر و طاقتور زبان اور دلکش اسلوب میں مقابلہ کرنا وقت کا بنیادی تقاضا فرمایا ہے اور ہمارے طلبہ و اساتذہ کرام کو عربی زبان پر مہارت حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور انگریزی زبان میں کمال پیدا کرنے کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے!

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما بعد!

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. "وما کان المومنون لینفروا کافۃ، فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون.

حضرات! اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا قرآن مجید میں مدارس دینیہ کا تذکرہ ہے، کیا ان کے فرائض اور واجبات کا ذکر ہے؟ تو میں کہوں گا کہ قیامت تک کے لئے اس آیت میں مدارس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ اس آیت

میں مدارس کی ذمہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ ''ایسا کیوں نہیں ہوا کہ مومنوں کی ہر جماعت میں سے ایک جماعت دین میں سمجھ پیدا کرنے کیلئے گھروں سے نکل کھڑی ہوتی، تاکہ جب یہ لوگ دین سیکھ کر اور اس میں سمجھ پیدا کر کے اپنے ملک وقوم میں واپس جائیں تو انہیں عصر حاضر کے فتنوں سے ڈرائیں اور باخبر کریں، تاکہ ان کی قوم ان فتنوں سے چوکنا ہو جائے اور ان سے بچنے کی کوشش کرے۔'' حقیقت میں مدارس کا کام یہی ہے کہ وہ ایسے افراد تیار کریں جو اپنے زمانے کے نئے نئے فتنوں اور سازشوں سے واقف ہوں اور ان کے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔

تاریخی خطرات

حضرات! تاریخ کے ایک طالب اور مشرق ومغرب کو قریب سے دیکھنے اور ایک تجربہ کار واقف کار کی حیثیت سے میں عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں دو بڑے عالمگیر خطرات پیدا ہوئے، ایک تو صلیبی حملہ تھا، جس کا مقصد صرف بیت المقدس پر قبضہ کرنا نہ تھا، بلکہ ان کے پیش نظر حرمین شریفین پر قبضہ کرنا بھی تھا، اگر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ کھڑا کیا ہوتا تو خدانخواستہ آج عالم اسلام کا وجود ختم ہو گیا ہوتا۔ ایک مرد غیب پیدا ہوا، اس نے مسلمانوں کی منتشر طاقتوں کو یکجا کیا اور پوری قوت سے صلیبیوں پر ضرب لگائی اور ان کو ایسی شکست دی کہ پھر دوبارہ عالم اسلام پر یورش کی جرات انہیں نہ ہو سکی، اس یورش کے پیچھے کوئی دعوت وتحریک اور فلسفہ نہیں تھا،

دوسرا خطرہ تاتاری یورش کی صورت میں سامنے آیا۔ تاتاری جیسی وحشی قوم نے عالم اسلام پر زبردست حملہ کیا اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ان کا نشانہ اگرچہ عراق، ایران اور ترکستان تھے، اور انھوں نے انہیں پوری طرح تاراج کر کے رکھ دیا تھا، لیکن ان تاتاریوں کی ہیبت اور غیر معمولی دھاک دلوں پر ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ اس زمانہ میں یہ

بات ضرب المثل بن گئی تھی۔ "اذا قیل لک ان التتر قد انهزموا، فلا تصدق۔" (اگر تم سے یہ کہا جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوگئی تو اس بات پر یقین نہ کرنا) اس طرح کہاں عراق وایران اور کہاں انگلستان کا ساحل مورخین نے لکھا ہے کہ تاتاریوں کی ہیبت سے انگلستان کے ساحل پر مچھیرے عرصہ تک شکار کھیلنے نہیں نکلے۔ اس زمانہ میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ عالم اسلام سیاسی و مادی لحاظ سے ختم ہو جائے گا۔ ان کے حملہ کی نوعیت فوجی تھی، جسمانی اعتبار سے مسلمانوں کو قتل کرنا تھا، ان کی اس یورش کے ساتھ کوئی دعوت نہیں تھی اور نہ کوئی فلسفہ اور تحریک اس کے پس پردہ کام کر رہی تھی اور نہ ہی کوئی کلچر اور تہذیب اور ثقافت کو غالب کرنے کا جذبہ ان تاتاریوں کے اندر کار فرما تھا، اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو بھی ختم کرنے کے لئے مصری جنرل الظاہر بیبرس کو کھڑا کیا جس نے تاتاریوں کو شکست فاش دی، اور وہ بے اثر ہو کر رہ گئے، روحانی اعتبار سے بھی اسلام کی دعوت نے اس پوری قوم کو مسخر کرلیا۔

حضرات! لیکن آج کے دور میں جو زبردست چیلنج اور غیر معمولی دور رس اثرات و نتائج کے حامل خطرات ہیں وہ پہلے دو خطرات اور چیلنجوں سے کہیں زیادہ سنگین حد تک مضر اور نقصان دہ ہیں۔ آج جدید تعلیم یافتہ اور حکمراں طبقہ کے دل و دماغ میں یہ بات پوری طرح راسخ کرنے کی کوشش سیاست واقتدار اور صحافت کے ذریعہ کی جارہی ہے کہ آج کے دور میں اسلام کا کوئی کردار نہیں، اس ترقی یافتہ سائنسی دور میں اسلام کا کوئی پیغام نہیں، وہ ایک پرانی یادگار ہے، وہ جدید دور کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کی آج کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے ایک زمانہ میں اچھا کردار ادا کیا تھا، اس نے دختر کشی ختم کردی تھی، علم کو اس نے فروغ دینے میں بڑا رول ادا کیا تھا، قدیم یہودی اور عیسائی مذاہب کی طرح اسلام بھی ایک بے جان مذہب ہے، اس وقت یورپ وامریکہ کی پوری طاقت اسی پر صرف ہو رہی ہے، آج اسرائیل کی موروثی و نسلی ذہانیت وشطارت (چالاکی،

اس میں تخریبی ذہانت بھی شامل ہے) اور امریکی وسائل و ذرائع ، اس کی اعانت اور اثر و نفوذ سب اس بات پر صرف ہو رہے ہیں کہ عالم اسلام کے تمام ممالک حتی کہ حرمین شریفین بھی اس سازش کا شکار ہو جائیں ۔ ان مغربی طاقتوں نے عالم اسلام کے حکمرانوں اور وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ پوری طرح باور کرادیا ہے کہ اس وقت سیکولرازم اور قوم پرستی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے ، مغرب کی مکمل تقلید ہی میں ان کی ترقی اور کامیابی مضمر ہے ۔ یہ اتنا خطرناک اور عالم اسلام کے خلاف اتنی گہری سازش ہے کہ اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ، اس کے دوررس اثرات و نتائج کا اندازہ کرنے سے راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے ۔ نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مادی اثر و نفوذ کو بھی استعمال کیا جا رہا ہے ، ہمارے پاس اس کے دلائل و شواہد ہیں کہ ان تمام سازشوں کا مرکز اسرائیل ہے اور وہی اس کی قیادت کر رہا ہے اس زبردست فتنہ کا مقابلہ مدارس دینیہ ہی کر سکتے ہیں ۔

حضرات ! مدارس دینیہ کا کام اتنا ہی نہیں کہ نصابی کتابیں سمجھ لی جائیں ، اور مسئلے مسائل بتا دیئے جائیں ۔ ہم ان کی ناقدری نہیں کرتے ، اس نظام تعلیم کا ہم احترام کرتے ہیں ، لیکن صرف اتنا کافی نہیں ، موجودہ فتنوں کو سمجھنا ، ان سے اچھی طرح باخبر ہونا اور ان کا موثر و طاقتور زبان اور دلکش اسلوب میں مقابلہ کرنا وقت کا بنیادی تقاضا ہے ۔ ہمارے طلبہ و اساتذہ عربی زبان میں مہارت پیدا کریں جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کر سکے ۔ ہمارے اساتذہ اور طلبہ کا مطالعہ وسیع ، متنوع اور اپٹوڈیٹ ہو ، ندوۃ العلماء نے عرب قوم پرستی کے خلاف جو زبردست محاذ قائم کیا تھا اور اس کے فرزندوں نے جس طرح پوری تیاری اور قوت کے ساتھ طاقتور اور موثر اسلوب میں اس فتنہ پر ضرب کاری لگائی تھی اس کا عام طور پر عالم عربی میں اعتراف کیا گیا ۔

حضرات ! آپ نے طویل سفر کر کے یہاں آنے کی زحمت کی ہے ، آپ نے اتنا

طویل سفر کر کے یہاں آ کر غلطی نہیں کی۔ آپ ایسے مرکز میں آئے ہیں جس نے دین کی خدمت کا ایک گوشہ سنبھال رکھا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ندوی فرزند عرب ممالک کو اپنی طاقتور تحریروں سے متاثر کر سکتے ہیں انہوں نے عرب قومیت کے فتنہ کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی وہ رائیگاں نہیں گئی۔ اس وقت بھی ندوۃ العلماء ایسے محاذ پر کھڑا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے موت وزندگی کا محاذ ہے، اس وقت تمام مغربی طاقتوں کی یہ زبردست کوشش اور سازش ہے کہ اسلام کسی طرح گوشہ نشین ہو کر رہ جائے، وہ قصہ ماضی کی طرح بن جائے۔ زندگی سے سارے رشتے اس کے ختم ہو جائیں۔ اس وقت اس فتنے کے خلاف صف آرا ہونے کی ضرورت ہے، یہ اہم ترین اور مفید ترین محاذ ہے، یہ اسلام کی زندگی اور موت کا محاذ ہے اسی محاذ پر ندوۃ العلماء کھڑا ہے۔

اسی کے لئے ہم سب کو کوشش کرنا چاہئے یہ ہی اس تعلیم کی غرض وغایت ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وعلی آله وصحبه اجمعین

والسلام علیکم

عصر حاضر کا جدید چیلنج اور اہل مدارس کی ذمہ داریاں

زیر نظر تقریر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تشریف لائے ہوئے مدارس اسلامیہ کے ذمہ دار حضرات سے خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی۔ جس میں حضرت موصوف نے عصر حاضر کے جدید چیلنجوں کے سامنے اہل مدارس وارباب مدارس کی کیا ذمہ داری ہونی چاہئے اس پہلو کو خوب اجاگر کیا ہے!

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و خاتم النبین محمد و علیٰ الہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسانٍ ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین ، اما بعد!

حضرات گرامی! یہ ناچیز اپنے اور اپنے رفقائے کار کی طرف سے حضرات ارکانِ انتظامی کا جو اپنا قیمتی وقت نکال کر اور سفر کی زحمت برداشت کر کے اس مجلس انتظامی میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں خیر مقدم کرتا ہے، اس چیدہ اور ممتاز و منتخب مجمع کو دیکھ کر آپ سے اجازت چاہوں گا کہ ادارہ کے انتظامی امور اور مشورہ اور فیصلہ طلب انتظامی وتعلیمی معاملات کے محدود دائرہ سے ذرا ہٹ کر ان حقائق اور حالات کی طرف بھی اشارہ کروں اور آپ کی توجہ منعطف کراؤں جو اس ادارہ کے گرد و پیش اور محل و مقام ہی نہیں ملک وملت کو بھی درپیش ہیں، اور ان سب پر اثر انداز ہیں، اور کوئی ادارہ، تحریک، تنظیم اور

کوئی اکائی (UNIT) یا معاشرہ (SOCIETY) حتی کہ دین وملت بھی ان خارجی اثرات، عوامل و طاقات، خطرات وتحدیات (CHALENGES) سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔

ملت اسلامیہ کے علماء حق کا کارنامہ

حضرات! ہمارے اسلاف کرام اور اپنے وقت کے علمائے عظام نے دین کی تعلیم کے جو ادارے (مدارس دینیہ عربیہ) قائم کئے تھے وہ دراصل اپنے اپنے وقت پر اور اپنی اپنی جگہ پر اسلام کے قلعے تھے اور ان کو انھیں لفظوں اور اسی تعبیر سے یاد کرنا چاہئے۔

ان بالغ نظر اور موفق من اللہ بانیان و موسسین مدارس نے (جن میں سرفہرست اور نمایاں تر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ہیں) اپنی پیش بینی بلکہ فراست ایمانی، اپنے راسخ علم اور گہرے مطالعہ، قوت مشاہدہ اور قیاس واستنتاج کی وہبی صلاحیت سے اپنے ملک و مقام بلکہ گرد و پیش کی دنیا اور رواں دواں زمانے اور تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نہ صرف انقلاب سلطنت بلکہ تمدن وتہذیب، تعلیم وثقافت کی تبدیلی اور سیاسی واقتصادی عوامل کے اثر سے ملت کی نئی نسل کو ذہنی وفکری ارتداد بلکہ (خاکم بدہن) دینی وایمانی ارتداد، انحراف ہی نہیں، تحریف اور دینی حمیت ہی نہیں دین وملت سے انتساب تک سے تبری اور شرمندگی، جہر واعلان سے بچانے کے لئے ایسے مراکز کی ضرورت ہے جہاں علم راسخ اور ایمان راسخ ان پر فخر وشکر اور دین پر ثبات واستقامت ہی نہیں بلکہ ان کی اعلانیہ دعوت و تبلیغ کا مزاج پیدا ہو اور جہاں تک ملی تشخص اور شریعت پر (عقائد واصول سے لے کر تہذیب ومعاشرت اور عائلی زندگی وقانون تک) ان میں استقامت ہی نہیں غیرت و حمیت اور فخر وشکر ہو، اور وہ دین کے ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا تعلق کسی جماعتی عصبیت اور تعلّی سے نہیں کہ ان فضلائے مدارس نے یہ فرض (علی حسن مراتب وتوفیق) کامیابی سے انجام دیا، اوران کی وجہ سے ابھی تک اس برصغیر ہند میں بڑی حد تک ملی تشخص اور اعتقادی، فکری، تہذیبی اور اخلاقی امتیاز پایا جاتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ ایک بڑے دائرہ میں اس کے عقائد محفوظ ہیں، دین کے فرائض وارکان زندہ ہیں، مسجدیں آباد ہیں اور مرکز اسلام جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس سے حج وعمرہ کے ذریعہ، محبت وعقیدت کے ذریعہ (اور ایک خاصہ دائرہ میں) عربی زبان اور علوم دینیہ کے ذریعہ رابطہ قائم ہے۔

ان دینی قائدین، اہل غیرت وحمیت مسلمانوں اور علماء ودینی رہنماؤں نے اپنے اس دینی جذبہ، ملی غیرت، اور دینی فراست اور پیش بینی کو ہندوستان ہی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس سے عالم اسلام کے وسیع دائرہ میں بھی کام لیا، اس سلسلہ میں تحریک خلافت، ترکوں کی حمایت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کی حفاظت تک ان کی سعی، دلچسپی اور سرگرمی محدود نہیں تھی، اس کا تفصیل سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی تاریخ بہت کچھ محفوظ ہے اور جو حضرات یہاں تشریف رکھتے ہیں ان میں سے بہت سے اس کے شاہد عینی اور معاصر رہ چکے ہیں، اور بہت سے حضرات نے اس کو علی سبیل التواتر سنا ہے اور وہ اس کی طاقت اور ہمہ گیری سے واقف ہیں۔

علماء حق کے کارنامے

لیکن یہ بات بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ نہیں ہوگی کہ ہندوستان کے علماء اور مدارس کے فضلاء نے علمی وفکری اور تصنیفی طور پر بھی ہندوستان اور بیرون ہند میں اٹھنے والے صلیبی حملوں اور تشکیکی وانتشار انگیز لٹریچر کا ایسا مقابلہ کیا جس کو خاص مسلمان اکثریت کے ملکوں اور علمی ودینی مرکزوں میں بھی جہاں صدیوں کی پرانی اور عالمگیر شہرت

رکھنے والی جامعات اور تصنیفی مراکز قائم ہیں اعتراف کیا، اس سلسلہ میں ہم ان نادرہ روزگار تصنیفات کا تذکرہ نہیں کریں گے جو ہندوستان کے اسلامی عہد میں وجود میں آئیں اور فضلائے عرب بلکہ ائمہ فن نے بھی ان کی انفرادیت اور بے نظیری کا اعتراف کیا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا کارنامہ

ان میں ایک حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (م ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۱ء) کی بے نظیر کتاب ''اظہار حق'' ہے جس میں اناجیل اور مذہب عیسوی پر ایسی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے جو ریاضی کے نتائج کی طرح (کہ دو دو چار ہی ہوتے ہیں اور چار چار آٹھ ہی ہوتے ہیں) اناجیل کے بیانات میں تضاد و تناقص ثابت کیا ہے جن کا جواب اب تک مسیحی دنیا اور کلیسا کے فضلا نہیں دے سکے، راقم نے خود انگلستان سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار میں پڑھا کہ ''جب تک اس کتاب کی طبع واشاعت کا کام جاری رہے گا عیسائیت کی تبلیغ نہیں ہو سکے گی۔''

دوسرا کارنامہ مولانا شبلی نعمانی کا ہے کہ جب مشہور مصری مسیحی فاضل مورخ وادیب جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی نکلی جس میں اسلامی تمدن پر ایسے محتاط اور سلیقہ مندانہ طریقہ پر حملے کئے گئے تھے جن سے پڑھنے والوں کا ذہن اسلام کے دین حق ہونے اور زندگی کا بہترین ڈھانچہ دینے کی صلاحیت سے محروم نظر آنے لگتا ہے، مولانا شبلی علیہ الرحمہ نے اس کا بڑی قابلیت اور سلیقہ مندی سے جواب دیا اور کتاب ''الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' کے نام سے شائع ہوئی جس کی داد فضلائے عرب حتی کہ علامہ سید رشید رضا مرحوم نے بھی دی۔

ان مدافعانہ اور جوابی علمی کوششوں کے علاوہ ہندوستان کے فضلاء اور محققین کے اور

متعدد علمی کارنامے اور تحقیقی و تقابلی مطالعہ کے نمونے ہیں جن کی مثال عالم عربی میں بھی ملنی مشکل ہے، ہم یہاں پر چند کتابوں کے نام پیش کرتے ہیں:

مولانا شبلی کی ''الجزیۃ فی الاسلام'' مولانا سید سلیمان ندوی کی ''خطبات مدراس'' اور ''ارض القرآن'' مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی انگریزی اردو ترجمہ اور تفسیر جن میں جدید ترین معلومات وتحقیقات کی روشنی میں قرآن کا اعجاز اور صحف سماویہ پر تفوق ثابت کیا گیا ہے، ایسے ہی ان کی کتاب مشکلات القرآن، مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب ''مذہب وعقیدت'' وغیرہ۔

اب اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ علمائے ہند وفضلائے مدارس نے کبھی بیرونی اسلامی ممالک سے آنکھیں بند نہیں کیں، وہاں اٹھنے والے فتنوں، تشکیکی حملوں اور الحاد و لادینیت اور ''قومیت عربیہ'' کی خطرناک اور بعید نتائج رکھنے والی مخالف اسلام دعوت کو نظر انداز نہیں کیا، اس سلسلہ میں (معذرت کے ساتھ) لیکن اضطراراً اور ضرورتاً یہ عرض کیا جاتا ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزندوں اور فضلاء نے ہمیشہ ان بیرونی فتنوں کا نوٹس لیا، جو مرکز اسلام میں ارتیاب اور تزلزل پیدا کرنے والے بلکہ نصرانیت، یہودیت اور لادینیت کے لئے راستہ کھولنے والے تھے، اس سلسلہ میں ندوہ سے نکلنے والے رسالے ''البعث الاسلامی'' اور ''الرائد'' کو فراموش اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جن سے سلیم الطبع، اسلام پسند عرب بڑے متاثر ہوئے ہیں، پھر مرحوم عزیز القدر محمد الحسنی کے رسائل اور کتابیں جن میں ''اسلام الممتحن'' اور ''الاسلام بین الانعم'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن میں سے بعض کتابوں کو پڑھتے ہوئے راقم نے بعض عرب فضلا اور قائدین کو اشکبار اور تر دیدہ دیکھا ہے، اسی مقصد کے لئے مئی ۱۹۹۵ء میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں قائم ہوئی اور اس نے عربی، انگریزی، ہندی اور اردو میں وہ لٹریچر شائع کیا جو بہت موثر اور اسلام کے بارہ میں غیر مسلموں

کے دل میں وقعت و احترام پیدا کرنے والا ثابت ہوا، ابھی حال میں خاکسار نے ان دعوتی رسائل وخطبات کا جائزہ لیا جو عربی میں لکھے گئے تھے تو ان کی تعداد بہتر نکلی، جن میں بہت سے ممالک عربیہ میں بھی شائع ہوئے ہیں، اور شوق سے پڑھے گئے ہیں۔

اب اس تاریخی جائزہ اور علمائے اور فضلائے مدارس کی وسیع ذمہ داریوں اور کوششوں کے پس منظر اور روشنی میں مقتدر اراکین کی خدمت میں ان چند الحادی و ارتدادی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مغرب میں اسلامی ممالک کو عمومیت کے ساتھ اور ممالک عربیہ کو (جن کو قیامت تک کے لئے دین کا منبع اور ہادی بنایا گیا ہے) نہ صرف اسلامی ودینی حمیت وعزت سے محروم کرنے بلکہ اسلام سے انتساب تک کے منکر ہونے اور اس کی تحقیر وتذلیل کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے شروع کی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی حقیقت کا (جو انکشاف کا درجہ نہیں رکھتی بلکہ اب مشاہدہ اور حد تواتر تک پہنچ گئی ہے) ذکر کیا جاتا ہے، وفی ذلک عبرۃ لاولی الابصار۔

واقعہ یہ ہے کہ یہودی دماغ اور ذکاوت (جس کو عربی میں شطارت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور مسیحی طاقت واقتدار اور وسائل واثرات، دونوں اس وقت اسلام کی بیخ کنی اور اس سے ہمیشہ کے لئے چھٹی پانے کی کوشش میں ہمنوا اور دمساز بن گئے ہیں۔

یہودی پلاننگ

یہودی صدیوں پہلے سے دنیا کو شطرنج کی ایک ایسی بساط بنانا چاہتے ہیں جو بالکل ان کے قابو میں ہو اور جس مہرہ کو چاہیں وہ کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ سکیں، اور ان کی کتابوں صحف تلمود اور ''برتو کولات حکماء صیہون'' میں اس کی تصریحات موجود ہیں، اور وہ اس مقصد کو اخلاقی پستی بے ضمیری اور نفس پرستی پیدا کر کے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے وہ فلسطین میں اسرائیل کی حکومت قائم کر کے اب

مشترک و متحد طریقہ پر اس مقصد کے حصول میں شریک ہیں یہاں پر صرف ایک امریکی فاضل ہمویل زویمر ZWEMER (۱۹۵۲ء) کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو ان کی اس تقریر سے ماخوذ ہے جو مسیحی مبلغین کی کانفرنس میں انھوں نے کی تھی۔

''ہر میدان عمل میں ہماری سرگرمیاں ایسی ہونی چاہئیں کہ جن کا اصل نشانہ نوخیز مسلم نسل ہو اور جو مسلمانوں کے باہمی روابط میں انتشار پیدا کردے تاکہ ان کارروائیوں کے شکنجہ میں مسلمان جکڑ کر رہ جائیں اور ہماری یہ کوششیں انھیں لخت لخت اور پارہ پارہ کردیں، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی ممالک میں اس عمل کو دیگر امور پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ اس نسل جدید کے سینوں میں اسلام کی روح پیدا ہو گئی تو اسلام ایک بار پھر اپنے عنفوان شباب کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوگا، لہٰذا اس نازک صورت حال میں ضروری ہے کہ نوخیز مسلم نسل کو اس کے نقط اعتقاد وارتکاز سے بعید و بےگانہ بنادیا جائے، قبل اس کے کہ اس کی عقلی وفکری بالیدگی تکمیل کے مرحلہ میں داخل ہو۔''

حضرات! ان کوششوں کے نتائج ترقی یافتہ ممالک عربیہ میں ظاہر ہو گئے ہیں اور آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں، ان کا اولین اثر یہ ہے کہ دین کی حمیت اور اسلام پر افتخار جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کمزور و نادر اور صاحب اقتدار طبقہ میں معدوم و مفقود ہے، لادینیت، تشکک وارتیاب، مغربی تہذیب واقتدار سے تنفر اور جذبہ جہاد اور شوق شہادت تو بڑی چیزیں ہیں ان عربی ملکوں میں تو اب ان چیزوں سے استنکاف اور مغربی تہذیب و اقتدار سے بیزاری اور ان سے آزاد ہونے کی سعی و جہد بھی ختم ہوتی جارہی ہے حکومت کا رخ آزادی ولامذہبیت (SECULARISM) کی طرف ہوتا جارہا ہے، قرآن مجید کا اعجاز تھا

کہ اس نے سورہ فاتحہ ہی میں جو ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے شدید اعتقادی تناقض و تضاد کے باوجود (جو یہودیوں اور عیسائیوں میں پایا جاتا ہے) دونوں کا نام ساتھ لیا ہے اور دونوں کے اثر سے بچنے کی طرف اشارہ کیا ہے، **صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لا الضالین.**

بعض عرب ملکوں میں جن میں (تونس والجزائر پیش پیش ہیں) دین اور اہل دین سے کھلی محاذ آرائی اور دوسرے ترقی یافتہ عرب ملکوں میں صاحب اقتدار طبقے اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایسے حالات دیکھنے میں اور ایسے اقوال سننے میں آنے لگے ہیں جن سے پیشانی پر پسینہ ہی نہیں آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں ابھی حال میں دارالعلوم کے ایک استاد ایک تعلیمی اجلاس **رابطہ الجامعات الاسلامیۃ** کے اجلاس میں شرکت کے لئے راقم کے نمائندہ بن کر گئے تھے انھوں نے اپنے سفر کی جو روداد پیش کی ہے اس کو پڑھ کر خاص طور پر جو مصر کی تاریخ سے واقف ہے یا وہاں جا چکا ہے اور کچھ عرصہ رہ چکا ہے اندوہگین اور لرزہ براندام ہو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہاں اور دوسرے عرب ملکوں میں بھی اس کا ردعمل پایا جاتا ہے۔ اسلامی اور دعوتی کتابیں کثرت سے مقبول ہو رہی ہیں، انبیاء کے قصد کی کتاب گھروں میں کثرت سے پڑھائی جاتی ہے ان سب کے پیش نظر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے البتہ دعوتی جدوجہد، فکری انقلاب کی کوشش اور اسلام کی ابدیت اور ہر زمانہ میں اس کی ضرورت پر اعتماد پیدا کرنے کے لئے علمی و دعوتی لٹریچر پیدا کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے۔

عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کی اشد ضرورت

اس صورت حال کو جو سخت دل خراش اور باعث شرم ہے اتنی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ ہمارے مدارس عربیہ میں جس کے متعدد ذمہ دار اور

سر پرست یہاں موجود ہیں عربی زبان کی تعلیم کو اس معیار پر پہنچانے کی ضرورت ہے کہ ممالک عربیہ اور ترقی یافتہ اسلامی ممالک میں خطابۃ اور کتابۃ دعوت کا کام کرسکیں اور وہ عرب نوجوانوں اور فضلائے اہل وفکر و اہل قلم کو بلکہ صاحب اختیار طبقہ کو بھی متاثر کر سکیں، ہمارے عربی مدارس کے ذمہ داروں کو اس مسئلہ پر سنجیدگی پر غور کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے کہ اب یہ ناپسندیدہ اثرات خلیج کی ریاستوں، کویت، بحرین وغیرہ اور کسی حد تک (خاکم بدہن) سعودی عرب میں بھی پہنچ رہے ہیں۔

دوسرا محاذ جس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے فضلاء کو تیار ہونا اور رہنا چاہئے وہ ہندو احیائیت (HINDU REVIUALISM) کی زبردست تحریک ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مختصر لفظوں میں اس ملک کو اسپین بنا دیا جائے جہاں صرف نسلی حیثیت سے مسلمان رہیں باقی ان کی تہذیب و معاشرت اور عائلی قانون، اور ہو سکے تو اعتقادی سانچہ بھی بدل دیا جائے اور وہ کسی مرحلے پر پہنچ کر ہندو دیو مالا (HINDU MITHALOGY) کو قبول کرلیں اس کے لئے نصاب تعلیم ذرائع ابلاغ اور سیاسی اثرات سے بھی کام لیا جارہا ہے اور اس کے اثرات بھی نظر آنے لگے ہیں۔

دوسرا کارنامہ

پہلے پرسنل لا میں مداخلت کے لئے اقدام کیا گیا تھا اور بعض خلاف شرع اور منافی شرع عدالتی فیصلے کئے گئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ امیر شریعت بہار و فرزند مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے درجے بلند فرمائے کہ انھوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کر کے اور ایک ہند گیر مہم چلا کر اس خطرہ کا فی الحال سد باب کر دیا، لیکن ابھی حال میں یونیفارم سول کوڈ کا شگوفہ چھوڑا گیا خدا کا شکر ہے کہ اس کی بھی ملت اسلامیہ ہندیہ نے بالعموم اجتماعی طور پر مخالفت کی اور امید ہے کہ انشاء اللہ وہ عمل میں نہ آ

سکے گا۔

ان سب حقائق، واقعات، خطرات اور انذارات کو سامنے رکھ کر آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے مدارس عربیہ و دینیہ میں ان حقائق و خطرات کو سامنے لانے اور مدارس کے فضلاء کو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار اور سرگرم بنانے کی ضرورت ہے، ندوۃ العلماء (جو انھیں حقائق و خطرات کے شعور و علم اور ان کا مقابلہ کرنے کے عزم کے نتیجہ میں وجود میں آیا) مجلس انتظامی میں جس میں منتخب و ممتاز علماء و دانشور شریک ہیں پیش کرنے کی جرات کی گئی جس کے لئے معافی بھی چاہی جاتی ہے اور توجہ و حسن استماع کا شکریہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔

وما النصر الا من عند الله.

وما علينا الا البلاغ المبين

عالم اسلام کا سب سے اہم مسئلہ

ذیل میں ہم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی وہ فکر انگیز، بصیرت افروز، چشم کشا تقریر پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔ جو مولانا رحمہ اللہ نے ۱۶ جولائی ۱۹۹۵ء کو دارالعلوم میں مجلس شوریٰ کے موقع پر علماء، مفکرین اور دیگر بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات کی موجودگی میں طلباء دارالعلوم کی انجمن میں طلبہ کی دعوت پر جمالیہ ہال میں فرمائی تھی اس تقریر میں ایک اہم خطرہ کی طرف نشاندہی کی گئی ہے علماء، مفکرین نیز جدید تعلیم یافتہ حضرات کو غور و فکر کے ساتھ پڑھنے کے بارے میں ہم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زبان میں بس اتنا ہی کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ رب کریم پڑھنے والوں کو

؎ دل انا دل بینا دلِ شنوا دیدے

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين وخاتم النبين محمد وآله وصحبه اجمعين ومن تبعهم باحسان ودعا بدعوتهم الىٰ يوم الدين . اما بعد . فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم. ووصى بها ابراهيم بنيه ويعقوب يبنى ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الا وانتم مسلمون.

میرے مکرم احباب، مہمانان کرام اور طلباء عزیز! میں اس وقت ایسے جسمانی عوارض اور ذہنی مشغولیتوں اور تفکرات اور بعض ایسی کشمکش کی چیزوں میں مبتلاء تھا کہ میرے لئے

مناسب تھا کہ میں معذرت کر دیتا کہ یہ اپنا گھر ہے کسی وقت بھی خطاب ہوسکتا ہے طلبہ بھی یہیں ہیں لیکن میں نے اس وقت وعدہ کر لیا تھا اور موضوع کی اہمیت بھی ایسی تھی کہ اس بارے میں کچھ کہوں ، میں آپ سے بے تکلف اس وقت بات کرنا چاہتا ہوں ، میرے سامنے عزیز نوجوان طلبہ ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے حلقے اور میرے ماحول اور گرد وپیش کے لوگوں میں بہت کم لوگوں کو ایسا موقع ملا ہوگا، دنیا کی سیاحت خاص طور پر عالم اسلام کی سیاحت کا جو اس ناچیز کو ملا ، یہ فخر کی بات نہیں ایک آزمائش کی بات تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی اور تقدیری سامان تھا کہ جہاں تک عالم اسلام کا تعلق ہے مراکش سے لے کر اور اسپین کو اگر شامل کیا جائے تو وہ بھی بہت بڑا اسلامی تہذیب کا مرکز رہا ہے وہاں بھی جانا ہوا اور اسپین سے لے کر یہاں جنوبی ایشیا کے مسلم ممالک تک مجھے جانا ہوا۔ عرب ممالک میں سے کوئی اہم ملک چھوٹا نہیں، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب فراہم کئے کہ مجھے یورپ کے سفروں کا اور یورپ کو بہت قریب سے دیکھنے کا اور وہاں بار بار جانے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ، فرانس ، جرمنی اور ترکی، سوئزرلینڈ بھی گیا، آخر میں روس جانا ہوا اس کے علاوہ جہاں تک عربی اور اسلامی ممالک کا تعلق ہے وہاں صرف جانا ہی نہیں بلکہ رہنا بھی ہوا، بعض جگہ کئی کئی مہینے رہنا ہوا اور وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر صنف اور ہر ذوق اور ہر فن کے لوگوں سے ملنا ہوا، ان میں بڑے بڑے دانشور بھی تھے، ادیب تھے، مصنف بھی تھے اور مفکر بھی تھے، قائد بھی تھے، انشاء پرداز بھی تھے، صحافی بھی تھے، سب سے ملنا ہوا۔

خاص طور پر مصر میں جو کہ عالم عربی کے لئے وہ درجہ رکھتا ہے جو کبھی ولایت کا درجہ تھا ہندوستان میں جب اسلامی حکومت تھی تو ولایت ، افغانستان اور ایران وغیرہ کو کہتے تھے اور شمالی ہندوستان اور اس کے بعد انگریز ہندوستان میں آگئے تو ولایت انگلستان کو کہتے تھے تو وہ (مصر) بھی صرف عالم عربی کے لئے ایک رہنما اور ایک معلم، مربی مفکر اور ایک

نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے وہاں ہفتوں نہیں مہینوں رہنا ہوا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس وقت عالم اسلام کا سب سے اہم مسئلہ، سب سے نازک مسئلہ، سب سے فکر اور آزمائش کا، کفر وتردد کا مسئلہ، اور سب سے زیادہ قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ عالم اسلام کی فکری، علمی، تصنیفی، اخلاقی اور اخیر میں سیاسی قیادت اس طبقے کے ہاتھ میں آگئی ہے کہ جو اسلام کی ابدیت کا تقریباً منکر ہے، اور اسلام کے بارے میں وہ صرف احساس کمتری ہی میں مبتلا نہیں بلکہ مایوس ہے اور اس کے دل میں یہ احساس بیٹھ گیا ہے، اور اس نے ایک فکر اور ایک فلسفہ اور دعوت کی حیثیت اختیار کر لی ہے اسلام اس زمانے میں، اس جدید دور میں، اس ترقی یافتہ دور میں قیادت کی صلاحیت نہیں رکھتا، یہ ایک تعصب کی بات ہے اور ایک قدامت پرستی کی بات ہے کہ دیندار طبقہ بار بار مطالبہ کرتا ہے، احکام شرعی کے نفاذ کا اور تنقید کرتا ہے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر، اور وہ مطمئن نہیں ہے زندگی سے، ورنہ اصل یہ ہے کہ اسلام اپنا کام ختم کر چکا ہے، اس کی تاریخ جنہوں نے پڑھی ہے اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا، دنیا اس وقت بہت ہی پسماندہ تھی اور برسر انحطاط نہیں بلکہ برسرِ تنزل بھی نہیں بلکہ وہ بالکل ایک رکاکت ذہنی و عقلی اور تسفل کی حالت میں تھی۔ جس کو اسلام نے اور قرآن مجید کے اعجاز نے قرآن مجید کی بلیغ زبان نے جس سے زیادہ بلیغ زبان ہو نہیں سکتی، جاہلیت کا نام دیا ہے، اور عربی زبان ہی نہیں کسی زبان کو کھنگالیے، میں ایک عربی زبان کے طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں، مختلف زبانوں سے جو آشنائی رکھتا ہے ان سے کچھ اس کا اشتغال رہا ہے کہ بڑے بڑے ادباء بھی دنیا کے جمع ہو جائیں تو اس کے لئے جاہلیت سے زیادہ بلیغ، وسیع، عمیق، کثیر المعانی اور اس سے زیادہ صحیح تعبیر کرنے والا لفظ ملے گا نہیں۔

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے، کہ اس نے اس کو عہد جاہلیت سے تعبیر کیا ہے تو جب جاہلیت کا دور تھا، دنیا میں اس وقت اسلام آیا، اور اس نے مفید کام کیا، اس نے کچھ انسانیت کی

خدمت کی، کچھ ایسے غلط کام ہو رہے تھے، انسانیت خودکشی پر آمادہ تھی اس نے اس کو خودکشی سے بچایا، لڑکیوں کو دفن کرنے والی عادت سے، جاہلیت کی رسم سے بچایا، عورتوں کو کچھ حقوق دلائے، کچھ مساوات کا سبق پڑھایا اور کچھ اخلاق کی تعلیم دی اور توحید کا بھی پیغام دیا اور توحید کا قائل بنایا، اسلام نے اپنا کام ختم کرلیا وہ تاریخ کی نظر میں اور حقیقت پسندوں کی نظر میں قابلِ تعریف بلکہ مستحق شکر ہے یہاں تک تو وہ طبقہ مانتا ہے۔ لیکن اب اس ترقی یافتہ دور میں جب سائنس ٹیکنالوجی اور پولیٹکس اور ممالک کے باہمی تعلقات اور پھر اس کے ساتھ ساتھ انسانی دماغ اور پھر آلات ان انسانوں کو نئے عقائد تک پہنچانے میں معاون ہیں، خواہ سائنس کی کتنی شاخیں ہوں سب اس میں شامل ہیں، کیمسٹری تک شامل ہے، ٹیکنالوجی کی کتنی شاخیں ہوں سب کچھ شامل ہے، ان کی ترقی کے بعد اب اسلام کے لئے منصبِ قیادت پر فائز ہونے اور اس ترقی یافتہ زمانے کی رہنمائی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ بہت ہی افسردہ اور ایک تعجب کی بات ہے جو کہی جا رہی ہے یہ میں آپ کو بتاتا ہوں کوئی راز نہیں ہے یہ عالم آشکار حقیقت ہے کہ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پورے عالم اسلام کی فکری، اخلاقی اور آخری درجے میں سیاسی اور انتظامی قیادت بھی خود مسلمانوں کے اس طبقے کے ہاتھ میں آگئی ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس ہے اور اسلام کو اس زمانے میں رہنمائی کے قابل نہیں سمجھتا اور وہ یورپ کی ترقیات اور یورپ کے علوم وفنون اور یورپین مصنفین کی کتابوں سے اور ان کی تصنیفات اور تحقیقات سے اور ان کے ذرائع ابلاغ سے جن چیزوں کو نشر کرتے رہتے ہیں ان سے اتنا متاثر ہے کہ جیسے کوئی کسی چیز پر ایمان لاتا ہے وہ اس پر ایمان لے آیا ہے اور وہ ایمان کچھ متزلزل نہیں ہوتا ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں اور یہ اس وقت بہت بڑی چال (حکمت) تھی، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے جب یورپ نے مشرق میں اپنا اقتدار قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور ممالک فتح کرنا شروع کئے، تو ان کے دانشوروں نے یہ

ضروری سمجھا کہ ایک طبقہ ایسا ہونا چاہئے جو ہراول دستے کا کام دے اور وہ جن ملکوں پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں اس ملک کے ذہین Intellectual Class جو اثر انداز ہوتا ہے اور زندگی کو ڈھالتا ہے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے اور دماغوں کو ڈھالتا ہے وہ اس میں اپنے دین کے بارے میں، اپنے دین کے مآخذ کے بارے میں شک کا شکار ہو جائے اور وہ ان کے بارے میں احساسِ کمتری کا شکار ہو کہ ان لوگوں نے بہت ہی پسماندہ دور میں بہت کام کیا تھا، کوشش کی تھی اور کوشش جاری ہے، اب ان کتابوں کی تصنیفات کی شکل میں۔

لیکن وہ اس وقت دنیا کی رہبری نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے مستشرقین کا ایک طبقہ پیدا کیا، بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔ یہ محض اتفاقی واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک اسکیم کے ماتحت ہوا، یہ ایک پلاننگ تھی نہایت حکیمانہ اور دانشورانہ پلاننگ تھی ایک طرف تو ان کی فوجیں مشرقی ملکوں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور ملک فتح کر رہی تھیں لیکن وہ جانتے تھے کہ ملک فتح ہونے کے ساتھ اگر دماغ فتح نہ ہو، اور اگر وہ انسان کے پیمانوں کو تعین کرنے کی جو صلاحیت ہے کہ یہ اچھا ہے یہ برا ہے، یہ بلند ہے یہ پست ہے، اور یہ قدیم ہے یہ جدید ہے، اور یہ قابل عمل ہے اور یہ نا قابلِ عمل ہے، جب تک اس میں اس کے بارے میں وہ ہمنوا نہ ہو جائے اس وقت تک کسی سیاسی فتح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے اور یہ ان کی ذہانت کی بات تھی کہ ساتھ ساتھ مستشرقین کے ذریعے اور اپنے ہاتھوں کے مصنفین کے ذریعہ وہ لٹریچر پیدا کیا جس کے پڑھنے سے اسلام کے بارے میں، اسلامی تعلیمات کے بارے میں، اسلامی ثقافت کے بارے میں، قرآن مجید کے اعجاز اور قرآن کے کلام اللہ اور وحی الٰہی ہونے کے بارے میں شکوک پیدا کر دے، اضطراب پیدا کر دے اور کم از کم ایک ندامت کا جذبہ اور خجالت کا احساس پیدا کر دے، وہ فتح نا قابلِ اعتبار ہے جس کے ساتھ دماغی فتح نہ ہو اور جس کے ساتھ ذہنی تسخیر نہ ہو، میں تسخیر کا لفظ خاص طور پر بولتا ہوں، تو

آج سارے عالم کا جو اصل مسئلہ ہے اور اس کی طرف بہت کم لوگوں کو توجہ ہے، میں بہت معذرت کے ساتھ کہتا ہوں، ہمارے بڑے بڑے دعوتی اداروں کو تنظیموں اور تحریکوں کو بھی پورے طور پر اس مسئلہ کی سنگینی کا احساس نہیں کہ اس وقت سب سے بڑا جو ارتداد کا سامان ہے وہ یہ کہ عالم اسلام کے ترقی یافتہ ممالک کی قیادت اس طبقے کے ہاتھ میں ہے جو اسلام کی قیادت کی صلاحیت سے مایوس ہے، اور اس کو اس زمانے کے مسائل کا حل نہیں سمجھتا، اس زمانے کے تقاضوں اور ضروریات کا حل نہیں سمجھتا اور وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ جو قیادت اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہوگی اور جو فرائض پر پابندی کرائے گی اور ایمانیات پر اصرار کرے گی، اس پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ قیادت چل نہیں سکتی۔

پشت پناہ طاقت

اور اب آگے اضافہ یہ ہوا ہے کہ اس کو امریکہ اور اسرائیل چلنے بھی نہیں دیں گے، پہلے صرف اتنا تھا کہ ان کے اندر احساس کمتری خود موجود تھا، اپنے اپنے ملکوں میں اور تعلیم یافتہ طبقوں میں، لیکن اب اسے بہت بڑی پشت پناہ طاقت مل گئی ہے بلکہ سرپرست طاقت مل گئی ہے وہ ہے اسرائیل اور امریکہ، یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے اور ہم نے یہ بات عربوں کے اجتماع میں اور رابطہ عالم اسلامی کے مؤقرترین جلسے میں جس میں ممتازترین فضلاء موجود تھے، یہ بات کھل کر کہی کہ اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسرائیل اور امریکہ دونوں متحد ہو گئے ہیں جن کے اندر مذہبی طور پر سب سے بڑا تضاد ہے کہ ایک حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ مانتا ہے اور ایک ان کے نسب اور ان کی شرافت پر الزام لگاتا ہے تہمتیں لگاتا ہے، یہ دونوں اس نقطے پر متحد ہو گئے ہیں کہ دنیا سے اسلام جو نئی نسل کو کھینچ لیتا ہے اور جس اسلام کو امریکہ اور یورپ میں بھی لوگ قبول کرتے ہیں اور قبول کر رہے ہیں ان کی تعداد بڑھ رہی ہے اس کو کسی طریقہ سے ختم کیا جائے، جہاں تک

یہود کا تعلق ہے انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس وقت اگر مغربی اقتدار کو خطرہ ہے تو صرف مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے ہے اور اسلام کے عروج اور نئی بیداری سے ہے اور کسی سے نہیں۔ ان کے صحیفوں کا ہمارا براہ راست مطالعہ ہے اس میں صاف صاف یہ تصریحات دیکھی جا سکتی ہیں کہ دنیا کو اخلاقی طور پر اتنا پست بنا دیا جائے اور دیوالیہ بنا دیا جائے یہاں تک (Eunifourd) کی کتاب جو انگریزی میں نکلتی تھی۔ یہودیوں نے اس کو چلنے نہیں دیا، اس میں صاف صاف تھا کہ ناولوں کے ذریعہ، سینما کے ذریعہ، ٹی وی کے ذریعہ، نغموں کے ذریعہ، ہر ذریعے سے انسانی اخلاق کو یعنی انسانی (Character) کو، یعنی ایک انسان کو جو ایک کردار عطا ہوا ہے فطرت کی طرف سے بہر حال اس میں خیر وشر کی جو تمیز اللہ تعالیٰ نے فطرتاً رکھی ہے اس کو ختم کر دیا جائے اور پوری دنیا کو ایسا بنا دیا جائے کہ جیسے شطرنج کی ایک بساط ہوتی ہے جو اس میں ہے ہمارے قبضے میں ہو، ہم جس مہرہ کو جہاں چاہیں اٹھائیں اور جہاں چاہیں بٹھائیں، اس پر اس وقت اسرائیل اور امریکہ کا ایسا اتحاد ہوا ہے جو اب راز کی بات نہیں رہی اور یہ حقیقت بالکل عیاں ہو گئی ہے۔

تو اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ طبقہ جس کے ہاتھ میں نہ صرف سیاسی قیادت ہے، سیاسی قیادت اپنے اندر وہ نتائج اور مضمرات رکھتی ہے، وہ اثرات رکھتی ہے جو کسی چیز میں نہیں ہے۔ اس لئے اس کو مذاہب تک نے اہمیت دی ہے اور اس کے لئے خلافت اسلامی کا نظام بتایا گیا ہے اور اس کے لئے مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے وہ نسلِ انسانی کی رہبری قبول کرے، اور وہ قانون بنائے اور اس کو خدا کے بتائے ہوئے اور رسول ﷺ کے سکھائے ہوئے راستے پر چلائے، تو بہر حال سیاسی اقتدار محض دو لفظ نہیں کہ جو چیز بار بار کہی جاتی ہے اس کا وزن کم ہو جاتا ہے، جن لوگوں کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار ہے پھر اس کے بعد وہ جن کے ہاتھ میں فکری اقتدار ہے اور ذہنی اقتدار ہے، ذہن کی تشکیل کا سامان ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ طبقہ تقریباً کہا جا سکتا ہے

کہ نوے فیصد نہیں شاید ۹۵ فیصد وہ اسلام کی افضلیت سے اسلام کا واحد اور صحیح اور صادق مذہب ہونے سے اور اسلام ہی کے ذریعہ نجات اور دنیا کی زندگی میں سلامتی کا ذریعہ، اعتدال کا ذریعہ اور امن وامان کا ذریعہ اور اتفاق کا ذریعہ ہونے کا منکر ہے، ہوسکتا ہے بہت سے لوگوں کے لئے ایک انکشاف ہولیکن یہ بات علی وجہ البصیرۃ کہہ رہا ہوں اس کی تہہ میں اگر آپ جائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی یونیورسٹیوں اور ان کے کورس کو یہاں تک گھر کے ماحول کو بھی اتنا دخل نہیں جتنا ان کو تاریخ میں دخل ہے کہ انہوں نے وہ کتابیں پڑھیں اور ان کو وہ کتابیں مہیا کی گئی ہیں اور اس کے لئے حکومتوں میں امریکہ اور یورپ کے تربیتی اداروں میں، جن کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے جن کی منظم کوشش ہے کہ ایسا لٹریچر اس کے ہاتھ تک پہنچے جس سے کہ وہ مذاہب کے اثر سے مایوس ہو جائے بالعموم اور خاص طور پر اسلام کی صلاحیت بقا سے مایوس ہو جائے اور یہ اس کے دل میں بیٹھ جائے کہ اب اسلام اس وقت دنیا کی رہنمائی نہیں کرسکتا، کوئی حکومت اور کوئی سوسائٹی کوئی معاشرہ بھی محض اسلام کی تعلیمات پر قائم نہیں رہ سکتا۔

یہ اس وقت کا سب سے بڑا (Problem) ہے، بہت کم لوگوں نے اس کی اہمیت سمجھی ہے کہ آج ساری کوششیں جو کی جارہی ہیں وہ، نتائج پیدا کررہی ہیں، مجھے معاف کیا جائے میں ناقدری نہیں کرتا، میرا ایسی تحریکوں سے الحمدللہ فکری تعلق بھی ہے اور جسمانی تعلق بھی لیکن میں یہ بتاتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں کہ ابھی تک یہ نکتہ ان کے ذہن میں پورے طور پر نہیں آیا ہے، ذہن نے گرفت نہیں کی ہے کہ وہ ساری تبلیغی اور دعوتی کوششیں وہ اثرات اور وہ نتائج پیدا نہیں کررہی ہیں۔ جو قرون اولی میں دعوتوں نے پیدا کیا، اس لئے ان دعوتوں کے ساتھ کوئی ایسی تضاد کی چیز نہ تھی اور ان کا مقابلہ کسی ایسے لٹریچر سے نہیں تھا، بلکہ ان فکری تعبیرات، فکری تعینات، اور فکری دلائل سے بھی نہیں تھا، اس لئے صاف تھا اور وہ دعوت صرف دماغوں ہی تک نہیں پہنچی بلکہ دل کی گہرائی

میں پہنچ گئی اوران کے پورے قویٰ پر حاوی ہوگئی آج یہ نہیں ہورہا ہے، اس کی بڑی وجہ یہی طبقہ ہے جو نہ صرف سیاسی قیادت کررہا ہے بلکہ وہ اسلام کی فکری قیادت بھی کررہا ہے اور احساس فکر کا وہ محافظ اور مدافع بھی ہے اوراس میں بہت دخل ان کے مطالعے کو ہے۔ وہ مطالعہ جس کے بارے میں آپ سے کہہ دیتا ہوں ایک تعلیم کا کام کرنے والے ایک مدرس کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں، تجربہ کار آدمی کی حیثیت سے بھی، کہ کورس جو پڑھا جاتا ہے اور جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان میں ایک فرق ہے یہ فرق بتانا اگر چہ نازک کام ہے اورایک ذمہ داری کی بات ہے اس سے غلط نتیجہ نہ نکالا جائے، مگر ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ کورس پر ایک طرح جیسے کوئی سرکاری مہر ہوتی ہے، کورس پر اس ادارے کی اور اس نصاب تعلیم کی اور اس نگراں جماعت کی، ایک خاص انتساب کی مہر لگی ہوتی ہے اس لئے وہ ایک طرح سے حجاب بن جاتا ہے لیکن مطالعے کی کتابوں پر یہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو دین اسلام کی قدردانی نصیب کرے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مِلت کا تحفظ، تحریکِ نفاذِ شریعت اور غلبۂ اسلام

لائحہ عمل، اور قومی وملّی منشور

درج ذیل تقریر داعی کبیر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا حیدرآباد کی دینی تعلیمی اور دعوتی کانفرنس منعقدہ ۱۷ مارچ ۱۹۸۷ء کا افتتاحی خطبہ ہے جس سے اہل ہند کی طرح مسلمانانِ عالم کے لئے بھی غور وفکر کی منزل اور سمت سفر متعین کرنے میں فکر وعمل کے نشان راہ واضح ہو جاتے ہیں، یہ تقریر مفکرین و قائدین ملت قومی کارکنوں اور عام مسلمانوں کے مطالعہ غور وفکر کے لئے ایک ملی منشور اور میثاق کی حیثیت رکھتی ہے خدا کرے کہ یہاں کے ارباب حل وعقد بھی اس سے پوری طرح مستفید ہوسکیں۔

الحمد لله رب العالمين، والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين، وعلىٰ آله واصحابه اجمعين، ومن تبعهم باحسان ودعىٰ بدعوتهم الى يوم الدين. امابعد!

حضرات! میں آپ کی عزت افزائی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس اہم اجلاس کے افتتاح کے لئے میرا انتخاب فرمایا۔ ایک حقیقت پسند انسان کے لئے جو اپنی حقیقت سے ناآشنا اور کسی فریب نفس میں مبتلا نہیں ہے، ان مواقع کی قدر و قیمت صرف اتنی ہی ہے

کہ ان کے ذریعہ اس کو اپنے دل کی بات کہنے اور اپنے مطالعہ و تجربات کے نتائج کے اظہار کا ایک ایسی فضا میں موقعہ ملتا ہے جس میں اس کی بات صبر وسکون اور اکثر اوقات ذوق واشتیاق کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ مجھے امید کرنی چاہئے کہ یہ پیش کش آپ کی طرف سے کوئی رسمی اعزاز نہیں ہے بلکہ ایک اعتماد کا اظہار ہے۔ ہر چیز کی ابتداء بڑی نازک اور اہم ہوتی ہے اور اس کا اثر اس کے پورے سلسلہ پر پڑتا ہے خدا مجھے اس اعتماد و ذمہ داری کا اہل ثابت فرمائے۔

بزرگو اور عزیزو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور آپ کے لئے جس ماحول اور جن حالات کا انتخاب فرمایا ہے اور اپنے علم وحکمت اور اپنے ارادہ واختیار کی بنیاد پر انتخاب فرمایا ہے وہ بہت اہم اور بہت نازک ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ماحول، یہ حالات، یہ سرزمین اور یہ عہد تو کسی بڑے **مجدد** کا طالب تھا، میں تاریخِ اصلاح وتجدید کے نہ صرف طالبِ علم بلکہ ایک حقیر مصنف کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ جو عہد اور جو ماحول ہم آپ کو ملا ہے جن مسائل سے ہمارا آپ کا واسطہ ہے جن خطرات، جن اندیشوں اور جن چیلنجوں کا ہمیں سامنا کرنا ہے اور اس زمانہ کے جن خفی لیکن بے رحم اشاروں کو سمجھنا ہے وہ کسی بڑے مجدد کے کسی صاحبِ عزیمت، صاحبِ حکمت اور موید من اللہ کے طالب ہیں اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ یہ دور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شایان شان تھا۔ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ کی مجتہدانہ قابلیت اور **مجددانہ** عزیمت کے شایان شان تھا، یا شہیدین جلیلین، حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی حمیت وعزیمت اور بلند نظری و بلند حوصلگی کے شایانِ شان تھا۔ لیکن یہ دور، یہ مسائل اور یہ مشکلات ہمارے لئے منتخب کیئے گئے۔

ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْم

لیکن ایک اچھے محنتی طالب علم کو اگر امتحان میں کوئی مشکل پرچہ ملے تو اگر اس نے محنت کی ہے اس میں صلاحیت ہے اور اس نے اپنی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق

تیاری کی ہے تو اس کی شان یہ ہے کہ اس پر شکوہ نہ کرے بلکہ شکر ادا کرے کہ وہ اس پرچہ کے قابل سمجھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ

وہ جو کچھ فیصلہ کرتا ہے وہ اس کی قدرت کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ اس کی حکمت کا بھی اور اگر میں یہ کہوں کہ اس کی رحمت کا بھی مظہر ہوتا ہے تو بعید نہیں۔ اس کے اس فیصلہ میں (کہ اس نے ہم ناتوانوں کو ایسے عہد اور ایسی سرزمین کے لئے انتخاب کیا) اس کی قدرت کا ظہور بھی ہے اس کی حکمت کا بھی ہے اور میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اس کی رحمت کا بھی ظہور ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آخر زمانہ ایسا ہوگا کہ تم جو کر رہے ہو اس کا عشر عشیر بھی اگر کوئی انجام دے گا تو اس کی نجات ہو جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اس عہد سعادت میں ہوتے اور اس زمانہ میں کوئی عمل کرتے تو اس عمل کی اس زمانہ میں کوئی بڑی اہمیت اور نمایاں حیثیت نہ ہوتی۔ قیمتیں اپنے حالات اور اپنے ماحول کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی ہیں۔ بے موسم کا پھل بڑی قیمت میں بکتا ہے۔ لیکن موسم کا پھل کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی بڑے حملہ کے موقعہ پر دفاع کرنے والوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں اور جب سارے شکست کے آثار ہوں اس وقت کوئی کمزور سپاہی، کوئی سن رسیدہ، کوئی بیمار مسلمان قدم جمائے کھڑا رہے تو اس کو جو اجر ملے گا غلبہ و فتح کے وقت بڑے شہسوار اور شہہ زور کو نہیں ملے گا۔ تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری کمزوری، ہماری بے بضاعتی کے باوجود ہم کو جو ایسے پر آشوب دور کے لئے منتخب فرمایا یہ اس کی رحمت کا کرشمہ ہو اس نے ہمیں ایک ایسا زمانہ دیا کہ اس کے اندر تھوڑا کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت شمار ہوگا۔

حضرات! جہاں تک کسی ملک میں مسلمانوں کے رہنے، وہاں ان کی حیثیت اور ان

کے فرائض منصبی کا سوال ہے۔تو تاریخ اسلام کے طویل سلسلہ اور فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں اس کے دو نمونے ملتے ہیں۔ پہلا نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حاکمانہ حیثیت میں ہوں اور ملک اسلامی حکومت کے زیر اقتدار ہو جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد رومی وایرانی شہنشاہیاں اور ان کے ممالک مسلمانوں کے زیرنگیں آئے اور مسلمان جزیرۃ العرب سے لے کر مراکش تک پھیل گئے۔انہوں نے افریقہ کی پوری شمال مغربی پٹی فتح کر لی اور اس سے آگے سمندر کو عبور کر کے یورپ کے اسپین پر قابض ہو گئے۔اس حیثیت کے متعلق صریح احکام ہیں۔قرآن مجید کے اشارات ہیں۔ہدایات ہیں۔صحابہ کرام کا طرز عمل ہے یہ عقل سلیم کا فیصلہ ہے کہ ایسے موقعہ پر مسلمانوں کا منصب کیا ہے۔مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ان کے داعیوں و مصلحین کی کیا ذمہ داریاں ہیں،ان کے علماءفقہا اور مفتیین کو مسائل کس ڈھنگ سے سلجھانے چاہئے؟ اور ان کے مصنفین ومؤلفین و مفکرین کا طرزِ عمل ان کا طرزِ فکر اور اسلوب کیا ہونا چاہئے۔ یہ بات واضح ہے اور اس کے لئے پورا تاریخی ریکارڈ موجود ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ مسلمان کسی جگہ مختصر ومحدود اقلیت میں ہوں وہ اس ملک کے حالات پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو سکتے ہوں۔ان کا ملک کے نظم ونسق میں کوئی حصہ نہ ہو وہ خالص محکومانہ زندگی گزار رہے ہوں اس کے لئے بھی کتابوں میں فقہ وشریعت کے احکام موجود ہیں۔لیکن ہندوستان میں ہماری نوعیت اس وقت دونوں سے مختلف ہے اور وہ بڑی فکر انگیز،اجتہاد طلب،اعلیٰ ذہانت،حقیقت پسندی اور سخت جدوجہد کی طالب ہے اور اس سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہاں ہم اقلیت میں تو ضرور ہیں لیکن وہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اکثریت کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے اور اس کو اقلیت کہنا بھی صحیح نہیں۔ بلکہ اس کو''ملت'' کہنا چاہئے ہم یہاں کم سے کم پندرہ کروڑ کی تعداد میں ہیں۔ بہت سی خالص اسلامی سلطنتوں میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہیں۔کوئی اسلامی ملک تیس

لاکھ کا ہے کوئی چالیس پچاس لاکھ کا ہے، کوئی دو کروڑ ہے۔ کوئی چار پانچ کروڑ تک کا ہے۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے وہ بھی تیرہ ساڑھے تیرہ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے لیکن ہم یہاں پندرہ کروڑ یا اس سے بھی زائد ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ ملک جمہوری ہے اس ملک کی سیاست میں ہمارا حصہ ہے اس ملک کی قانون سازی میں ہمارا حصہ ہے۔ ہمارے لئے یہاں پورا موقع ہے کہ ہم ملک کی انتظامیہ کو نہ صرف یہ کہ متاثر کریں بلکہ اس کو نئی شکل دینے اور ملک کو بہتر سے بہتر انتظامیہ مہیا کرنے میں مدد و معاون بلکہ بعض اوقات فیصلہ کن ثابت ہوں۔ ہم پاسنگ کا بھی کام کر سکتے ہیں اور اس ملک میں قانون سازی ہم کو نظر انداز کر کے نہیں کی جاسکتی۔ اگر مسلمان اپنے شہری حقوق کا صحیح جرأت مندانہ و آزادانہ استعمال کریں تو ایوان قانون ساز (پارلیمنٹ) اور حکومت کرنے والی پارٹی کسی طرح مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ وہ مسلمانوں سے مستغنی نہیں رہ سکتی اور مسلمان چاہیں تو اس پر انقلاب انگیز اثر ڈال سکتے ہیں اور اس کی ہیئت کذائی بدل سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اس ملک میں ہم تنہا وہ "ملت" ہیں جو خدا کا واضح پیغام رکھتی ہے جو آخری آسمانی محفوظ کتاب کی حامل ہے۔ سیرتِ نبوی کی دولت اس کے پاس ہے، نوعِ انسانی کے لئے رحمت و ہدایت کا عظیم سرمایہ، اسوۂ نبوی، حیاتِ صحابہؓ اور مثالی و معیاری انسانوں کے کردار و عمل کا عظیم ذخیرہ (Record) موجود و محفوظ ہے۔ وہ اس سیرت و طرزِ زندگی کا عملی مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ یہ وہ ملت ہے جس کے پاس ہر عہد میں کسی ڈوبتے ہوئے معاشرہ، کسی بجھتے ہوئے چراغ کو کسی برباد ہوتے ہوئے ملک کو، کسی روبہ زوال نہیں بلکہ جاں بلب ملک یا معاشرہ کو بچا لینے والا پیغام رہا ہے اس نے پہلی صدی ہجری (ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی) میں رومی، ایرانی اور وسطِ ایشیا کے برسر اقتدار ترکستانی معاشرہ کو (جو زیادہ دنوں تک باقی رہنے اور قیادت کرنے کی صلاحیت

کھو چکا تھا۔اور جس کی ظاہری چمک و دمک اور فربہی صحت و توانائی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ وہ ایک غیر طبعی فربہی متورّم جسم کی علامت تھی) اور ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں نیم وحشی اور خون آشام چینی و ترکی نسل کی تاتاری قوم کو ایک نیا دین وعقیدہ، مقصدِ زندگی، روحانیت، ترقی یافتہ، تہذیب وثقافت، جامع و مکمل، معاشرتی، تمدنی اور انتظامی قانون اور نو بہ نو علم و آداب دے کر ایک نئی زندگی کی نئی قسط عطا کر دی اور انہی کی ایک شاخ عثمانی ترکوں کو جنہوں نے ساتویں صدی ہجری میں اسلام قبول کیا اور اسلام لاتے ہی ان میں بیداری، نئی زندگی اور حوصلہ مندی پیدا ہوئی ایشائے کوچک اور یورپ میں ایک بڑی سلطنت (سلطنتِ عثمانیہ) کا بانی بنا دیا۔جس نے کچھ عرصہ کے بعد خلافت اسلامی کی ذمہ داری بھی سنبھال لی اور حرمین شریفین و مقامات مقدسہ کی محافظ و پاسبان اور شوکت وعظمت اسلامی کا نشان بن گئی۔

یہ وہ ملّت ہے جو ڈوبتے ہوئے سفینہ کو ساحل تک پہنچا سکتی ہے اور کسی گرتے ہوئے معاشرہ کو جو زمین میں بالکل دھنس رہا اور دلدل میں پھنس رہا ہے اور جو خودکشی وخودسوزی پر آمادہ ہے بچا سکتی ہے۔اس لئے کہ اس کے پاس وہ کتاب الٰہی ہے اس کے پاس وہ اسوہ نبویؐ ہے ۔اس کے پاس وہ ایمان موجود ہے جو اس کو خالص دولت پرست، طاقت پرست، اقتدار پرست اور مادہ پرست بننے سے روکتا ہے یہ تنہا وہ ملت ہے جس کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا یقین ہے اس پر غفلت کے چاہے کیسے اور کتنے ہی دبیز پردے پڑیں۔اس پر خودفراموشی کے کتنے شدید دورے پڑیں اس کے دلوں کے اندر اس کے اندر اس بات کا شعور باقی ہے کہ اس کو خدا کے سامنے جانا ہے اللہ کے رسول ؐ کو منہ دکھانا ہے اور اپنی زندگی کا حساب پیش کرنا ہے، وہاں نہ عزت کام آئے گی نہ دولت، نہ طاقت کام آئے گی۔احساس فرض سچی عبودیت، اور بے لوث خدمتِ خلق کام آئے گی اور ایمان اور عمل صالح کام آئے گا۔

عزیز طلبہ میرے محدود مطالعہ میں اس ملت کی حیات اور اس کے طویل سفر اور تجربوں میں یہ بالکل انوکھی مثال ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں۔ ہم عظیم ترین اقلیت میں ہیں، یہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر وہ اپنی امتیازی صلاحیت کا ثبوت دے۔ اکثریت سے زیادہ محنت سے کام کرلے اور اپنی اہلیت وافادیت اپنے خلوص وصداقت کا مظاہرہ کرلے تو وہ قیادت کا مقام بھی حاصل کرسکتی ہے اور اگر یہ نہیں تو کم از کم ملک کا رخ تبدیل کرسکتی ہے اور صاحب اقتدار جماعت کو اپنی ضرورت وافادیت تسلیم کرنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ اس میں حقیقی زندگی کی وہ رمق باقی ہے۔ (میں اس کو زندگی کی رمق ہی کہوں گا) جو دنیا کی اکثر ملتیں کھو چکی ہیں روحانی حیثیت سے، ایمانی حیثیت سے، اور احتساب نفس کے لحاظ سے وہ ملتیں، اس آخری اخلاقی شعور اور ضمیر کی زندگی و بیداری سے محروم ہو چکی ہیں جس کو زندگی کی رمق کہا جانا چاہئے۔ یہ ملت اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ اس رمق کی محافظ ہے۔

ایسی حالت میں اس ملت کے علماء کی علوم دینیہ کے اہل نظر واہل فکر ماہرین کی ملت کے بے لوث و بالغ نظر قائدین کی، اس ملک اس عہد اور اس ماحول میں ذمہ داری اتنی عظیم ہونے کے ساتھ اتنی نازک اور اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کا تصور اس سے پہلے کسی ملک میں کرنا مشکل تھا۔ پندرہ کروڑ کی تعداد میں مسلمان ایک ایسے ملک میں موجود ہیں جو لرزہ خیز مصائب اور ہوشربا مسائل سے دوچار ہے۔ جہاں عرصہ سے انسان سازی کا، اخلاق و کردار بنانے اور ان کو توانائی بخشنے کا، دولت کی کشش اور مادیت کے سحر کا مقابلہ کرنے والی اخلاقی وروحانی طاقت پیدا کرنے کا کارخانہ بند ہو چکا ہے۔ اس کے جو بھی اسباب ہوں (ان اسباب کی اس مختصر تقریر میں تشریح نہیں ہوسکتی) یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کا معاشرہ ایک اخلاقی بحران میں مبتلا ہے جس کے آثار ونشانات قومی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں۔

ایسی حالت میں ایک ملت یہاں رہتی ہے جو پندرہ کروڑ کی تعداد میں بتائی جاتی ہے وہ اپنے پاس اللہ کی کتاب صحیفہ آسمانی رکھتی ہے۔ سنّت نبوی مدون اور محفوظ طریقہ پر اس کے پاس ہے۔ فقہ اسلامی کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو زندگی کے تمام احکام (عبادات سے لے کر معاملات وسیاست، تمدن واخلاق واجتماع کے آداب تک) پر مشتمل ہے جس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائی جاتی۔ فقہ کا جتنا بڑا کام اعمال اور انسانی حرکات واعمال کا، حلال وحرام، جائز وناجائز کے تصور سے جو ربط ہے اس ربط کی تفسیر وتشریح کرنے کے سلسلہ میں جو محنت اسلام کی تاریخ میں ہوئی ہے اس کی کوئی مثال مجھے معلوم نہیں اور اس کی کوئی نظیر گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرات! ہم ایک ایسے ملک میں جہاں اگرچہ ہم اصطلاحی طور پر اقلیت میں ہیں۔ لیکن حقیقت میں پوری قوم ہیں پوری ملت ہیں۔ اس کے ساتھ ایک تاریخ ہے۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس تک اس نے حکومت کی ہے۔ اس ملک کو بنایا ہے سنوارا ہے۔ ملک کا نام دنیا میں روشن کیا ہے۔ اس نے ملک کو وہ چیز دی جس سے وہ عرصہ سے محروم ہو چکا تھا۔ اس میں پہلی مرتبہ سیاسی وانتظامی وحدت پیدا کی۔ اس کو مساوات واخوتِ انسانی کا پیغام دیا اور ہندوستان کو جو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طویل ووسیع، مضبوط ومستحکم توانا وصحت مند انتظامیہ اور وسیع مرکزی حکومت عطا کی۔

اس کے بعد سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم آخری امت ہیں۔ ہم حاملِ قرآن ہیں ہم داعی الی اللہ ہیں۔ ہم محتسب کائنات ہیں، اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ حقیقت ادا کرائی ہے۔ اس کے سامنے اس کی مجلس شوریٰ میں مختلف قوموں کے بارے میں کہا گیا اور مختلف خطروں کی نشاندہی کی گئی۔ اس کی مجلس کے ارکان نے کہا ہمارے نظام اور کام کو اشتراکیت سے خطرہ ہے، جمہوریت سے خطرہ ہے، ملوکیت سے خطرہ ہے، جمہوریت سے خطرہ ہے کسی نے کہا کہ

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئے بار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیاست پر مدار

ابلیس نے ان تمام خطروں کو کوئی اہمیت نہیں دی اس کے برخلاف اس نے کہا ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس نے کہا ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کے خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

حضرات گرامی! مسلمان قوم کا یہ امتیاز اور اس ملک کا جمہوری نظام، پھر مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی، یہ ساری باتیں مواقع فراہم کرتی ہیں کہ ہم یہاں کے نظم و نسق پر اثر انداز ہوں۔ یہاں قانون بنانے میں ہمارا حصہ ہو سکتا ہے پھر اس ملک کے جمہوری ہونے کی وجہ سے اس ملک کی قیادت کا منصب بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے کو اخلاقی طور پر، باطنی طور پر، ذہنی طور پر اور عملی طور پر بھی ممتاز فائق ثابت کر دیں تو اس ملک کی قیادت کے ہم طالب نہیں ہوں گے، ملک کی قیادت خود ہماری طالب ہوگی، ہمیں سورج کا چراغ لے کر ڈھونڈے گی۔ یہاں کی خاک کے ذرّہ ذرّہ، درخت کے پتہ پتہ سے آواز آئے گی اس ملک کو بچانے والے کہاں ہیں۔ آئیں اور اس ملک کو بچائیں۔ آپ کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ کو کچھ آسانیاں چاہئیں۔ آپ ملک کے نجات دہندہ ہیں۔ آپ اس

ملک کی آخری امید ہیں۔ اس ملک کے باشندوں کو باہم عدل کا پیغام دیں۔ عقل سلیم کا پیغام دیں۔ خداترسی اور انسان دوستی کا پیغام دیں اور اس میں اس کا لحاظ رکھیں کہ ہمارا وہ پیغام اسلامی عقیدہ اور ایمانی جذبہ کے ساتھ مربوط اور جڑا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ ذہین لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص طرح کی قوت شامہ عطا فرمائی ہے (جو معنویات میں بھی اسی طرح کام کرتی ہے جیسے مادیت وجسمانیت میں) اس عمومی انسانی دعوت میں ہمارے ایمان کی خوشبو اور مہک پائیں۔ وہ یہ محسوس کریں کہ یہ خودغرضی کا پیغام نہیں۔ نفسیات کا پیغام نہیں۔ اس کے پیچھے سیاسی یا اقتصادی مقاصد نہیں۔ یہ وہ پیغام ہے جس کو ان لوگوں کے ایمان باللہ وتعلیمات اسلامی نے پیدا کیا۔ اور جلا اور طاقت دی ہے اور اس مقام کا سرچشمہ اور اس کا محرک وداعی ان کا خدا ہے (جو رب العالمین ہے) اور خدا کے اس آخری رسول ﷺ سے جو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے رابطہ ہے۔

اگر ہم کام کریں گے تو صرف یہی نہیں کہ ہم اس ملک میں عزت سے رہ سکیں گے بلکہ اس ملک کی قیادت ہم کو تلاش کرے گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام جیل گئے اور ایک ایسے الزام میں گئے جس کے بعد ایسے ''اسیر زندان'' کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا اور وہ آدمی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ لیکن انہوں نے اپنے کردار سے، اپنی عملی صلاحیت سے، اپنی معجزانہ ایمانی طاقت سے۔ اپنی انسان دوستی سے جیل کے اندر رہ کر بھی یہ ثابت کردیا کہ وہ مصر میں تنہا آدمی ہیں جن کے پاس ایمان ہے جن کے پاس کردار کا جوہر ہے جن کے پاس عملی صلاحیت ہے۔ ان کے پاس دوستی کا جذبہ اور امانت ودیانت ہے۔

بالآخر بادشاہِ مصر ان کو جیل سے بلواتا ہے لیکن وہ خودداری کے ساتھ کہتے ہیں:

ارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَسْئَلْهُ مَابَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ط اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ○

''اپنے آقا کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا

معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ بے شک میرا
پروردگار ان کے مکر سے خوب واقف ہے۔''

بادشاہ نے پھر تحقیق کی اور مدعیہ نے کہہ دیا:

مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ

حاشا اللہ۔ ہمیں اس میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔

اس کی کوئی خطا نہ تھی۔ یہ سب میرا پھیلایا ہوا جال اور میری بنائی ہوئی سازش تھی۔
جب وہ جیل سے نکلے تو بادشاہ نے پیش کش کی آپ کوئی عہدہ قبول کیجئے۔
انہوں نے کہا:

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ج اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ○

مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیونکہ میں حفاظت بھی
کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف ہوں۔

قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جو حالات کی تفصیل بیان کرے۔ لیکن اس قصہ کے سیاق میں ہمیں یہ بات مضمر معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جنہوں نے سات سال مصر میں گذارے تھے، سمجھ گئے کہ اس ملک اور انتظامیہ کا سب سے زیادہ کمزور شعبہ مالیات اور غذا کا شعبہ ہے اور یہ وہ شعبہ ہے جو عوام سے زیادہ سے زیادہ ربط رکھتا ہے جس کے ذریعہ ہر جگہ عوام تک پہنچا جا سکتا ہے اور ان کی بے لوث خدمت کر کے ان کو ممنون و متاثر اور ان کو صحیح عقائد اور واضح حقائق پر غور کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ انہوں نے کہا۔

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ج اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ○

حضرات! ساری سیاسی پارٹیوں کی موجودگی میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی موجودگی میں اور تعلیم کا معیار جو اس وقت ہے اور اس کے جو وسائل اس ملک کو مہیا ہیں۔

ان سب کے باوجود صالح قیادت ، عادل قیادت، خداترس قیادت اور انسان دوست قیادت کا منصب خالی ہے آپ اپنی حیثیت پہچانیں، اپنا منصب جانیں اور ملک میں خدمت ، ملک میں صالح انقلاب لانے اور ملک کو صحیح رخ پر لگانے اور چلانے کی اپنی صلاحیت کو پہچانیں اور اس سے کام لیں۔

ہمیں ملک وملت دونوں زندہ حقیقتوں میں سے کسی حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کرنی چاہیں۔ البتہ ہماری داعیانہ حیثیت، ہماری بے لوث اور خدااندیش فطرت اور ہمارا وہ فرض منصبی جس کی بناء پر ہم کو ''خیر امت'' کا لقب ملا۔ اس پر غالب رہنا چاہئے۔ اس سود وزیاں کی دنیا میں اس قمار خانۂ سیاست میں ہماری اصول پسندی ہمارا اخلاقی کردار اور ہمارا ایمانی شعار سب پر غالب رہنا چاہئے۔ ہمیں ان سیاسی پارٹیوں کی پست سطح پر کبھی نہیں آنا چاہئے۔ جو دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر اور دوسروں کی بربادی میں اپنی ترقی کا خواب دیکھتی ہیں اور جن کا منتہائے نظر حکومت کی کرسی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں اس ملک کے بارہ میں بھی اور اس ملت کے بارہ میں بھی اپنا ذہن نبوی وآسمانی تعلیمات کی اساس پر تعمیر کرنا چاہئے۔

حضرات! اس کے ساتھ ساتھ ہمارا فرض ہے کہ مسلمانوں میں دینی شعور پیدا کریں۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں میں دینی شعور پیدا کریں۔ ہماری آئندہ نسلیں ارتداد کے خطرہ میں مبتلا ہیں۔ تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو بالکل کھلی سی بات ہے لیکن اعتقادی ارتداد کا خطرہ بھی سر پرآ گیا ہے۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ قصبات میں، گاؤں میں، شہروں میں محلوں میں، گھروں میں اور برادریوں میں بچوں کو دینی تعلیم دینے کا احساس پیدا کریں۔ مدارس اور مساجد قائم کریں اور ان کا جال بچھا دیں۔ میں اس موقعہ پر اپنی ایک گذشتہ تقریر کا اقتباس پیش کروں گا جو میں نے کچھ عرصہ پہلے دینی کونسل کے پلیٹ فارم پر کی تھی:

''اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملت کے لئے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو میں کہوں گا۔

''مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ''

لکھ دو۔ پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے اپنا جائزہ لے، محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کی اپنی آئندہ نسل کے لئے اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ 'مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ'' (میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے) میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ اور یہ سوال افراد کے پیمانہ پر، خاندان کے پیمانہ پر، برادری کے پیمانہ پر، اور آخر میں کہتا ہوں کہ ملت کے پیمانہ پر اور ملتِ ہندیہ اسلامیہ کے پیمانہ پر، ہمارے دلوں میں نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستہ پر چلے گی۔ وہ کس گروہ ملت کی پیرو ہوگی۔ کس کی پرستش کرے گی۔ کن عقائد کو مانے گی۔ یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی یا سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں خداؤں اور دیوتاؤں کی، یہ اس وسیع کائنات میں اپنی محدود زندگی میں کس کے دستِ قدرت کا کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی۔''

اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی جدوجہد شروع

ہو گئی ہے اس کو جاری رکھیں ہم کو کسی ملک میں دریا کی مچھلیوں کی طرح (جن کی کوئی شناخت نہیں ہوتی) زندگی گذارنے کی اجازت نہیں۔ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ نے پوری ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لأ بورڈ نے جو پہلے سے قائم تھا۔ اس کو اپنا موضوع بنایا۔ پھر یکساں سوال کوڈ کا مسئلہ ہے۔ ان سب مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہاں بھی میں اپنی گذشتہ تقریر کا کچھ حصہ پیش کروں گا، جو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس بمبئی منعقدہ ۱۵/۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء میں کی گئی، میں نے کہا تھا:

''مسلمان اگر مسلم پرسنل لاء (شرعی عائلی قوانین میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے۔ اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں۔ فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے اپنے سارے شوقِ عبادت کے باوجود اور گھر میں مسلمان نہیں۔ اپنے معاملات میں مسلمان نہیں۔ اپنے عائلی و خاندانی روابط تعلقات میں مسلمان نہیں۔ اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے۔ ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا

> اس طرح مقابلہ کریں گے، جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہئے اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔''

حضرات! میں نے چند سال ہوئے اندور میں ٹیگور ہال میں پیام انسانیت پر تقریر کی اس موقعہ پر R.S.S کے لوگ موجود تھے۔ اگلے دن ایک وفد میری قیام گاہ پر آیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس میں R.S.S کے لیڈر اور اس کے ذمہ دار ہیں اور مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''کل آپ کی تقریر سن کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے۔'' میں اپنے تاثر اور شہادت کو اپنے اور پوری ملت کے لئے قابل شکر سند سمجھتا ہوں۔ ضرورت ہے کہ آپ کی ہر بات سے اس کا اظہار ہو اور یہاں کے شہری یہ سمجھیں کہ آپ کو اس ملک کی ان سے زیادہ فکر ہے۔ آپ کو دولت سے زیادہ ملک عزیز ہے۔ آپ کو یہ معاشرہ عزیز ہے، یہ وہ جوہر ہے جو مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں میں بھی یہ بات نہیں رہی وہ بے تکلف اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے اس سطح پر آجاتے ہیں اور وہ کام کر لیتے ہیں جس سے ملک خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ معاشرہ بری طرح زوال کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور پوری پوری کمیونٹی بلکہ ملک کی اس عظیم آبادی میں اس صورتحال سے حقیقی طور پر مضطرب و بے چین ہونے والا اور اپنی کمیونٹی، پارٹی، فرقہ اور جماعت کی ملامت وتنقید یا مدح وتعریف سے بے پرواہ بے نیاز ہو کر تنقید واحتساب کا فرض ادا کرنے والا اور خطرہ کا بگل بجانے والا دُور دُور نظر نہیں آتا۔

حضرات! آپ کے اس اجلاس میں بڑے بڑے علماء فضلائے علوم دینیہ، زعماء و قائدین، اہل قلم و مفکرین موجود ہیں۔ میں اپنی اس گذارش کو اسلام کے عہد اول کے ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ کو یاد دلانے پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے لئے پورا پیام رکھتا ہے۔

جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی۔ لیکن ذمہ داری کے احساس میں فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق آدمی کو بڑا اور زندہ جاوید بناتا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت خلیفہ وقت تھے۔ انہوں نے کہا۔

اینقُصُ الدِّین وَاَنَا حَیٌّ

کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہو سکتی ہے؟ کوئی قطع برید ہو سکتی ہے؟ حیف ہے میری زندگی پر اگر میرے سامنے شریعتِ اسلامی میں ترمیم ہونے لگے اور اس کے فرائض و احکام میں انتخاب کیا جانے لگے نماز تو ٹھیک، روزہ بھی ٹھیک، لیکن زکوٰۃ نہیں، یا زکوۃ بھی ٹھیک، روزہ نہیں، میں زندہ ہوں اور میرے سامنے یہ تحریف ہو؟ ہو ہی نہیں سکتا۔

بس یہ حمیت تھی جو ابل کران کی زبان پر آئی اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑ دی اور تاریخ کا دھارا بدل دیا۔

اللہ جل جلالہ ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں احسن طریقہ سے انجام دینے کی توفیق بخشے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین. و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے

یہ ایمان افروز خطاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۷ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ بمطابق ۲ مارچ ۱۹۷۳ء دارالحدیث جامعہ رحمانیہ خانقاہ مونگیر میں کیا۔
جامعہ رحمانیہ امیر شریعت حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کا وہ قدیم ادارہ ہے جسے صوبہ بہار ہندوستان میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے، جسے از ہر بہار بھی کہا جاتا ہے

حضرات امیر شریعت اساتذۂ کرام طلبائے عزیز! آج میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی، کہ میں یہاں اس عزیز و محبوب سرزمین پر حاضر ہوا۔ میری یہ حاضری آپ کے لئے کسی نفع یا کسی خدمت کا ذریعہ ہے یا نہیں اس میں بہت شبہ کی گنجائش ہے، اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ میں آپ کی کوئی خدمت انجام دے سکوں گا، اور ان توقعات کو پورا کر سکوں گا جن کا آپ نے اپنے اس مخلصانہ سپاس نامہ میں اظہار کیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حاضری میرے لئے موجب سعادت اور باعث سرفرازی ہے۔ میں یہاں خادمانہ حاضر ہوا ہوں، عزیزانہ بھی، برادرانہ بھی لیکن اس سے زیادہ خادمانہ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ بھی یہاں تشریف لاتے تو وہ بھی اس حاضری پر خوش ہوتے، اور جن کی خدمت میں وہ آتے ان کو بھی اس سے بڑی مسرت ہوتی۔

میرا قدیم اور عمیق تعلق

عزیز طلبہ! جیسا کہ سپاسنامے میں کہا گیا ہے، میرا اس سلسلہ سے اور اس ذات گرامی سے جس سے اس جگہ کا انتساب ہے، بہت قدیم اور عمیق تعلق ہے اور میں اس تعلق پر نازاں بھی ہوں، شکر گذار بھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو بھی کہ اس کو باقی رکھے۔ میں یہاں بالکل محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی نئی جگہ پر ہوں اور کچھ اجنبی طلبہ کو کسی مدرسے کے طالب علموں کو خطاب کر رہا ہوں۔ میں بالکل یہ محسوس کرتا ہوں کہ اپنے خاندان کے افراد کو اپنے ہی خاندان کے نونہالوں اور عزیزوں کو خطاب کر رہا ہوں، اور غالباً حضرت مولانا منّت اللہ صاحب امیر شریعت بھی یہی سمجھتے ہوں گے، اور یہی محسوس کرتے ہوں گے، اور انہوں نے مجھے بلا کر یہ تصور نہ کیا ہوگا کہ وہ کسی اجنبی کو دعوت دے رہے ہیں، بلکہ اپنے ہی ایک عزیز اور فرد خاندان کو اپنے بچوں سے اور اس چمن کے نونہالوں سے ملا رہے ہیں، اس لئے آپ سے مجھے نہ کسی قسم کی کوئی معذرت کرنی ہے نہ کوئی رسمی شکریہ ادا کرنا ہے، البتہ سپاسنامہ پر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ سپاسنامہ تو اس کو پیش کیا جاتا ہے جس سے کسی قسم کی بیگانگی ہو، یا وہ مہمان کی حیثیت رکھتا ہو، یہ تو میرا گھر ہے میں یہاں گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے حاضر تھا، اور یہ آپ نے تکلف برتا۔ لیکن چونکہ یہ تکلف محبت پر مبنی ہے اور اس کا محرک بہت قابل قدر ہے، آپ حضرات نے اپنے تعلق کے اظہار کا یہی طریقہ سمجھا جو آج کل رائج ہے اس لئے میں اس کی زیادہ شکایت نہیں کروں گا، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی ضرورت نہ تھی، اگر آپ نے خلوص کے ساتھ اس کو پیش کیا تو اس کو سر آنکھوں پہ رکھتا ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کہنے کی باتیں تو بہت ہیں

میرے عزیزو! اس وقت آپ سے کہنے کی باتیں تو بہت ہیں۔ ہم آپ سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی جتنی دینی درسگاہیں ہیں خواہ وہ ہندوستان میں ہوں، خواہ وہ مصر وشام میں ہوں، خواہ وہ مراکش، الجزائر اور تیونس میں ہوں، سب کے طلبہ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ یہ کشتی اس وقت ایک متلاطم سمندر میں ہے، اس کے گرداب بلا اور اس کے بھنور بہت سخت ہیں۔ اس میں اس وقت طوفان آیا ہوا ہے اور بڑے بڑے جہاز جو بڑے بڑے انتظامات سے مسلح ہیں اور جن کے تحفظ کا پورا سامان کیا گیا ہے اور جو سمندر کے رخ پر بہہ رہے ہیں وہ بھی اس وقت تلاطم میں ہیں وہ بھی اس وقت ایک خطرہ محسوس کرتے ہیں چہ جائیکہ ہم اور آپ جو دریا کے رخ کے بالکل خلاف اپنی کشتی کو لے جا رہے ہیں اس لئے ہم آپ کو بہت سنجیدگی کے ساتھ اپنے مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔

دو فریق

اس میں ایک تو وہ ہے جو دینی مدارس کے مستقبل سے بالکل مایوس ہے، ان کی افادیت کا منکر ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس غرض کے لئے ہیں اور یہ کیا خدمت انجام دیں گے اور ان کا کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں، ان کے پاس بدلے ہوئے زمانہ کے لئے کوئی پیام ہے، یہ اپنے اندر کوئی افادیت رکھتے ہیں، ان کے اندر باقی رہنے کی بھی صلاحیت ہے؟

ایک فریق وہ ہے کہ جو بالکل خواب غفلت میں مدہوش ہے۔ وہ حقائق کو بالکل نہیں سوچتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جیسے آج سے چار سو برس اور چھ سو برس پہلے کا زمانہ ہے، جامعہ

نظامیہ بغداد کا زمانہ ہے۔ اس کو کسی تغیر وانقلاب کی خبر نہیں، یا اگر خبر ہے تو اس نے اپنے کو اس سے بالکل بے تعلق بنا رکھا ہے، جیسا کہ آپ نے سنا ہوگا کہ شتر مرغ ریت میں اپنا سر دھنسا دیتا ہے اور خارجی دنیا سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور پھر اس کو خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہوتا ہے، جب وہ نہیں دیکھتا تو سمجھتا ہے کہ کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے، یہ دونوں فریق دو سروں پر ہیں۔ دونوں، دو مختلف انتہاؤں پر ہیں جسے ہماری درسی زبان میں علیٰ طرفی الاخیر کہتے ہیں، ان میں کوئی بھی حقیقت پسندی سے کام نہیں لے رہا ہے، اور کسی کی بھی راہ، اعتدال کی راہ نہیں ہے۔

زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے

آپ سے کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے، اور اس کے لئے کسی بڑے انکشاف اور کسی بڑی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ زمانہ بہت نازک ہے اور زمانہ بہت تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے بلکہ بدل چکا ہے اور اس کے بعد بھی وہ ایک جگہ پر رکا ہوا نہیں ہے، بلکہ بدلتا چلا جا رہا ہے اس لئے ہمارے مدارس کے طلبہ کو ان دونوں فریقوں سے بالکل ہٹ کر ٹھنڈے دماغ سے اور بہت صبر وسکون اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے، کہ ان کا مستقبل کیا ہے، اور وہ کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

مذہب کوئی عجائب خانہ اور میوزیم نہیں

عزیز طلبہ! یہ میں آپ سے کہہ دوں کہ بڑی بڑی کتابیں آپ پڑھ سکتے اور آپ نے پڑھی ہوں گی، اور اگر پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملا تو آپ آئندہ پڑھ سکتے ہیں۔ اس موضوع پر بڑی اچھی اچھی کتابیں ہیں، لوگوں نے علمی حیثیت سے تحقیقی طریقے پر اس پر بحث کی ہے کہ کسی نظام کو محض روایات پرستی، محض قوت مقابلہ اور محض اصرار وانکار کے

ساتھ باقی نہیں رکھا جا سکتا، کوئی صالح سے صالح نظام ہو، اس کو محض روایت پرستی پر اور ایک مقدس ورثہ کے طور پر یا آثار قدیمہ کے طور پر باقی نہیں رکھا جا سکتا، دنیا میں آثار قدیمہ کی گنجائش تو ضرور ہے، اور آپ نے بڑے بڑے شہروں میں آثار قدیمہ کے مرکز دیکھے ہوں گے، وہاں زندہ عجائب خانے بھی ہیں اور مردہ عجائب گھر بھی ہیں، شاید آپ کے صوبہ کے دارالحکومت پٹنہ میں بھی کوئی ایسی جگہ ہو۔

ایسے آثار قدیمہ دنیا میں نہ صرف یہ کہ باقی رکھے جاتے ہیں بلکہ ان کو سینے سے بھی لگایا جاتا ہے اور ان کے لئے بہت بڑا قطعۂ زمین مخصوص کر دیا جاتا ہے، اور ان کے لئے حکومت کے بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ بھی مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کی حیثیت کیا ہے، اس کی حیثیت ایک بے ضرر، ایک غیر متعلق، ایک قابلِ زیارت، قابل دید، اور تفریح کے ایک سامان کے طور پر قدیم یادگاروں کے ایک مجموعہ کی ہے۔ اس سے زائد کچھ نہیں۔ ان کو اس لئے نہیں رکھا جاتا کہ زندگی میں ان کی ضرورت ہے۔ ان کے بغیر کام نہیں چلتا، وہ ایک بہت اہم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بالکل نہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ اس مشغول زندگی میں کبھی کبھی تفریح کی ضرورت ہوتی ہے، تو ان سے تفریح حاصل ہوتی ہے، یا پھر قدیم تاریخ پر فخر کرنے کا ایک موقع ملتا ہے کہ قدیم عظمت کا وہ نشان ہے کسی قوم، کسی ملک کے ایک دور کی تہذیب کا مرقع ہے، اگر آثار قدیمہ کے اندر احساس ہوتا یا جن کی طرف ان آثار قدیمہ کی نسبت ہے وہ اگر زندہ ہوتے تو ہرگز اس صورت حال پر خوش نہ ہوتے۔

یہ پوزیشن کوئی زندہ اور صاحبِ دعوت قوم قبول نہیں کر سکتی

کوئی زندہ جماعت جو پیام رکھتی ہے جس کا ایک مقام ہے جس کو بعض حقیقتوں پر اصرار ہے، جس کو بعض چیزوں سے انکار ہے، جس کا اپنا ایک راستہ ہے، جس کو خدا نے

روشنی عطا کی ہے، جو کچھ چیزوں کو غلط سمجھتی ہے، کچھ چیزوں کو صحیح سمجھتی ہے، وہ ہرگز اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اس کے لئے کوئی جگہ مخصوص کردی جائے او راس کو بے ضرر سمجھ کر وہاں رہنے کا موقع دیا جائے جیسا کہ فراعنہ قدیم کی لاشیں ممی کی ہوئی...... مصر میں رکھی ہوئی ہیں۔

عربی مدارس آثارِ قدیمہ کے طور پر

جو لوگ عربی مدارس کی وکالت اور ان کی سفارش اس انداز سے کرتے ہیں کہ بھئی آپ کے یہاں بڑے بڑے میوزیم ہیں آپ کے یہاں بڑے بڑے دار الآثار ہیں۔ برطانوی قوم کا حال یہ ہے کہ اس کو سب سے زیادہ شغف ہے میوزیم سے۔ شاید جتنے بڑے بڑے میوزیم لندن میں ہوں دنیا کے کسی شہر میں ہوں۔ اس لحاظ سے یہ عربی مدرسے آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے باقی رکھے جائیں تو میں کم از کم ایسی پوزیشن کو ہرگز قبول کرنے پر تیار نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جس نظام کی وکالت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ نے کی جس کے لئے ندوۃ العلماء کی درسگاہ قائم ہوئی اور جس کے لئے دار العلوم دیوبند قائم ہوا، جس سے ہم سب لوگوں کو تعلق ہے، اس کی بنیاد ہرگز اس پر نہیں تھی۔ یہ رحم کی کوئی درخواست نہیں تھی، یہ رحم کے لئے کوئی استغاثہ نہیں تھا، کہ صاحبو! بہت سی چیزیں آپ نے چھوڑ دی ہیں قبرستان بھی باقی ہیں بڑے بڑے آباد اور ایسے شہر کہ جہاں پر ایک گز زمین کا ملنا بھی مشکل ہے، وہاں پر بہت بڑے رقبہ میں قبرستان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کوئی مصرف نہیں ہے اور وہ ایک بہت بڑی جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے مکانات بھی بن سکتے ہیں مکانات کے لئے لوگوں کے پاس جگہ نہیں ہے، شہر تنگ ہو رہا ہے، پھیلتا چلا جارہا ہے اور یہ قبرستان ہیں، آپ نے قبرستان چھوڑ رکھے ہیں، آپ کا کیا حرج ہے

اگر آپ ان مدرسوں کو بھی اسی طرح چھوڑ دیں، کم سے کم میں اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔

بہر حال ایک تو فریق یہ سمجھتا ہے کہ یہ مدرسے اپنی افادیت، اپنی زندگی کی صلاحیت ختم کر چکے ہیں اور اب ان کو آثار قدیمہ کے طور پر باقی رکھنا چاہئے۔ تو میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ اول تو میں اس پوزیشن کو قبول نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ دنیا میں جو اس مقام پر آ جائے، جو اپنے لئے یہ مقام پسند کر لے اس کے لئے پھر زندگی کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ آج اگر قبرستانوں کو لوگوں نے کسی وجہ سے چھوڑ رکھا تو کل ان کو نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا قبرستان کتنا بڑا تھا۔ اس کے دیکھنے والے یہاں بھی موجود ہوں گے۔ میں بھی جب شروع میں دہلی جایا کرتا تھا، دہلی کی سیر کرتا تھا تو ایک لق ودق میدان تھا۔ ہزاروں ہزار قبریں تھیں۔ اب ان کو تلاش کرتے رہئے۔ اب جہاں حضرت خواجہ کا مزار ہے اس کے آس پاس کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے، اس لئے کہ شہر کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں اور شہر کی ضرورت کو ایک حقیقت سمجھا جاتا ہے اور یہ چیزیں محض ایک رعایت اور مجبوری کے دائرہ میں آتی ہیں اور رعایت و مجبوری حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لئے اول تو ان مدارس کی پوزیشن صحیح نہیں، دوسری بات یہ کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ ان چیزوں کو رواں دواں اور حقیقت پسند زندگی، وہ زندگی جو زندگی کی صلاحیتوں سے نہ صرف معمور بلکہ مخمور اور مدہوش ہے، اور جو کسی کو قبول کرنے کے لئے کسی کو اپنے حصہ میں سے حصہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے، زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔

محض قدامت اور تاریخ کے سہارہ پر کوئی ادارہ زندہ نہیں رہ سکتا

دنیا میں کوئی ادارہ محض اس وجہ سے نہیں چل سکتا کہ یہ ادارہ آج سے سو برس دو سو برس پہلے قائم ہوا اور اس نے کچھ مفید خدمت انجام دی تھی۔ محض تاریخ کے بل پر، محض تاریخ کے سہارے کوئی ادارہ، کوئی تحریک، کوئی فلسفہ، کوئی نظام نہ چلا ہے نہ چلے گا۔ اگر آپ کسی ادارے کو قائم رکھنے کے لئے اور اس کے لئے کچھ مراعات حاصل کرنے کے لئے اس کی تاریخ پیش کرتے ہیں کہ اس نے دور ماضی میں یہ خدمات انجام دیں۔ تو لوگ اس کو بالکل نہیں سنیں گے، اور اگر کوئی آج خاموش ہو جائے گا تو کل اس کے اندر سے نہایت پر زور اور پر جوش تقاضہ پیدا ہوگا کہ اس کو ختم کر دینا چاہئے۔

بقاء انفع کا بے لاگ قانون

اللہ تعالیٰ کا جو نظام اس کائنات میں جاری و ساری ہے جو ہمیں قرآن مجید اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، وہ بقائے انفع کا قانون ہے۔ یوں تو اس وقت دنیا نے جس قانون کو تسلیم کیا، وہ بقائے اصلح کا قانون ہے (SURVIVAL OF THE FITTEST) لیکن حقیقت میں قرآن مجید سے جو سمجھ میں آتا ہے، وہ ہے بقائے انفع کا قانون، صاف صاف قرآن مجید میں ہے، سورۂ رعد کی آیت ہے۔ آپ نے بہت پڑھی ہوگی، اور اس کی تفسیر بھی دیکھی ہوگی۔

"فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَّأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ."

جس چیز میں کوئی نافعیت نہیں، جس چیز میں کوئی پیام نہیں ہے، جو چیز کوئی اہم

خدمت انجام نہیں دے رہی ہے، جس پر انسان کی بقاء اور نشو ونما اور انسان کی راحت اور ترقی کا کوئی انحصار نہیں ہے اس کو قرآن مجید نے زبد کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ جو بہت ہی جامع اور نہایت وسیع اور عمیق لفظ ہے، اور معانی سے لبریز ہے۔ زبد پھین کو کہتے ہیں یعنی دریا کا وہ جھاگ جو اپنے اندر کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ جس کے اندر ثبات واستقامت کی کوئی صلاحیت نہیں، وہ دریا کے جوش کی ایک نمود ہے، دریا کے جوش کا ایک خارجی ظہور ہے، اوراس کے اندر کوئی استقرار نہیں کوئی صلابت نہیں، بس ایک پھولی ہوئی سی چیز ہے جس کے اندر ہوا بھر گئی ہے، یا یہ کہیئے کہ نیچے کا جو میل کچیل تھا وہ اوپر آ گیا ہے۔ اس کے اندر انسانوں کو فائدہ پہنچانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، وہ اوپر اوپر بہہ جائے گا یا کنارہ پر جا کر کہیں کسی چیز سے اٹک جائے گا اور باقی نہیں رہے گا، اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو قانون تربیت ہے، وہ قانون تربیت اس کی اجازت نہیں دیتا کہ زبد زیادہ دنوں تک باقی رہے، اس لئے کہ یہ عالم اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ اس میں زبد کی سمائی ہو۔ اگر دریاؤں کا جھاگ اور پانی کا پین اس طرح باقی رہنے لگے تو جن کو باقی رہنا چاہئے ان کے لئے مشکل ہو جائے **واما ما ینفع الناس** لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے **فیمکث فی الارض** وہ ٹھہر جاتی ہے۔

زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے

تو اگر ہمارے مدارس یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی رہیں، اور وہ اس زندگی میں اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں، زندگی کا استحقاق ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے اندر نافعیت پیدا کرنی چاہئے کہ زندگی کی کوئی ضرورت ہے، جو ان کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ زمانہ

جس زبان کو سمجھتا ہے، اور ہر زمانہ میں سمجھتا رہا ہے، اس کے لئے ترجمہ کی ضرورت نہیں، وہ آپ عربی میں کہئے تو زمانہ سمجھے گا، انگریزی میں کہئے تو سمجھے گا، اور زبان بے زبانی میں کہئے تو سمجھے گا۔ گونگا اس کو کہے گا، اس کا اظہار کرے گا تو زمانہ سمجھے گا، اور اگر اپنے زمانہ کا کوئی سحبان اور اپنے زمانہ کا کوئی لسان اس کا اظہار کرے گا تو زمانہ سمجھے گا۔ زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع کی زبان ہے، وہ زندگی کے استحقاق کی زبان ہے، زندگی جیسا کہ اقبال نے کہا ہے، ایک استحقاق ہے، زندگی کوئی خیرات نہیں، زندگی تو خود حاصل کی جاتی ہے۔ آپ اس کا استحقاق پیدا کر لیجئے تو دنیا آپ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی، جرمنی کو دو ہولناک جنگوں کے بعد بھی اس لئے باقی رکھا گیا ہے کہ اس نے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ اس کو ہمیشہ کے لئے کوئی ختم نہیں کر سکا۔ بہت سی قومیں دنیا میں ہیں جو بالکل ختم ہو گئیں، لیکن بہت سی قومیں ایسی ہیں جو بار بار شکست کھانے کے بعد بھی باقی ہیں۔ مسلمانوں نے تاتاریوں سے شکست کھائی اور ایسی کھائی کہ شاید دنیا کی کسی قوم نے ایسی شکست نہیں کھائی تھی لیکن چونکہ ان کے اندر **ما ینفع الناس** کا مادہ تھا۔ وہ ایک پیام رکھتے تھے، وہ ایک زندہ دعوت رکھتے تھے، اس لئے تاتاریوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑا، وہ تاتاریوں کے سامنے جھکے ان کی تلوار کے سامنے جھکے لیکن تاتاریوں کی تلواروں کو، دلوں کو اور دماغوں کو ان کی نافعیت کے سامنے، اور ان کے پیام کے سامنے جھکنا پڑا۔

میرے عزیزو! آج ہمارے دینی مدارس کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ زندگی کا استحقاق ثابت کریں، اپنا امتیاز ثابت کریں کہ اگر وہ نہ رہے تو زندگی بے معنی ہو جائے گی، یا زندگی ناقص ہو جائے گی اور کم سے کم ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگا، ایک بڑا شگاف اس زندگی کے اندر پیدا ہو جائے گا جس کو اور کوئی پُر نہیں کر سکتا۔ باقی رحم کی درخواست نہ کبھی دنیا میں سنی گئی ہے نہ کبھی سنی جا سکتی ہے، اور زمانہ تو جمہوریت کا ہے، جمہوریت بھی ایسی کہ اس نے اب کلّیت پسندی کو اور کمیونزم کو قبول کر لیا ہے، بالکل سو[illegible]

سمجھ کر ایک منزل کے طور پر، منزل ہی نہیں بلکہ ایک فیصلہ کے طور پر اس نے کمیونزم کو قبول کرلیا ہے تو اس میں تو اب بالکل اس کی گنجائش نہیں رہی کہ ہم یہ کہیں کہ بھائی ہمیں فلاں حکومت نے باقی رکھا، ہم فلاں دور میں باقی رہے، آپ بھی ہمیں باقی رکھئے یا آپ یہ کہیں کہ ہم نے جنگ آزادی میں اتنا حصہ لیا تھا۔ ہمارا استحقاق ہے۔ اس کو اب دنیا ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

آپ ایک اہم محاذ پر تعینات ہیں

آپ یہ ثابت کیجئے کہ آپ ایک ایسے مورچے پر کھڑے ہوئے ہیں، زندگی کے ایک ایسے محاذ پر کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپ نے وہ محاذ چھوڑ دیا تو اس کو سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ آپ ثابت کریں کہ آپ اخلاق کے محاذ پر کھڑے ہیں۔ خدمت خلق کے محاذ پر کھڑے ہیں، آپ علمی بلندی کے محاذ پر کھڑے ہیں، آپ علمی تحقیق کے محاذ پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اگر اپنی جگہ چھوڑ دی یا آپ کو اپنے محاذ سے ہٹا دیا گیا تو زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہوگا جس کو نہ یونیورسٹیاں پر کرسکیں گی، نہ علمی مجلسیں پر کرسکیں گی، نہ کوئی اکیڈمی پر کر سکے گی، اور نہ کوئی اور کوشش پر کر سکے گی۔ یہ ہے خدا کا بنایا ہوا وہ ابدی قانون جس کو قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ:

”فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً وَّاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ.“

پہلی بات تو یہ ہے کہ اب اس وقت ہمارے مدارس کہ محض مسلمانوں کے جذبۂ خیر، مسلمانوں کے دین پسندی، اسلام پسندی یہ محض مسلمانوں کے دین وشریعت کے احترام یا محض بعض علماء کی قربانی یا بعض علماء کی بزرگی کے بل پر قائم نہیں رہ سکتے، میں دل پر پتھر رکھ کر یہ الفاظ کہہ رہا ہوں اور خود مجھے اس سے تکلیف ہے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا

اظہار کم سے کم اس درسگاہ کے عزیز طلبہ کے سامنے ہو جانا چاہئے، جس کے بانی نے زمانہ کی نبض کو پہچانا، جس کے بانی نے سب سے پہلے اپنے دور میں یہ اعلان کیا کہ زمانہ بدل گیا ہے، زمانے کے جائز تغیرات کو واقعی تغیرات تسلیم کرنا چاہئے، اور اپنی افادیت ثابت کرنی چاہئے۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی فراست و بصیرت

حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ جن کو آپ حضرات ایک شیخ طریقت کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ بیشک وہ ایک بلند پایہ شیخ طریقت تھے، بہت عالی صاحب نسبت بزرگوں میں تھے اور اس کی شہادت ان کے تمام معاصرین نے دی ہے۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ان کے متعلق بہت بلند ہیں کہ اس کی بلندی تک ہماری رسائی ممکن نہیں لیکن اس میں اضافہ کرتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ بصیرت عطا فرمائی تھی، وہ ادراکِ صحیح اور نور باطن عطا فرمایا تھا جو بہت کم لوگوں کو ملا کرتا ہے، انہیں لوگوں کو ملتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ کوئی بڑا کام لیتا ہے۔ اقبال نے جو کہا ہے ان کو بالکل اس کا مصداق سمجھتا ہوں، ؎

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگ سمن گفت
ولے با من بگو آں دیدہ ورکیست
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت

ندوۃ العلماء کی تحریک دینی بصیرت کا نقطۂ عروج ہے

یہ ندوۃ العلماء کی تحریک معمولی تحریک نہیں ہے۔ یہ اس زمانہ کی دینی بصیرت کا نقطۂ

عروج ہے۔ میں آپ کو حضرت مولانا محمد علی کی درسگاہ کا طالب علم سمجھ کر خطاب کر رہا ہوں۔ میں جامعہ رحمانیہ اور ندوۃ العلماء کو کم جانتا ہوں۔ میں تو حضرت مولانا محمد علی کی درسگاہ کی حیثیت سے آپ کو بھی اور ندوۃ کے طلبہ کو بھی خطاب کرتا ہوں۔ دو تین دن پہلے ہی میں نے وہاں کے طلبہ کو خطاب کیا، یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ آج میں آپ کو خطاب کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔

کرنے کے دو کام

میرے عزیزو! اب میں تم سے یہ عرض کروں گا اور میں نے اس میں حضرت امیر شریعت کے مشوروں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، اور انھوں نے مجھے توجہ دلائی ورنہ ممکن ہے کہ میری اس گزارش کا رخ کچھ اور ہوتا۔ اب میں آپ سے آپ کی زبان اور آپ کے مطلب کی بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ دو طرح سے اپنی افادیت ثابت کر سکتے ہیں، اور اپنے وجود کو تسلیم کرا سکتے ہیں، اور زندگی کا استحقاق پیدا کر سکتے ہیں، ایک داخلی محاذ سے ایک خارجی محاذ سے، داخلی محاذ تو یہ ہے کہ آپ علم میں کمال پیدا کریں یہ بات میں آپ کو ایک ایسے جہاں گرد آدمی کی حیثیت سے بتاتا ہوں جس کے متعلق سپاسنامے میں بھی اشارے ہیں اور حضرت امیر شریعت نے بھی فرمایا، اس میں کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ مجھے باہر جانے کا اتفاق بار بار ہوا اور صرف باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا بلکہ مجھے وہاں کی ان مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا جو تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا کرتی ہیں، اور بعض اداروں سے میرا مستقل تعلق ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ اس گزارش کی قدر و قیمت سمجھیں۔ یہ کوئی عابر سبیل رستہ گزرنے والے آدمی کی بات نہیں، یہ اس شخص کی بات ہے جو ان مجلسوں میں بیٹھا ہے، اور ؎

"مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے"

میں نے مشرق و مغرب کے میخانے دیکھے ہیں، اس لئے آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ علم میں کمال پیدا کرنا خواہ وہ کوئی علم ہو آپ کے لئے مفید ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عربی میں اور علوم دینیہ میں کمال پیدا کریں گے تو جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا؟ بھلا اس کمال کا قدردان کون ہے یہ آپ کی بے خبری کی بات ہے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہاں سے لے کر امریکہ تک، یورپ تک میک گل تک، اور آکسفورڈ اور کیمبرج تک ہر جگہ اس علم کی قدر ہے بشرطیکہ آپ نے اس میں کوئی کمال حاصل کیا ہو۔ لیکن کمال کس کو کہتے ہیں، کمال شُد بُد کو نہیں کہتے، کمال کان یکون کو نہیں کہتے۔ کمال اس کو نہیں کہتے کہ آپ عربی کی عبارت پڑھ لیں اور سمجھ لیں، اس کا نام کسی نے بھی کمال نہیں رکھا۔ کمال وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔'' کمال وہ ہے جو اپنا اعتراف کرالے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں زمانے کے انقلابات و تغیرات کی یہ سب داستانیں بالکل بے بنیاد ہیں، یہ لوگ آپ کو بالکل دھوکہ دیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ آپ کہاں ہیں، کس چکر میں ہیں، آپ کہاں اپنا وقت کھو رہے ہیں۔ ارے بھائی کالج، یونیورسٹی میں پڑھا ہوتا، سائنس پڑھی ہوتی، انگریزی لٹریچر پڑھا ہوتا، آپ نے (ECONIMICES) اکنامکس کا مطالعہ کیا ہوتا، آپ نے فزکس کا مطالعہ کیا ہوتا، آپ نے (TECNOLOGY) ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کی ہوتی، یہ سب ابلہ فریبی اور خیام خیالی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ کمال آپ کسی چیز میں پیدا کریں اور امتیاز حاصل کرلیں، پھر آپ کو کبھی یہ شکایت نہیں ہوگی کہ زمانہ ہم کو نہیں پوچھتا، ہماری کوئی جگہ نہیں ہے۔ آج جو کچھ بھی آپ ہماری دینی تعلیم کا انحطاط دیکھ رہے ہیں وہ بے کمالی کی وجہ سے ہے۔

طِب یونانی کو اس لئے زوال ہوا کہ باکمال لوگ ختم ہو گئے

میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، شاید میں اور کوئی مثال دیتا تو اس کے سمجھنے

میں دقت ہوتی، یہ دیکھئے کہ ایک زمانہ میں سارے ہندوستان میں طب یونانی کا زور تھا۔ ہر ہر جگہ مطب کھلے ہوئے تھے اور ہندو اور مسلمان، اور نیک و بد اور جاہل و عالم سب حکماء کے پاس جاتے تھے اور ان کے مطب کا یہ حال تھا کہ بس ایک بھیڑ لگی رہتی تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ ایک تیر ان کے ہاتھ میں ہے۔ کیا آپ کہتے ہیں کہ طب یونانی کو زوال اس لئے ہے کہ ڈاکٹری آگئی ہے، ہومیو پیتھک آگئی ہے اور جدید میڈیسن آگئی ہے اس لئے طب یونانی کو زوال ہوا۔ میں بالکل نہیں مانتا، طب یونانی کو اس لئے زوال ہوا کہ اب اس طرح کے طبیب نہیں پیدا ہوتے، اب اس طرح کے ذہین طباع، ذی استعداد اور مجتہدانہ ذہن کے طبیب نہیں ہیں۔ اگر آج وہ پیدا ہو جائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے پاس ڈاکٹر جائیں۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں، آپ کے شہر کا سول سرجن جھک مار کر کے ان کے پاس جائے۔ جب اس کی تکلیف رفع نہیں ہوگی تو کیا کرے گا۔ آپ ایک ایسا طبیب پیدا کر دیجئے میں جالینوس اور بقراط کا نام نہیں لیتا۔ میں افسر الاطباء حکیم عبد العلی جھوائی ٹولہ اور مسیح الملک حکیم اجمل خان کا ذکر کرتا ہوں، حکیم محمود خان کا ذکر کرتا ہوں، اگر ان کے پائے کا نہیں ان کے آدھے کمال کا بھی کوئی پیدا ہو جائے تو طب یونانی کے زوال وغیرہ کی ساری داستان ختم ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ طب یونانی زندہ ہے، بات یہ ہے کہ پہلے درس نظامی پڑھ کر لوگ طب کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ جتنے بڑے بڑے علماء ہیں تقریباً طب پڑھتے تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مجھے معلوم نہیں، لیکن اکثر علماء اس زمانہ میں طب پڑھتے تھے، ان میں سے بعض پیشہ کے طور پر اس کو اختیار کر لیتے تھے اور بعض اس سے اشتغال نہیں رکھتے تھے، وہ منطق و فلسفہ پڑھے ہوئے اور اشارات طوسی وغیرہ پڑھے ہوئے۔ حل کئے ہوئے جب طب کی طرف جاتے تھے، ذہین خاندانوں کے افراد ہوتے تھے، محنت کرتے تھے تو ان کو ایک ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا تھا کہ نبض پر ہاتھ رکھا اور اندر تک پہنچ گئے۔ ایک ایک رگ و

ریشہ کو پہچان لیا۔

مدارس کا بھی یہی حال ہے

یہی ہمارے آپ کے درس کا حال ہے، آپ کسی علم میں کسی فن میں اختصاص پیدا کر لیں، امتیاز پیدا کر لیں، دنیا آپ کا لوہا مانے گی، اور معاشی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور مدارس کا جو مسئلہ اس وقت ہمارے یہاں درپیش ہے یہ سب ختم ہو جائے گا۔ یہ سب دراصل ہماری پست ہمتی، سست کوشی اور ہماری کام چوری کی عادت کا نتیجہ ہے کہ آج کوئی استعداد پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ تجربہ تو ہمارے مولانا منت اللہ صاحب کو ہوگا کہ وہ دیوبند دیکھتے رہتے ہیں، ندوۃ میں دیکھتے رہتے ہیں، دونوں جگہ کے وہ اہم بنیادی رکن ہیں، کہ کس طرح کے فضلاء نکل رہے ہیں۔ دورہ کا امتحان لینے کے لئے لوگ گئے اور معلوم ہوا کہ عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ پہلی حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِیٍٔ مَّا نَوٰی ہی کو غلط پڑھا اور ترجمہ بھی غلط کیا۔ اسی طرح کے فضلاء مسلسل ادھر کئی سال سے نکل رہے ہیں، میرے خیال میں کوئی بیس سال سے یہ انحطاط نمایاں طریقے پر شروع ہو گیا ہے، اور پھر یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہمارا زمانہ نہیں رہا۔ ہمارے والدین نے ہماری عمر برباد کی۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے کسی فن میں امتیاز پیدا کر لیا، اور جہاں ہیں وہاں مرجع خلائق ہیں، اور ان کا اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے۔ اگر کسی نے کسی ایک صنف میں بھی کوئی امتیاز پیدا کر لیا تو بس پھر اس کے لئے فقرو فاقہ اور پریشانی بھی ختم اور اگر ہو گی بھی تو وہ کسی اپنی کمزوری کی وجہ سے ہو تو ہو۔ میں ابھی مولانا کی مجلس میں کہہ رہا تھا کہ میں نے دارالعلوم مظاہر العلوم میں اس مہینہ کے شروع میں غالباً وسط فروری میں تقریر کی تھی اس میں میں نے کہا تھا کہ اگر تم کسی صاحب کمال کے بارے میں سنو یا تاریخ میں پڑھو کہ وہ ضائع ہوا یا اس کی قدر نہیں ہوئی تو یقین مانو کہ

اس کے اندر کوئی کمزوری ہے، کوئی سنک تھی، مراق تھا، سخت غرور تھا، گالیاں دیتا تھا، مارنے کے لئے دوڑتا تھا، اور سونے پر آیا تو سوتا چلا جا رہا ہے۔ جاگنے پر آیا تو جاگتا چلا جا رہا ہے، ایسی کوئی اس کے اندر مراق کی بات تھی اس وجہ سے لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ ورنہ میں نہیں مانتا کہ کوئی صاحب کمال جس کے اندر توازن اور اعتدال ہو وہ ضائع ہوا ہو۔

اصل مسئلہ محنت کا ہے

میں آپ سے ایک بات اور بھی کہہ دوں حالانکہ وہ میری زبان سے آپ اس کو سننے کے بالکل متوقع نہیں ہوں گے، اور وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری درسگاہ ندوۃ العلماء کی بنیاد ہی اصلاح نصاب پر ہے، حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ قدیم نظامِ تعلیم کا ساختہ و پرداختہ اور اس کا بہترین نمونہ، وہ اس کا داعی، اور ہم بھی اس کے داعی، اور مولانا منت اللہ صاحب بھی اس کے موید۔ لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ زیادہ مسئلہ نصاب کا بھی نہیں زیادہ مسئلہ محنت کا ہے اور اساتذہ کے پڑھانے کا ہے۔ قدیم نصاب سے وہ لوگ تیار ہوئے جو آج جدید نصاب سے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے، حالانکہ یقینی بات ہے کہ قدیم نصاب سے جدید نصاب کی بعض چیزیں یقیناً بہتر ہیں مثال کے طور پر جس زمانہ میں نفحة اليمن اور مقامات حریری پڑھائی جاتی تھی اور نثر کی کوئی ڈھنگ کی کتاب نہ تھی جس سے زبان و ادب کا صحیح ذوق اور اظہار خیال کی صلاحیت پیدا ہو، اس وقت تو ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ علامہ زبیدی پیدا ہوئے، مولانا غلام علی بلگرامی پیدا ہوئے، شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی پیدا ہوئے اور نواب صدیق حسن خان پیدا ہوئے، اور مولانا صدرالدین آزردہ پیدا ہوئے اور اب جب کہ نثر کی اچھی اچھی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں اور اس میں عربی زبان

کے بہترین نمونے جمع کر دیئے گئے ہیں، آج ایسے لوگ نہیں پیدا ہو رہے۔ اگر نصاب اس کا ضامن ہوتا تو اب پیدا ہونا چاہئے اور ہم ہی لوگوں کو دیکھ لیجئے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی ہمارے رفیق تھے اور ہمارے بڑے دوستوں میں تھے انہوں نے عربی لکھنے میں بڑا کمال پیدا کیا اور انھوں نے پڑھا کیا تھا، یہی حریری وغیرہ پڑھی تھی۔ میرے زمانہ میں بھی مختارات وغیرہ لکھی گئی تھی۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں میں نے بھی حریری پڑھی اور دوسری کتابیں پڑھیں تو اس میں بہت کچھ انحصار اساتذہ کی محنت اور ذوق آفرینی اور طلبہ کی محنت اور جدوجہد پر ہے۔ نصاب معاون ہے، میں اب بھی نصاب کے تغیر کا داعی ہوں، لیکن تنہا اس پر انحصار نہیں۔

اصل بات

حضرات گرامی! اصل میں شکایت تو یہ ہے کہ آپ حضرات نے محنت کرنی چھوڑ دی ہے۔ آپ حضرات کے اندر ولولہ نہیں، مسابقت کا جذبہ نہیں، آپ حضرات کسی میں کامل ہونے اور درس کی قوت پیدا کرنے کو فخر کی چیز ہی نہیں سمجھتے، اور ہمارے اسلاف ایسے تھے کہ ان کو بادشاہی ملتی ہو تو مدرسی کی خاطر اس کو وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ مدرس بننے میں وہ اتنا بڑا اعزاز سمجھتے تھے کہ وزارت کو ٹھکرا دیں، اور بعض بعض ایسے حضرات تھے کہ ہیں وزیر درس دے رہے ہیں، لکھنؤ میں وزیر آصف الدولہ کے زمانہ میں سعادت علی خان کے زمانہ میں ہر روز ان کے یہاں رات کو درس ہوا کرتا تھا اور دن کو وزارت کا کام ہوا کرتا تھا۔ ایسی بہت سی آپ کو مثالیں ملیں گی۔ تفضّل حسین علامہ ریاضی کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں، یہ وزیر اودھ تھے۔ لیکن درس اس طرح دیتے تھے کہ گویا صرف مدرس ہیں۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں لیکن اب ہمارے آپ کے اندر مدرس بننا وجہ افتخار نہیں رہا بلکہ ہم اس سے شرماتے ہیں کہ ہم مدرس بن جائیں، تو ایک بات آپ سے یہ کہنا ہے کہ

داخلی طور پر آپ استعداد درست کیجئے محنت کیجئے اور پتہ پانی کیجئے......اور دل ماریئے اور کسی فن میں کمال پیدا کیجئے۔

میرے عزیزو! آج ہمارے مدارس میں اس وقت جو بہت بڑا مسئلہ ہے جس کو کرائسس کہنا چاہئے وہ ہے مدرس کا مسئلہ۔ آج مدرس نہیں مل رہے ہیں، ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اتنی بڑی درسگاہ لئے بیٹھے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں دو تین مدرس بعض فنون کے مل جائیں وہ نہیں مل رہے ہیں اور دیوبند کو اس وقت شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے اب یہ بات آپ کے لئے راز نہیں رہی کہ دیوبند میں شیخ الحدیث کا مسئلہ مناسب طریقہ پر حل نہیں ہو سکا۔ آج مولانا منت اللہ صاحب اس کے رکن رکین ہیں، اور وہ خاص کمیٹی جس نے یہ فیصلہ کیا اس میں وہ شریک ہیں، لیکن وہ بھی مطمئن نہیں ہیں، میں بھی مطمئن نہیں ہوں، کوئی مطمئن نہیں، یعنی جو دار العلوم کی روایت تھی، جو دار العلوم کا معیار تھا اس کے مطابق ابھی مسئلہ حل طلب ہے۔ کوئی مدرس نہیں مل رہے ہیں، اس لئے میں کہتا ہوں، یہ کام آپ کریں، آپ بالکل نہ دیکھیں کہ آپ گوشے میں پڑے ہوئے ہیں، آپ دیوبند میں نہیں پڑھ رہے ہیں، آپ ندوۃ میں نہیں پڑھ رہے ہیں۔ ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا ہے، آپ یہاں کمال پیدا کیجئے، دیوبند آپ کا محتاج ہوگا، ندوۃ آپ کا طالب ہوگا، میں آپ کو لکھے دیتا ہوں کہ آپ جس وقت کسی فن میں کمال پیدا کرلیں، دیوبند میں آپ کی جگہ محفوظ، ندوہ میں آپ کی جگہ محفوظ۔

دینی صلاحیت پیدا کیجئے

ایک بات تو آپ سے یہ کہنا ہے، اور دوسری بات یہ، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر دینی صلاحیت پیدا کیجئے۔ آپ کے اندر علمائے ربانی کے کچھ اوصاف ہوں، آپ کے اندر اس سیرت کی جھلک ہو جو ان بزرگوں میں تھی۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب، ان

کے معاصرین اوران کے ساتھیوں میں تھی، کچھ استغناء ہو، کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق ہو کچھ آپ کو عبادت میں ذوق آئے، عوام کی سطح سے آپ کی سطح بلند ہو، اب یہ دو چیزیں ہوئیں، فن میں کمال اور تعلق مع اللہ، یعنی جو علمائے ربانی کا شعار تھا کہ ان کے دیکھنے سے خدا یاد آتا تھا، ان کے پاس بیٹھنے سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی تھی اور دل میں گداز اور ایک قسم کی حرارت پیدا ہوتی تھی۔ خدا کی محبت جوش مارتی تھی، کسی درجہ میں وہ بات پیدا ہو، یہ تو آپ کو داخلی طور پر کرنا ہے۔

خارج کے دو کام

خارجی طور پر میں دو باتیں آپ سے کہوں گا کہ یہ آپ کے کرنے کے کام ہیں۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں اس وقت ایک ایسی مجلس میں گفتگو کر رہا ہوں۔ جس میں امیر شریعت تشریف رکھتے ہیں، اور جہاں اس نظام سے وابستہ بہت سے لوگ ہیں، میں بالکل دیانۃً آپ سے عرض کر رہا ہوں، اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ آپ نے جب میرا استقبال کیا ہے، مجھ پر اعتماد کیا ہے تو مجھے کہنا چاہئے کہ ایک کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ کم سے کم صوبہ بہار واڑیسہ میں امارت کے نظام کو پھیلائیے اور پورے صوبہ میں اسی کا جال پھیلا دیجئے۔ کوئی گاؤں اور کوئی قصبہ اس سے خالی نہ ہو۔ یہ آپ کے اس صوبہ کے لئے اتنی بڑی نعمت ہے کہ مجھے اگر رشک آتا ہے اہل بہار پر تو اسی پر آتا ہے۔ یہاں اور بہت سی رشک کے قابل چیزیں ہوں گی، میں ان کا انکار نہیں کرتا، لیکن مجھے سب سے زیادہ یہ رشک آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نعمت سے نوازا ہے کہ یہاں ایک نظام شرعی قائم ہے اور لوگ اس کی قدر نہیں سمجھ رہے ہیں، اور بہت سے لوگ اس نظام کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں آج ریل پر کہہ رہا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے بڑے سے بڑے آدمی سے قیامت میں سوال ہوگا کہ تم نے بغیر شرعی نظام کے زندگی

گزاری، تمہارا کوئی نظام نہیں تھا، کتنی سخت حدیثیں آئی ہیں کہ بعض مرتبہ آدمی کانپ جاتا ہے، تو میں آپ سے صفائی کے ساتھ یہ کہتا ہوں، مولانا ہوتے یا نہ ہوتے میں یہی کہتا کہ آپ کا پہلا فرض یہ ہے یہاں سے نکلنے کے بعد آپ اس امارت شرعیہ کے کام کو وسیع اور مستحکم کریں اور سارے صوبے میں اس کی شاخیں بنائیں۔ اڑیسہ کے حالات سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں، لیکن کم سے کم بہار اور اڑیسہ کے بھی اگر طلبہ یہاں ہوں تو میں ان سے بھی کہتا ہوں کہ دونوں صوبوں کو اس نظام کے دامن میں لانے کی کوشش کریں اور اس نظام سے ایسا مربوط کردیں کہ پورے صوبہ میں زندگی بالکل شرعی طریقے پر گزرنے لگے اور بلکہ بہت اچھا ہوتا کہ جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام ہے، شریعت کی تفصیلات وغیرہ کے ساتھ کہ مثلاً اموال ظاہرہ کی زکوۃ جمع کی جائے۔ اموال باطنہ کے متعلق نہیں کہتا اور اگر اس کا موقع ہو تو آخر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے وہ نظام بھی نافذ تھا۔ بہر حال یہ آپ کا پہلا کام ہے، میں اس کام پر کسی کام کو ترجیح نہیں دیتا، آپ نے اگر یہ کام کر لیا تو آپ نے نہ صرف اس مدرسہ اور جامعہ رحمانیہ کا حق نمک ادا کیا اور اس کے ساتھ آپ نے وفاداری کی اور اس کے سپوت ثابت ہوئے بلکہ آپ نے اس وقت دینی مدارس کے فرزندوں میں ایک امتیازی مقام پیدا کیا۔

دوسری چیز دینی مکاتب کا قیام ہے، معاف کیجئے گا میں اس وقت عربی مدارس کی افادیت کا اتنا قائل نہیں ہوں کہ قصبے قصبے میں ہوں، اور ہر جگہ دورہ ہو، اور ہر جگہ بخاری شریف ضرور ختم ہو، لیکن ان مکاتب کی ضرورت زیادہ ہے، یعنی مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف کرانا، اردو کا تحفظ اور دینیات سے واقفیت اور حلال وحرام اور اس سے بڑھ کر کفر وایمان اور توحید وشرک، ان کا امتیاز ان کو ہو جائے۔ ہمارے ملک میں آج تیزی کے ساتھ کمیونزم لایا جارہا ہے اور کوئی موقع کوئی فرصت کوئی لمحہ اس کے لئے ضائع نہیں کیا جارہا ہے، ہم آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور تیزی کے ساتھ ہندوستان بدل رہا

ہے۔ ہر چیز کو نیشنلائز کیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹیوں کی باری آ گئی مسلم یونیورسٹی کی باری آ گئی، کل مدارس کی باری آ سکتی ہے، تو اس کے لئے مکاتب کا جال بچھا دیجئے، اور مساجد کو مسلمانوں کی زندگی کا مرکز بنائیے۔ سب سے آخر میں انقلاب کے قدم جہاں پر پہنچیں گے وہ مسجدیں ہیں، اس لئے آپ ایسی جگہ اپنے مرکز بنائیے، جہاں دیر میں انقلاب پہنچے یا وہاں تک انقلاب پہنچتے پہنچتے قیامت آ جائے ممکن ہے موقع ہی نہ ملے تو آپ مساجد کو مرکز بنائیے اور کثرت سے مکاتب قائم کیجئے اور بالکل اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ آپ نے مدرسہ میں یہ پڑھا تھا، اور وہ علوم عالیہ اور معارف اور حقائق پڑھے تھے اور اب یہاں بچوں کو پڑھا رہے ہیں، دیہاتیوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے علم ضائع کیا کبھی اس کا خیال نہ کیجئے۔ مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور اسلام کا تحفظ، یہ دو محاذ ہیں، یہاں رہتے ہوئے استعداد پیدا کرنا اپنے علم میں کمال پیدا کرنا، اچھے مدرس بنانا اور باہر امارت شرعیہ کا نظام اور مکاتب کا قیام۔ اگر آپ نے یہ دو چیزیں کرلیں تو آپ **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** کے مصداق ہوں گے اور کوئی بے رحم بے درد ہاتھ کوئی ظالم ہاتھ اور کوئی انقلاب و تغیر آپ کے نقش کو نہیں مٹا سکتا اور آپ کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور سچی بات ہے کہ آپ کے لئے انقلاب نہیں ہے۔ آپ کے لئے کوئی تغیر نہیں ہے اس لئے کہ آپ نے اپنی نافعیت ثابت کر دی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں اس کے لئے خاص طور پر ضمانت ہے جو دین کے ذریعہ دین کے راستہ میں اپنی نافعیت ثابت کر دے، جب ہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا۔ **ان تهلک هذه العصابة لن تعبد**، اے اللہ تیری عبادت کا انحصار ان پر ہے۔ تیری توحید کی منادی کا انحصار ان پر ہے۔ آپ بھی ثابت کر دیجئے کہ **اللهم ان تهلک هذه العصابة لن تعبد فی هذه الارض** کم سے کم یہیں ہندوستان کے متعلق کہہ دیجئے پھر کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

میری درخواست

بس بھائیو! اگر آپ نے میری یہ باتیں یاد رکھیں، ہوسکتا ہے اس میں آپ کوئی جوش خروش نہ پائیں کوئی خطابت نہ پائیں، کوئی علمی تحقیق نہ پائیں لیکن یہ آپ کے کام کی باتیں ہیں، تو انشاء اللہ آج سے دس برس کے بعد معلوم ہوگا کہ آپ نے ایک بہت بڑا حصار قائم کرلیا، نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام مدارس کے لئے اور دینی دعوت اور اس کے کام کے لئے، اگر یہ نہیں ہے تو مجھے ان دینی مدارس کے بند ہونے کا بہت خطرہ ہے، اس کا اندیشہ ہے کہ ان کی جائدادوں کو اور ان کے وسائل کو اپنے انتظام میں لینے کا بہت جلدی مطالبہ شروع ہو جائے اور ہم اس کا مقابلہ نہ کرسکیں، لیکن اگر آپ نے اللہ تعالیٰ کے یہاں مدد کا استحقاق پیدا کرلیا اور یہاں آپ نے زندہ رہنے کا استحقاق ثابت کردیا تو انشاء اللہ پھر انقلاب کی کوئی دست برد آپ کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

رحم کی اپیل پر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی

اور اگر یہ نہیں تو محض تاریخ کے سہارے محض روایات کے سہارے اور محض رحم کے استغاثے کے بل پر اس کی بنیاد پر نہ کوئی جماعت رہ سکتی ہے نہ کوئی ادارہ رہ سکتا ہے نہ کوئی تنظیم رہ سکتی ہے۔ اگر آپ کسی پیام کے منتظر ہوں تو میرا پیام آپ کے سامنے یہی ہے۔ اگر آپ کسی درخواست کو سن سکیں تو میری یہ آپ سے درخواست ہے۔ اگر آپ کسی مشورے کے طالب ہوں تو میرا آپ کو یہی مشورہ ہے، اس کے علاوہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھائے۔ آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایک بڑی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہیں، ایک مرکز کے ساتھ وابستہ

ہیں، اور وہ مرکز ایسا ہے کہ علم سے بھی اس کا تعلق ہے اور امارت سے بھی اس کا تعلق ہے، مدارس سے بھی اس کا تعلق ہے میں دعا کرتا ہوں کہ آپ ان کے دامنِ تربیت میں پورے طور پر پرورش پائیں، ترقی کریں، اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں، اور اپنے علم سے ملت کو ملک کو اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچائیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

زبان وادب کی اہمیت اور اس کی ضرورت

انجمن الاصلاح خورد، رواق سلیمانی کا افتتاحی جلسہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی صدارت میں ۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ کو بعد نماز مغرب سلیمانیہ ہال میں منعقد ہوا مولانا رحمہ اللہ نے طلباء سے یہ خطاب فرمایا جس میں طلبۂ مدارس کو اپنے اندر قوت بیانیہ پیدا کرنے پر ابھارا گیا ہے۔

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين و خاتم النبين محمد واله وصحبه اجمعين ومن تبعهم باحسانٍ ودعا بدعوتهم الىٰ يوم الدين ، اما بعد!

عزیز بھائیو اور فرزندان دار العلوم!

مجھے بہت خوشی ہے کہ الاصلاح کی اس دوسرے بازو اور اس دوسرے خاندان میں آنے اور اپنے عزیزوں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا ہے، الاصلاح درحقیقت اس قوت بیانیہ کو پیدا کرنے کی جگہ ہے جو زبان وقلم کے ذریعہ سے وقت اور دین کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور دین پر جو حملے ہو رہے ہیں ان کا جواب دے سکے اور پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام پر وہ اعتماد بحال کر سکے، جو متزلزل ہوتا جا رہا ہے، اور جس کے بہت سے اسباب ہیں اور ان اسباب پر کتابوں میں اپنے اپنے رتبہ اور اپنی اپنی وسعت کے مطابق بحث کی جا چکی ہے، کل النادی العربی کے جلسے میں میں نے کہا تھا کہ اللہ کی ذات بے نیاز ہے، غنی ہے، اس کو نہ وسائل کی ضرورت ہے نہ طاقتوں کی، خواہ جسمانی

ہوں، غیبی ہوں، یا مصنوعی ہوں، کسی چیز کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ قوت بیانیہ کا ایک نعمت کے طور پر تذکرہ کیا ہے اور اس کی تاثیر بیان کی ہے مثلاً اس نے کہا کہ

"نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ."

یہاں تک ہی کافی تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے لحاظ سے کہ لتکون من المنذرین "تاکہ آپ ڈرانے والے بنیں" لیکن اس کے بعد فرماتا ہے بلسان عربی مبین۔ آپ ڈرانے والے بنیں ایسی عربی زبان میں جو واضح کرنے والی ہو دل نشین ہو اور جو دل ودماغ کو متاثر کرے اور جو یقین پیدا کرے اور پھر فرمایا

"اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن."

(سورۃ یوسف)

یہاں عربی کہنے کی ضرورت کیا تھی اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْاٰنًا کافی تھا لیکن چونکہ اہل عرب مخاطب ہو رہے ہیں اور عرب ہی داعی اول ہیں دین کے۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لئے نہ صرف عربی زبان کا انتخاب کیا بلکہ عربی مبین کہا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا جہاں ذکر کیا ہے خلقت انسانی کے موقع پر تو وہاں پر بھی اس کو فراموش نہیں کیا یہ تو کہنا بے ادبی ہے۔ بلکہ اس کو ترک نہیں فرمایا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ"

(سورۃ الرحمن)

اور انسان کو پیدا کیا اور آگے فرماتا ہے کہ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اس کو قوت بیانیہ عطا کی، اس کو سلیقہ دیا، اس بات کا کہ وہ اپنی بات کو واضح کر سکے دل نشین کر سکے تو یہ ایک طاقت ہے،

اس لئے اس طاقت کا استعمال جن لوگوں یا جس گروہ اور جس ذہنیت اور مقاصد کے حامل لوگوں کے ہاتھ میں جاتا ہے، اس سے لوگ ویسا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اگر وہ......ضالّین ومضلّین کے ہاتھوں میں چلا جائے قوت بیانیہ ان کو ملے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں تو وہ جاہلیت کی دعوت کا کام کرتے ہیں اور عقائد سے لے کر اخلاق وسلوک اور پورے انسانی تعلقات سب کو متاثر کرتے ہیں اور دنیا کی بین الاقوامی تاریخ میں ایسا واقعہ اور ایسا دور بار بار آیا ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں قلم پہنچ گیا اور قلم تو خیر ہر ایک لے سکتا ہے لیکن وہ چلنے والا اور متاثر کرنے والا قلم پہنچ گیا، اور ان کو وہ زبان ساحر اور بیان ساحر مل گیا، جس سے وہ بگاڑ پیدا کرسکیں اور ایک ایسا ادب وجود میں آیا جس نے پورے معاشرہ کو متاثر کیا، آپ یونان کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت بڑا حصہ اس ادب کا تھا جو یونان سے پیدا ہوا، لادینیت کا ادب، تشکیک کا ادب، نفس پرستی کا ادب ان کو ملاحم یا رزم نامہ اور شاہ نامہ کہتے ہیں۔ اگر یونانی شاہ نامے پڑھیں گے جن کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے خود عیسائیوں نے کیا ہے اور کچھ تاریخ میں محفوظ بھی ہے، پھر اگر آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے فساد کی بہت بڑی علت یہ تھی کہ قلم وزبان ان لوگوں کے قبضہ میں آگئے جن کو نہ خدا کا خوف تھا نہ انسانیت سے محبت ہی تھی اور نہ محاسبہ کا کوئی ڈر تھا، اور وہ نفس پرست تھے اور وہ فساد کے داعی تھے، ان کا ایسا اثر ہوا آپ کو معلوم ہے کہ یورپ بالکل ان کے پھندے میں پھنس گیا، گبن کی مشہور اور شہرہ آفاق کتاب FOROPEAN EMPIRE پڑھیں یا ڈریپر کی CONFLINT BETWEEN RELIGIONAND SCIENCE پڑھیں، معرکہ، مذہب وسائنس، یہ میں آپ کو بتا دوں کہ میں الاصلاح کا ممنون ہوں کہ میں جب یہاں پڑھتا تھا تو تعلیم کے آخری دور میں حسب استطاعت جب یہاں تدریسی کام میرے سپرد ہوا تو مجھے اس کتاب کی ضرورت تھی، میں انگریزی جانتا تھا، انگریزی پڑھی تھی اور محنت سے میں اصل انگریزی میں کتاب پڑھ سکتا تھا۔

CONFLINT BETWEEN RELIGION AND SCINECE۔ لیکن مجھے یہاں اس کا ترجمہ مل گیا، مولانا ظفر علی خان کا شاہکار ترجمہ ہے۔ معرکۂ مذہب و سائنس، یہ مجھے الاصلاح سے ملا اور ایسے ہی HISTORY OF EORAPEAN MORALS تاریخ اخلاق یورپ تھی یہ بھی میرے لئے کام کی چیز تھی اور ان دونوں کتابوں سے میں نے اپنی کتاب ما ذا خسر العالم میں فائدہ اٹھایا، اس لئے کہ ان دونوں کتابوں کے ترجمے ہو گئے تھے، اور بڑے لائق مترجمین کے قلم سے جو سند کا درجہ رکھتے تھے، ایک مولانا ظفر علی خان صاحب کے قلم سے ہوا تھا، ایک مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے قلم سے، میں الاصلاح کا ممنون ہوں، احسان مند ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ الاصلاح میں یہ صلاحیت باقی رہے کہ اس سے لوگ اپنی تصنیف و تالیف میں اور تحقیقات میں کام لے سکیں میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اپنے ذخیرہ کتب پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہئے کہ کون سی کتابیں ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں جو ہمارے طلبہ ہی نہیں بلکہ اساتذہ کی نظر سے گزرنی چاہئیں اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں اور میں نے خود اپنے متعلق شہادت دی ہے کہ اساتذہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، الاصلاح کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے، اس لئے نہیں ہے کہ وہاں جا کر اخبارات پڑھے جائیں، اخبارات تو آپ ہر جگہ پڑھ سکتے ہیں، کون سی جگہ ہے جہاں اخبار نہیں آتا، یا آپ رسائل پڑھنے آئیں، سطحی قسم کے رسائل پڑھیں، جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے نکلتے ہیں، آج کل تو ہر مدرسہ سے ہر ادارہ سے انجمن سے ہر شہر سے رسالے نکلتے ہیں۔ ایسی چیزیں ہونی چاہئیں، الاصلاح کے دار الکتب میں جن سے ذہن بنے اور جن سے با مقصد مصنفین اور داعیوں کو اصلاح ملے جن سے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کر سکیں، یہ الاصلاح کی بہت بڑی افادیت اور بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اور اس وقت ضمناً میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے لئے میں ایک ذمہ دار اور ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے یہ صفائی سے کہتا ہوں کہ اس میں اہتمام و نظامت

دونوں آپ کی مدد کرنے اور آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ نئی کتابوں کی فہرست تیار کریں، اچھے اہل نظر کے مشورہ سے اور سنجیدہ اور فکر انگیز اور مواد فراہم کرنے اور رہنمائی کرنے والی کتابوں کی، اور اس کے بعد آپ کا بجٹ اس کے لئے کافی نہ ہو تو میں اعلان کرتا ہوں کہ دار العلوم اس میں مدد کرے گا، تو اس وقت یہ قوت بیانیہ خواہ وہ تحریری ہو یا تقریری ہو اس وقت اور زیادہ مسلح ہوگئی ہے اور مسلح ہی نہیں بلکہ جیسا کہ ہمارے عزیز الاصلاح کے غالباً ناظم ہیں انھوں نے جو مضمون پڑھا اس میں انھوں نے کہا کہ یہ بات میں نے بہت دن پہلے کہی تھی کہ صدیوں کے بعد یہ بات پیش آئی ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی وسائل و طاقت دونوں متّحد ہو گئے ہیں حالانکہ دنیا کے جن دو مذہبوں میں زیادہ سے زیادہ تضاد ہوسکتا ہے وہ یہودیت اور عیسائیت ہیں، عیسائیت کی بنیاد اس پر ہے کہ مسیح ابن اللہ ہیں اور یہودیت کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ حضرت مسیح پر تہمت لگاتے ہیں، نسبی تہمت لگاتے ہیں، جو کوئی عیسائی برداشت نہیں کر سکتا، لیکن اس کو عیسائیوں نے فراموش کر دیا یہاں تک کہ پاپائے اعظم نے یہ قصور معاف کر دیا یہودیوں کا جو عیسیٰؑ پر اعتراض کرتے تھے تہمت لگاتے تھے، تو اس وقت ایک بڑی گہری سازش ہے دنیا میں اور یورپ نے اس وقت عنوان اختیار کیا ہے FUNDAMENTALISM کا یعنی روس کے زوال کے بعد امریکہ نے یہ سمجھ لیا اور برطانیہ اور عیسائی و یہودی بڑی طاقتوں نے کہ اگر اب خطرہ ہوسکتا ہے اور کوئی حریف میدان میں آسکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اس لئے بڑی ہوشیاری سے اور اس میں یقیناً یہودی دماغ کام کر رہا ہے، انھوں نے اس کو عنوان دیا ہے FUNDAMENTALISM کا اصول پرست، گویا قدامت پرست، اور حق پرست یا یوں کہئے کہ جو قدیم ذخیرہ ہے اس کے پرستار، اس کی اصطلاح کی جگہ پر FUNDAMENTALIST کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے اور اس قدر پروپیگنڈہ ہے اور اس زور و شور سے اور بلند آہنگی کے ساتھ اور ایسے مدلل بلکہ منظّم طریقہ پر یہ بات کہی جا

رہی ہے کہ کسی آدمی کے لئے مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ میں FUNDAMENTALIST ہوں حالانکہ ایک مذہبی کے لئے FUNDAMENTALIST ہونا ضروری ہے، مذہبی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ منصوصات قطعی، پرنصوص دین پر، آسمانی صحیفوں پر اور کتاب اللہ پر...... عیسائی اگر ہو تو انجیل اور اگر مسلمان ہے تو اللہ کے آخری کلام قرآن مجید کے بیانات پر اس کے احکام پر اس کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور اس وقت یہ FUNDAMENTALIST کی اصطلاح اتنی عام ہوگئی ہے کہ بہت ہی تأسف اور ندامت کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ممالک عربیہ میں بھی یہ اصطلاح پہنچادی گئی ہے، ابھی ہمارے پاس ایک خط آیا شاید ایک ہفتہ یا دو ہفتہ ہوا میں نام نہیں لوں گا اور ایک ایسی جگہ سے آیا کہ جہاں کے حاکم وسلطان ہم سے ذاتی طور پر واقف ہیں احترام کرتے ہیں ہمارا ان کا لندن میں ساتھ رہا ہے اور انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اپنے منطقہ میں جس جگہ کے وہ امیر ہیں ایک سڑک کا نام ہمارے نام پر رکھا تھا "شارع ابی الحسن ندوی" اتنا وہ خیال کرتے ہیں اور ایک بڑے بین الاقوامی ادارے میں وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں ان کے عزیز قریب کیا بلکہ ان کے ترجمان کا خط آیا ہمارے نام کہ متشددین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، ہم چند مفکروں اور چند علماء کے نام یہ سوال نامہ بھیج رہے ہیں کہ متشددین کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں جس کو عربی اصطلاح میں متطرفین کہتے ہیں، انتہا پسند FUNDAMENTALIST کا ترجمہ اصلاً مبدئین ہے، جو مبادی پر یقین رکھتے ہیں۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کا سارا فساد اس لئے ہے کہ کسی اصول پر یا کسی بنیاد پر یقین نہیں ہے خالص نفس پرستی ہے، اور خالص فائدہ اندوزی اور اپنے نفس کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ہے، خواہ تمام دنیا کے مسلمہ اخلاقی اصول کے خلاف ہو، چاہے اس کا پوری انسانیت، پورے معاشرے انسانی اور پورے عہد پر کچھ اثر پڑے لیکن

اپنا کام نکالنا ہے۔ یہ معنی تھے بے اصولی کے اور اس بے اصولی نے آج دنیا کو اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ کسی وقت قیامت آسکتی ہے، وہ قیامت تو اللہ تعالیٰ لاسکتا ہے، اس قیامت کا ذکر نہیں، ایک ویسی قیامت یعنی قیامت صغریٰ ہر وقت ہوسکتی ہے، پہلی جنگ عظیم بھی ایک طرح کی قیامت صغریٰ تھی، دوسری جنگ عظیم بھی، ایسی جنگیں ہوسکتی ہیں اور اس سے بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہیں وہ صرف برطانیہ اور جرمنی کی جنگ تھی اور اس میں کچھ اور طاقتیں شامل ہوگئی تھیں اور دوسری جنگ بھی ایسی ہی تھی لیکن اب جو جنگ ہوگی وہ بہت خطرناک ہوگی، اس وقت ایٹمی ہتھیار بھی نہیں تھے اور اب ایٹمی ہتھیار بھی ہیں، اور دوسرے یہ کہ اس جنگ کا رقبہ اس جنگ سے کہیں زیادہ وسیع ہوگا اور یہ سب نتیجہ ہوگا بے اصولی اور نفس پرستی کا اور مطلق آزادی کا اور ظاہر بینی کا لیکن ان کو شرم نہیں آتی انھوں نے یہ اصطلاح ایجاد کی حالاں کہ سارا فساد یہی ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

یہ کیا ہے کہ اس کی اصل بنیاد آپ دیکھیں اور قرآن مجید کے پورے سیاق وسباق پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ میں یہی بے اصولی اور نفس پرستی اور مکمل آزادی اور ہر طرح کی چھوٹ اور نفس کی تسکین کا ہر قیمت پر سامان کر لینا ہے بطرت معیشتها کہ اللہ تعالیٰ جس کو فرماتا ہے، یہ سب FUNDAMENTALIST کے سب منکروں کے خیالات ہیں اور ان کے مقاصد اور ان کی دعوت میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بما کسبت ایدی الناس۔ خیال کیجیے قرآن مجید کی بلاغت کا کہ ایدی الناس پہ اس کی نسبت کی ہے اور اس کی نسبت کسی اور چیز پر نہیں بما کسبت ایدی الناس ان لوگوں کے ہاتھوں نے کیا جو کسی اصول پر ایمان نہیں رکھتے تھے، کسی بنیاد پر ان کا اتفاق نہیں تھا، کوئی حدود ان کے لئے مقرر نہیں تھے کہ یہاں سے

یہاں تک جائیں گے، اور اس کے بعد آگے نہیں جائیں گے۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وقت بڑا نازک اور خطرناک ہے، اس میں تبادلۂ خیال کی صلاحیت، تحریری صلاحیت اور لسانی و بیانی صلاحیت، خطابت کی صلاحیت اور تقریر کی صلاحیت ان سب چیزوں کی ضرورت ہے اور اب وہ صرف اس لئے نہیں ہے کہ جیسے کہ آج سے پچاس برس پہلے تھا کہ آپ کسی میلاد اور کسی سیرت کے جلسے میں تقریر کر دیں یا کسی انجمن کے پلیٹ فارم سے کوئی تقریر کر دیں، یا اپنے مدرسہ کا تعارف کرا دیں، یا کوئی نیک مقصد کے لئے جلسہ ہو۔ اس میں آپ تقریر کر دیں اب تو ایک عالمی سازش ہے، بڑے وسیع اور نہایت گہرے پیمانے پر اور اس کے مضمرات بہت دوررس اور بہت دقیق اور بہت عمیق ہیں، یہ اتنی بڑی سازش کم سے کم میرے محدود مطالعہ میں جس کے پیچھے اتنا پروپگینڈا ہوا اور اتنے ذرائع ابلاغ ہوں جسے آج میڈیا کہتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ سب کے سب ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس اور سیمینارس، ملکوں کے دورے اور آنے جانے والے وفود یہ سب کے سب اس نکتہ پر آکر متحد ہو گئے ہیں کہ دنیا میں FUNDAMENTALISM کا مقابلہ کیا جائے یعنی کوئی اصول ہی باقی نہ رہے، حدود ہی باقی نہ رہیں وہ سب کر سکتے ہوں جس سے دل خوش ہو جائے۔

ایران کا ایک فلسفہ لذتیت جس کا نام آتا ہے، لذتیت کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز میں مزہ آئے وہ کرنا چاہئے، آج کا یورپ اسی انداز سے سوچ رہا ہے، پورے یورپ کا دماغ گویا لذتی بن گیا ہے جس میں مزہ آئے جس میں فائدہ ہو البتہ لذت کو ذرا وسیع کر دیا ہے انھوں نے کہ وہ لذت بطن یا لذت لسان نہ ہو بلکہ وہ لذت ذہن ہو، اس میں لذت سیاسی بھی شامل ہو اور لذت سائنسی بھی شامل ہو اور وہ جو ایک فاتحانہ خوشی ہوتی ہے اور فاتحانہ مسرت ہوتی ہے وہ بھی اس میں شامل ہو تو لذت کا انھوں نے دائرہ اور وسیع کر دیا ہے، اس سے وہ اور خطرناک بن گئی ہے، یونان کا جو لذتی اسکول تھا وہ وہاں تک جا ہی

نہیں سکا تھا، اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ لیکن یورپ کا لذتی اسکول آ گے پہنچ گیا ہے، یہ اس وقت گہری سازش ہے، اس سے بڑھ کر کوئی سازش نہیں، چونکہ ہمارا آنا جانا ہوتا ہے اور ہمارے روابط ہیں ثقافتی اور صحافی اور تحریری چنانچہ عرب ممالک میں بھی، خلیج میں بھی یہ بات داخل ہوگئی ہے کہ متشددین کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ متشددین کے معنی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ معاشرہ اسلام کے احکام کے مطابق ہونا چاہئے اس میں خوف خدا، خوف آخرت ہو اور اسے محاسبہ ہونے کا خیال ہو اور اس میں دوسروں کے اخلاق اور حقوق کا لحاظ ہو اور جو لوگ احکام شریعت کو جاری کرنا چاہتے ہیں، حدود شرعیہ تو خیر بڑی چیز ہے، تعزیرات بڑی چیز ہیں۔ مثلاً رجم ہے یا جلد ہے یہ چیزیں تو بڑی ہیں اور ان کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن جو روزمرہ کے حالات ہیں اور بہت قابل عمل حدود کے اندر جو احکام شرعیہ کا اجراء چاہتے ہیں ان سے بھی حکومتیں ڈر رہی ہیں اور وہاں سے نکلنے والے اخبارات میں اور خطوط میں یہ بات نظر آتی ہے جیسا کہ ہمیں اس کا جواب دینا ہے کہ آپ متشددین کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور خط کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ متشددین کے خلاف لکھوانا چاہ رہے ہیں، وہ ایک فتوی چاہتے ہیں جس کی وہ اشاعت کریں کہ شیخ ابی الحسن علی الندوی جو معروف ہیں، مصنف ہیں، ایسے ہیں، ویسے ہیں اور انھوں نے نام لکھے ہیں بہت ممتاز مفکرین اور عرب فضلاء کے کہ ان کے پاس بھی بھیجا گیا اور آپ کو بھی بھیجا جا رہا ہے کہ آپ متشددین کے بارے میں اپنا خیال ظاہر فرمائیں۔

اب بالکل FUNDAMENTALIST کے بارے میں امریکہ اور برطانیہ اس طرح سوچ رہا ہے اور پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ ایک صدائے بازگشت آ رہی ہے ان ملکوں سے، آپ کو ان سب خطرات کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اب معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ سینما مت جاؤ بہت بری بات ہے، اس کی برائی اپنی جگہ مسلم ہے جو شناعت ہے وہ شناعت ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب صرف یہ نہیں کہ کھیل کود میں زیادہ مت پڑو، فضول خرچی

مت کرو، اب یہ اصطلاح معاشرہ کا کام بہت اہم ہے، میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک رکن کے حیثیت سے اس کی پوری وکالت کرتا ہوں، یہ کام آپ کو کرنا ہے اپنی اپنی جگہوں پر، اصلاح معاشرہ کی دعوت دینی ہے، مکاتب ومدارس کو جاری کرنے کی آپ کو دعوت دینا ہے، مسجد مسجد مکتب قائم ہو اور کچھ گھروں پر بھی اس کا انتظام ہو جیسے پہلے ہوا کرتا تھا، کئی پڑھے لکھے آدمی بیٹھیں اور وہاں کے بچے آئیں اور اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں، قرآن مجید پڑھ سکیں، اور جو دین کی بنیادی باتیں ہیں مثلاً کلمہ اس کو صحیح یاد ہو اور وہ شرک و توحید کا فرق سمجھتے ہوں اور سیرت نبوی ﷺ سے ضروری حد تک واقف ہوں، یہ سب کام آپ کو کرنا ہے۔ لیکن اس سے بڑی ایک گہری سازش اس وقت ہے جس کے لئے بڑے پیمانے پر آپ کو عملی تیاری کرنی ہے وہ ہے عدم اصول پرستی کے خلاف جہاد، اس وقت امریکہ نے خاص طور پر جو مہم چلائی ہے اور ایک بہت بڑی سازش اور ایک بہت بڑا منصوبہ ہے اس میں یہودی دماغ کام کر رہا ہے اور عیسائی وسائل اور عیسائی طاقتیں اس کے پیچھے ہیں وہ یہ ہے کہ اس وقت سارے عالم میں عقیدہ کو، ایمان کو، تعلق باللہ کو، ایک دین کی پابندی کو اور آخرت کے خیال کو متزلزل کریں اور یہ کہہ کہہ کر یہ سب بنیادی باتیں ہیں، پرانی باتیں ہیں، فرسودہ باتیں کہتے ہیں تو اس کے لئے FUNDAMENTALISM وغیرہ کے نام رکھتے ہیں، اس کے لئے آپ کو تیاری کرنا ہے، میں الاصلاح کو محض تقریر و تحریر کا ایک شعبہ نہیں سمجھتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کے ایک مقصد کے پورا کرنے کا یہ ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا، اسلام پر اعتماد دوبارہ واپس لانا اور خاص طور پر ترقی یافتہ جو اسلامی ممالک ہیں ان میں اسلام پر اعتماد متزلزل ہو چکا ہے، الجزائر میں کیا ہو رہا ہے؟ الجزائر میں خالص دین داروں اور حکومت کے نمائندوں کے درمیان جنگ ہے، نہ اسرائیل کی ان کے خلاف ہے، نہ اسرائیل کا ان کے خلاف معرکہ ہے اور نہ کسی یورپین طاقت کی ان کے خلاف جنگ ہے اور نہ ملک میں بگاڑ وفساد پیدا

کرنے والوں کے درمیان، خالص دین دار، دین پسند، میں دین پرست نہیں کہتا، دین پسند طبقے اور جو چاہتے ہیں کہ کلمة الله هي العليا، اس پر عمل ہو، یہاں اللہ کا نام بلند ہو، یہاں اللہ کا نام سب سے اونچا ہو، اللہ کا حکم سب سے زیادہ قابل اطاعت سمجھا جاتا ہو، یہاں فرائض کی پابندی ہو اور محارم سے حرمات سے اجتناب ہو، یہاں مسجدیں آباد ہوں؟ اس کا ذکر کرنا بھی الجزائر میں ایک بڑا جرم ہے، برابر خبریں آتی رہتی ہیں کہ دین پسند لوگوں میں سے اتنے آدمی شہید ہوئے، لیبیا میں بھی ہو چکا ہے، اور اب بھی لیبیا کا حال وہی ہے، اور شام تو بالکل غیر مسلم عنصر کے قبضہ میں ہے وہاں کے دروزی حقیقت میں وہ مسلمان نہیں ہیں کسی طور پر ان پر مسلمانوں کی تعریف صادق نہیں آتی اس طور پر یہ فتنہ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ پاکستان بھی اس کے لپیٹ میں نہ آ جائے ابھی جو تھوڑی سی تبدیلی ہوئی ہے، نواز شریف کو جو ہٹایا گیا ہے اس میں بھی امریکہ کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے اور ضیاء الحق شہید مرحوم کی شہادت اور ملک فیصل کی شہادت میں بھی امریکہ کا ہاتھ تھا، اور وہ اس بنا پر تھا کہ کوئی ایسا عنصر یا ایسا فرد غالب نہ ہونے پائے، حادی نہ ہونے پائے، اس ملک پر اس ملک کے مستقبل کی تعمیر میں وہ آزاد نہ ہو، جو اصول پسند ہو اور عقیدہ کا پختہ ہو اور اسلام کی حقانیت پر پورا یقین رکھتا ہو اور ضروری حد تک وہ فرائض کا بھی پابند ہو، یہ ایک سازش چلی آ رہی ہے فکری طور پر اس کا مقابلہ کرنا اور تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا اور اسلام کی ابدیت پر اس کا یقین واپس لانا، دوبارہ یقین پیدا کرنا ہے، اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، قیادت کر سکتا ہے۔

جدید نصاب تعلیم اور یورپ سے جو طریقہ تعلیم آیا ہے، وہاں سے امپورٹ کیا گیا ہے اس میں یہ خاصیت ہے کہ وہ اسلام پر اعتماد کو متزلزل کر دے کہ اسلام نے بے شک ایک زمانہ میں اچھا کام کیا تھا، اچھا پارٹ ادا کیا تھا لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اس وقت وہ بہت ہی غیر ترقی یافتہ زمانہ تھا، خدا بھلا کرے ان لوگوں کا مثلاً عورت کے کچھ حقوق مل

گئے، دختر کشی بند ہوگئی، اور شراب اتنی نہیں پی جانے لگی، لیکن اب اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔.......... اصل میں فتنہ کہ اسلام اس زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا، آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اسلام اس زمانہ کا ساتھ دینا تو الگ رہا یہ تو اس تنزل کے بعد اس زمانہ کو ہلاکت سے بچا سکتا ہے، اسلام اس زمانہ کو راہ پر لگا سکتا ہے اور اسلام اس زمانہ کو مبارک بنا سکتا ہے اور اسلام اس زمانہ کو رہنے کا سلیقہ سکھا سکتا ہے اس کے لئے آپ کو تیاری کرنی ہے، بہتر ہوگا کہ ہمارے بعض اساتذہ اس میں کتابوں کا انتخاب کریں ایک زمانہ میں ہم نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی سے مشورہ کر کے ایک فہرست بنائی تھی کہ فلاں درجے سے لے کر فلاں درجہ کے طلباء یہ کتابیں پڑھیں اور فلاں درجے سے فلاں درجہ تک کے طلباء یہ کتابیں پڑھیں اور ہم نے یہ بھی انتظام کیا تھا کہ الاصلاح میں ایک رکن کی ڈیوٹی مقرر کی تھی کہ آپ یہاں بیٹھا کریں، الاصلاح کے کھلنے کا جو وقت ہے اس میں ایک گھنٹہ آپ وقت دیں کہ طلباء کو معلوم ہو کہ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کون سی کتابیں پڑھنی ہیں، طلباء ان کے پاس جائیں اور کہیں کہ ہم اس درجہ کے طالب علم ہیں بتائیے ہم پہلے کیا پڑھیں، بتائیے کہ ہم تاریخ کا مطالعہ کہاں سے شروع کریں، بتائیے ہم سیرت میں اس وقت کون سی کتابیں پڑھیں، اس منزل پر کون سی کتاب مناسب ہوگی۔ یہ دو انتظامات ہم لوگوں نے کیے تھے، ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے۔

عزیز طلبہ! میں نے اتنی طوالت اور اتنی تفصیل کے ساتھ بات کر دی، حالانکہ میں اس حال میں نہیں تھا، اور میں آپ سے معذرت کرنے والا تھا کہ مجھے بعض ضرورتیں ہیں ہمارے معزز مہمان بھی آئے ہوئے ہیں، ذہن دوسری لائن پر کام کر رہا ہے، لیکن یہ آپ کی محبت ہے آپ کا خلوص ہے، یا اللہ تعالیٰ جو آپ سے کام لینا چاہتا ہے، اس کی اہمیت اور قدر و قیمت ہے کہ میں نے اتنی تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ بس آخر میں یہ کہنا ہے کہ انجمن الاصلاح کو محض آپ تحریر و تقریر کی مشق، مضمون نگاری سیکھنے کی جگہ نہ سمجھیں

بلکہ یہاں سے آپ کو وہ ذخیرہ لینا ہے، وہ مواد لینا ہے کہ جس سے آپ یہاں سے نکلنے کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو انٹیلکچول کلاس کہلاتا ہے، ذہین طبقہ جو ہے آپ اس کو مطمئن کرسکیں اس میں اسلام کی ضرورت کا احساس پیدا کرسکیں اور اسلام کے بارے میں اعتماد واپس لاسکیں، یہاں سے لے کر انڈونیشیا اور مغرب اقصیٰ اور مراکش تک ان سب جگہوں پر اس وقت جو ڈر ہے وہ یہ کہ امریکہ اور یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش سے ان سب جگہوں تک جراثیم پہنچ گئے ہیں کہ اسلام پر اعتماد متزلزل ہو جائے اور اسلام پر عمل کرنے کو وہ فرسودگی اور رجعت پسندی اور FUNDAMENTALISM سے تعبیر کرنے لگیں اور ایک پڑھے لکھے آدمی کو شرم آنے لگے کہ ہم حاشا وکلا FUNDAMENTALIST ہیں، آپ کو وہ کام کرنا ہے کہ لوگوں سے سینہ تان کر اور آنکھیں ملا کر یہ کہیں کہ ہاں ہم FUNDAMENTALIST ہیں اور ہمارے نزدیک FUNDAMENTALIST ہی دنیا کو بچا سکتا ہے اور ساری خرابی اور سارا فساد FUNDAMENTALISM نہ ہونے کی وجہ سے ہے، کوئی اصول نہیں، کوئی معیار نہیں، کوئی حدود نہیں صرف نفس پرستی ہے، صرف خواہش پرستی ہے، صرف اقتدار پرستی ہے، صرف سیاست پرستی ہے، اس لئے آپ کو بھی تیاری کرنی ہے اور دوسروں کو بھی تیار کرنا ہے، بس میں انھیں الفاظ پر ختم کرتا ہوں اور آپ کو داد دیتا ہوں اور آپ کو اس بات پر مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کی اس محفل میں چند مبارک و محترم ہستیاں موجود ہیں۔

ہمارے عزیز مولانا عبد الکریم پاریکھ صاحب تشریف رکھتے ہیں جو ہندوستان کے ایک بڑے ترجمانِ قرآن ہیں، اور مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی بھی موجود ہیں، یہ آپ ہی کی درس گاہ کے فاضل ہیں اور اس وقت ایک بڑے ادارے کو چلا رہے ہیں، ایک رسالہ بھی ہے اور ادارہ بھی ہے اور دوسرے تحقیقی مضامین بھی لکھتے ہیں اور آپ کے دوسرے اساتذہ بھی موجود ہیں اور امید ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی باعث برکت ہوگی،

اور آپ کے لئے ذریعۂ استفادہ بھی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دین حق کی خدمت کیلئے قبول کرے۔ آمین یارب العالمین۔

وماعلینا الاالبلاغ المبین

اپنے کو نیلام کی منڈی میں نہ پیش کیجئے

بتاریخ ۲۴ رفروری ۱۹۸۸ء بروز چہار شنبہ بعد نماز مغرب بمقام جمالیہ ھال دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لئے الوداعیہ کے موقع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے یہ فکر انگیز تقریر فرمائی، جو کسی بھی دار العلوم میں پڑھنے والے اور وہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لئے نشان راہ ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و خاتم النبین محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسانٍ ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین ، اما بعد!

میرے رفقاء کار اساتذہ دار العلوم، برادرانِ عزیز اور فرزندانِ عزیز! مجھے سب سے پہلے اپنے اس تاثر کا اظہار کرنا ہے کہ میں نے رخصت ہونے والے بھائیوں کے اردو اور عربی مضامین سن کر خدا کا شکر ادا کیا اور میں برملا اعلان کرتا ہوں کہ الحمدللہ جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ ضائع نہیں ہو رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وان لیس للانسان الا ما سعی وان سعیہ سوف یری۔**

میں اپنے عزیز رفقاء اور اساتذۂ دار العلوم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی کوششوں اور دار العلوم کے فضلاء کی تصنیفات کا اثر ان مضامین میں ہے۔ میں سالہا سال سے الوداعی جلسوں میں شریک رہا ہوں اور کبھی کبھی الاصلاح کی مجلسوں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے، فکری وعلمی لحاظ سے بھی، قوتِ تعبیر اور قوتِ بیان کے لحاظ سے بھی اور قدرتِ تحریر اور

اسلوب کے لحاظ سے بھی اور زبان و ادب کے لحاظ سے بھی نمایاں ترقی نظر آتی ہے یہ بات بڑی موجبِ شکر ہے اور میں اپنے عزیز طلبہ کو ان کی ترقی اور ان کی سعادت مندی پر، ان کے تعلق و احترام پر اور ان کے خلوص و محبت پر مبارک باد دیتا ہوں اور اپنے ان عزیز طلبہ سے معذرت کرتا ہوں جو اپنے مضامین نہیں سنا سکے، اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں اور ان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان کی یہ محنت ضائع نہیں ہوئی اس لئے کہ انہوں نے مضامین تیار کرنے میں جو وقت صرف کیا ہے وہ ان کے لئے ہر حال میں مفید ہے۔ اس پر زیادہ قلق نہ کریں ان کی یہ چیز زیورِ طباعت سے آراستہ بھی ہو سکتی ہے جو ان کے لئے بطورِ یادگار رہوگی۔

اب میں مختصر وقت میں چند ضروری اور وداعی باتیں کرنا چاہتا ہوں، یوں تو وقت کا کوئی اعتبار نہیں لیکن چونکہ یہ الوداعی جلسہ ہے، اس لئے آپ سے میں وہی باتیں کروں گا جو میرے اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور مطالعے کے لحاظ سے ہیں اور میں جن کو آپ کے لئے مفید سمجھتا ہوں آپ کی محبت آپ کا میرے اوپر حق کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے۔

اب میں آپ سے چار باتیں عرض کروں گا جو حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوں گی اور چار باتیں آپ کی ذات سے متعلق عرض کروں گا۔

حالاتِ حاضرہ سے متعلق چار باتوں میں سے پہلی بات جو اگر چہ بہت بڑی ہے اور میری حقیقت و حیثیت سے بلند ہے مگر اس کے ذکر میں برکت اور حلاوت ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ چند چیدہ اور برگزیدہ صحابہ کرام کی مخصوص جماعت میں تشریف فرما تھے حضرت عمرؓ کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ میرے لئے دعا کا وقت ہے اور ان کی طبیعت میں بھی تقاضا پیدا ہوا جو عارفین میں پیدا ہوا کرتا ہے اور وہ تو سب عارفین سے بڑھ کر عارف تھے انہوں نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ آپ سب آزاد ہیں اپنے لئے دعا کریں اور منہ

مانگی مراد مانگیں تو کسی نے کہا کہ:

اے اللہ اپنے راستہ میں نکلنے کی توفیق دے کہ یہ دولت تیرے راستہ میں لوٹا دوں اور تیرے بندے کی خدمت کروں، کسی نے کہا کہ اے اللہ اپنے راستہ میں نکلنے کی توفیق دے کہ میں جہاد کر کے اپنا سر کٹاؤں اور تیرے راستہ میں اپنا خون بہاؤں اسی طرح تمام صحابہ کرام کی دعائیں منقول ہیں۔ جب حضرت عمرؓ کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا کہ میری دعا ہے کہ میرے پاس ابوعبیدہؓ، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، خالد رضی اللہ عنہم اجمعین ہوں اس کے علاوہ اور کئی نام لئے، بہر حال یہ سب وہ لوگ تھے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی فتوحات مقدر کی تھیں اور بڑے بڑے کارنامے تقدیر میں لکھے تھے اور کہا ان میں سے کسی کو کسی محاذ پر اور کسی کو کسی محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں ان کے ذریعہ اسلام کا پرچم لہرادوں اور پوری دنیا اسلام کے زیرنگیں ہو۔

آج سے پہلے اسلام کے مستقبل کے فیصلہ کن محاذ اتنے متعین اور واضح نہیں تھے ان پر کہر تھا کچھ ایسی تاریکیاں تھیں کہ اس وقت متعین کر کے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ چار محاذ ہیں جن کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے اور اپنے عقیدہ، اپنے پیغام اور اپنے تشخص کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے یا نہیں؟ تو میرا مطالعہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ محاذ متعین اور واضح نہیں تھے لیکن اس میں سیاسی تبدیلیوں، انقلابِ سلطنت اور اسلام کے خلاف موجود مہم اور علمی تجربوں نے اس کو بالکل ایک حقیقت بنا دیا ہے انہیں چار محاذ کا ذکر آپ سے کروں گا جن کیلئے بلند عزائم سپاہیوں اور دینی درسگاہ کے فضلاء اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ علماء اور مخلصین کی ضرورت ہے اور ان کے لئے اس سے بڑی سعادت نہیں ہوسکتی کہ وہ ان محاذ جنگ میں اپنی صلاحیتوں اپنی توانائیوں اور سرگرمیوں کا اظہار کریں۔

۱۔ ان میں سب سے بڑا محاذ یہ ہے کہ ہماری ملتِ اسلامیہ کی آئندہ نسل مسلمان رہ

جائے، اور وہ صرف ذہنی فکری، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے نہیں بلکہ اعتقادی ارتداد سے بچ سکے۔ اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے مدارس سے فارغ ہوں وہ اس محاذ کو سنبھالیں، اس محاذ کا چارج لیں، اور اپنے کو اس محاذ کے لئے وقف کر دیں اور یہ کوشش کریں کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل جو ابھی آٹھ دس برس کے بچے یا بارہ پندرہ برس کے نوجوان کی شکل میں ہے اسلام کی اصولی فقہی اور کلامی تعریف پر صادق ہوں اس کے لئے ضرورت ہے اس بات کی کہ قصبے قصبے، شہر شہر اور گاؤں گاؤں مدارس مکاتب اور مساجد کی بنیاد ڈالی جائے، اور جہاں ایسا ممکن ہو وہاں صباحی و مسائی درجات ہوں اور جو لوگ جدید تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کے لئے مجبور ہیں ان کو غذا پہنچائیں۔ اگر ان کو ابھی سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو ڈر ہے کہ اس میں نوخیز نسل کو آگے چل کر کلامی اور فقہی اعتبار سے مسلمان کہنا صحیح ہوگا یا نہیں، وہ توحید و شرک اور کفر و ایمان کا فرق کر سکے گی یا نہیں، رسالت، منصبِ رسالت اور رسول اللہ ﷺ کو نبی آخر الزمان اور آپ کی شفاعت کو مانے گی یا نہیں:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ط اور وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ، پر اس کا ایمان ہوگا یا نہیں۔

عزیز طلبہ! آپ کے بلند عزائم اور بلند خیالات، آپ کے مطالعے اور پختہ صلاحیتوں پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس پر آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، لیکن اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ کون کس محاذ کو سنبھالتا ہے، آپ ابھی سے نیت کیجئے کہ ہم اس خطرناک اور نازک محاذ کے لئے سینہ سپر رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا اور اسباب مہیا کرے گا اور آئندہ نسل جو ہماری اور آپ کی اولاد ہوگی اس کو مسلمان رکھنے کے لئے جو بھی کوشش کی جا سکے کی جائے، جو ہاتھ پیر مارے جا سکیں مارے جائیں اور جو آب دیدہ خون جگر بہایا جائے، یہ سب سے بڑا محاذ ہے۔

۲۔ دوسرا محاذ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہے، یعنی اپنے عائلی قانون، قرآن مجید کے نصوص قطعیہ اور احکام قطعیہ، نکاح وطلاق کے احکام، ترکہ و تعلقات کے احکام پر عمل کر سکے اگر وہ اس پر عمل نہ کر سکے تو بعض وقت وہ ناجائز اور حرام ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ط

بہت سخت الفاظ ہیں اگر خدانخواستہ یہ وقت آ گیا کہ مسلمان یہاں نماز تو پڑھ سکے، کلمہ پڑھ سکے، قرآن شریف کی تلاوت کر سکے لیکن وہ قرآن مجید کے عائلی احکام پر عمل نہ کر سکے۔ پھر اس وقت علماء کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ ہجرت کا فتویٰ دیں، خدا کرے وہ وقت نہ آئے ہم اس زمین پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہاں کے اہلِ بصیرت عارفین ملہم من اللہ اور اپنے عہد کے مخلص ترین بندوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس ملک سے اسلام مٹنے والا نہیں ہے اور اس ملک کی قسمت میں اسلام لکھ دیا گیا ہے اور اس ملک کے لئے اسلام الاٹ ہو گیا ہے اور تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہے کہ اسلام اس ملک میں رہے، اسلام اس کی قیادت بھی کر سکتا ہے اور بچا بھی سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر دوبارہ اس کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے اس لئے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، مگر ہمیں واقعات وحقائق کو دیکھ کر اپنی کوششوں کا رخ متعین کرنا چاہئے، کیونکہ مسلمانوں کا ملی تشخص روز بروز خطرے میں پڑتا جا رہا ہے اس کی بے حد ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے شاہ بانو کیس سے گویا ایک غیبی مدد فرمائی ہے جس نے سارے مسلمانوں میں اس خطرہ کے احساس کو پیدا کر دیا تھا جس کے لئے ایک مہم چلائی گئی اور وہ ایک مرحلہ پر

کامیاب ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمہوری اور اجتماعی طریقہ پر اتحاد و اتفاق کے ساتھ اور خلوص کے ساتھ جو مہم چلائی جائے وہ ضرور کامیاب ہوگی۔ حالانکہ فیصلہ سے پہلے یہ پیشن گوئی کرنا بہت مشکل تھا کہ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہوگا یا نہیں اور ان کا مطالبہ پورا ہوگا یا نہیں؟ لیکن اللہ کے چند مخلص بندوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی سے قرآن مجید کی روشنی اور تاریخ کے تجربہ میں صحیح طریقہ اختیار کیا تو انہیں کامیابی ہوئی۔

۳۔ تیسرا محاذ پیام انسانیت کا ہے، ہم اس ملک میں اس طرح رہیں کہ اپنے دین کو باقی رکھنے کیلئے بھی، اپنے دین پر عمل کرنے کے لئے اپنے اداروں اور مرکزوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی، دعوت کا کام کرنے کے لئے بھی، تعلیم وتالیف کا کام انجام دینے کے لئے بھی، بامقصد اور باعزت زندگی گزارنے کے لئے اپنے مخصوص عقائد کے ساتھ اپنے پیغام و مقام کے ساتھ اس ملک میں زندگی گذار سکیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ فضاء معتدل ہو، مشتعل اور آتشگیر نہ ہو، ورنہ کسی وقت بھی ساری کوششوں پر پانی پھر سکتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چند آدمی کے ذہن کی اپج ہے یا ان کا ذاتی رجحان ہے جو کسی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔

آپ یقین مانئے کہ حالات کے حقیقت پسندانہ اور عملی مطالعہ نے میری رہنمائی کی ہے ہم جیسے اور رفقاء کو اسی مطالعہ نے مجبور کیا کہ وہ کوشش کریں حالانکہ اس کوشش کا تناسب واقعات کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں۔ اگر چہ یہ وہ مجمع نہیں ہے جس کے سامنے کہنے سے یہ سمجھوں کہ بات تحریک کی شکل اختیار کرے گی۔ لیکن کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے وہ کام لے لے۔ لہذا آپ اس کو بھی یاد رکھئے اور باہمی اعتماد ایک دوسرے کا احترام ہمارے اندر پیدا ہونا چاہئے۔

اسپین کا المیہ جو پیش آیا اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں ایک بات بہت نازک یہ ہے کہ وہاں علوم دینیہ کی بھی خدمت کی گئی اور وہاں خدا تک پہنچنے کے لئے ایسے

ایسے مجاہدے ہوئے جن سے چوٹی کے اولیاء پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مشرق اگر انبیاء کی سرزمین ہے تو مغرب اولیاء کی سرزمین ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی جیسے جلیل القدر مشائخ پیدا ہوئے، اسی طریقہ سے فنونِ لطیفہ کو بھی وہاں بہت ترقی ہوئی۔ اندلس کا ایک مستقل ادبی دبستان ہے اس کو المدرسة الاندلسية کہتے ہیں، اسی طرح چوٹی کے مصنفین پیدا ہوئے۔ موفقات کے مصنف علامہ شاطبیؒ پیدا ہوئے ابن عبدالبرؒ پیدا ہوئے، ایسے ہی بہت سی کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے اور موطا کی ایسی شرحیں لکھی گئیں لیکن ایک چیز سے اغماض برتا گیا وہ یہ کہ وہاں کی اصل آبادی کو جو آٹے میں نمک کے برابر تھی اپنی پوری سلطنت و اقتدار کے باوجود سنجیدگی کے ساتھ اسلام سے مانوس کرنے اور اسلام کے دائرے میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اس لئے کہ اقتدار میں اکثر یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے نام اس زمین کا پٹہ لکھ دیا گیا ہے، مغلیہ سلطنت کی فرامین میں یہ لفظ ملتا ہے کہ ''دولتِ ابد قرار'' یعنی ہم براہ راست حضرت اسرافیلؑ کو اس ملک کا چارج دیں گے اور اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں ہے یہ اس کا غلط خیال تھا۔ اس پھیلی ہوئی آبادی کو اپنے حال پر چھوڑ دینا اور اس کے جذبات کو غلط تعلیم کے ذریعہ، غلط تاریخ کے ذریعہ، اپنی اخلاقی کمزوریوں کے ذریعہ اس سے بڑھ کر مقابل سیاسی تحریکوں کے ذریعہ نشو ونما پانے کا موقعہ دینا بہت خطرناک ہے۔

ہندوستان میں تو یہ عنصر زیادہ واضح طور پر ہے، مسلمانوں نے ہندوستان پر آٹھ سو سال تک علی الرغم حکومت کی ہے اور جب اخیر میں تصادم اور متضاد سیاسی تحریکیں چلی ہیں اور انہوں نے غیر مسلموں کے دل میں بڑے بڑے ناسور پیدا کر دیئے ہیں اب اس کو پیامِ انسانیت کے ذریعہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کو میں نے بہت اختصار سے بیان کیا ہے اس پر پورا لٹریچر تیار ہو گیا ہے آپ اس کا مطالعہ کریں۔

۴۔ چوتھا اور آخری محاذ علوم دینیہ کے بقاء کی کوشش کرنا اور زمانہ کے ساتھ ان کو تطبیق

دینا۔ اس طرح نہیں کے تابع ہوں بلکہ زمانہ کے جائز اور واجب تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اور اس کی زبان و ادب کی رعایت کے ساتھ علوم دینیہ کو زندہ رہنے اور اپنا کام کرنے اور زمانہ کا نہ صرف ساتھ دینے بلکہ اس کی قیادت کرنے کے قابل بنائیں اس کے لئے عربی مدارس توریڑھ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ترقی دیں اور ان کے لئے اساتذہ تیار ہوں۔ ندوۃ العلماء کے ملحق مدارس کو اپنی پچاس ساٹھ سے متجاوز تعداد ہونے کے باوجود اساتذہ نہیں ملتے آپ اس کے لئے بھی تیار ہوں، نئے مدارس قائم کریں۔ علوم دینیہ میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کریں صرف یہ نہیں کہ آپ فرسودہ چیزوں کو فرسودہ اور بوسیدہ چیزیں سمجھ کر پڑھائیں بلکہ ان میں نئی روح و نئی توانائی پیدا کریں۔ تصنیفات نئی ہوں تشریحات نئی ہوں، نئی ترجمانی ہو، نئی قوتِ تدریس ہو، نیا ذوقِ تعلیم ہو اور نئی ذہنی صلاحیت اور اس کے ساتھ ذکاوت، حافظ اور مطالعہ کی وسعت ہو۔

یہ چار چیزیں جو میں نے اختصار کے ساتھ بیان کی ہیں ان کی طرف توجہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

اور اب وہ چار چیزیں بیان کرتا ہوں جو آپ کی ذات سے متعلق ہیں انہیں آپ سرسری نہ سمجھئے گا یہ ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہے اگر چہ خودستاء ہے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے محض اپنی بات میں اہمیت پیدا کرنے کے لئے کہتا ہوں کہ بہت کم لوگوں کو علمائے سلف اور علمائے معاصرین اور درمیانی دور کے علماء خاص طور پر ہندوستان کے علماء کے تراجم پڑھنے کا موقعہ ملا ہوگا جتنا مجھے ملا ہے۔ اس کے خاص اسباب تھے کیونکہ میں ایک تاریخی ماحول اور مؤرخین کے گھرانے میں پیدا ہوا اور گھر میں سارا خزانہ موجود تھا۔

''نزهة الخواطر'' جس میں ساڑھے چار ہزار سے زائد علمائے ہند کے تراجم ہیں اس کو میں نے کئی بار پڑھا۔ مسودہ کے مرحلہ سے لے کر طباعت کے بعد تک ہر مرحلہ میں

کئی بار پڑھتا رہا۔ اسی طرح وفیات الاعیان اور طبقات کی جو کتابیں ہیں پڑھیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا موقعہ بھی نصیب فرمایا۔

۱۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست ہو۔ کسی درجہ میں تقویٰ، دیانت داری اور تعلق مع اللہ ہو یا اس کی فکر ہو، یہ ایسی بنیادی بات ہے کہ جس کے بغیر نہ کسی کام میں برکت ہوتی ہے نہ حرکت اور ایسا حقیقی نفع اسی وقت ہوگا جب خدا اور رسول کے ساتھ معاملہ درست ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سب کے سب شب بیدار بن جائیں صوفی اور عارف باللہ ہو جائیں یہ ہر شخص کے لئے ضروری نہیں۔ لیکن جو ضروری حصہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک حد تک تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صحیح ہو اور اس کی فکر ہو اور اپنی نمازوں کی فکر ہو دعا کا ذوق ہو اور انابت الی اللہ کسی نہ کسی درجہ میں ضرور ہو۔ یہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے اسے کبھی بھولنا نہیں چاہئے، اور اس کے حصول کے بہت سے ذرائع ہیں ان میں سے ایک تو یہی ہے کہ کتاب وسنت اور فقہ کا مطالعہ کریں اور اس کے مطابق اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کی کوشش کریں اس کے علاوہ سب سے مؤثر چیز یہ ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات پڑھیں اور اگر اللہ تعالیٰ نصیب کرے تو کسی بزرگ کی صحبت اختیار کریں، میں بے تکلف کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور مفید حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں خاص طور سے ان کی ملفوظات ومواعظ ایک اچھا اثر رکھتے ہیں میں نے الحمدللہ ساری ندویت، اپنے تمام ادبی ذوق اور تاریخی بلکہ انتقادی ذوق کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھایا ہے اور آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں اس سے آپ کو اپنی جاہ طلبی، حب مال اور معاملات میں کوتاہی کا علم ہوگا اور خاص طور پر اخلاق کی اصلاح اجتماعی کاموں کی اہمیت پر ان کے یہاں بڑا زور دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان سے یہ کام لیا ہے، آپ اس کی طرف ضرور توجہ دیں آپ کے اندر اس کی کوئی مقدار ضرور ہونی

چاہئے۔

۲۔دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں خاص طور پر اس کی دعوت وعزیمت کی تاریخ اور اس کی اصلاحی تحریکوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عہد نبوی ﷺ سے لے کر آج تک علم اور نفعِ خلائق کا، اصلاح وانقلابِ حال کا اور زہد وایثار کا ساتھ رہا ہے یہ دونوں بالکل ہمسفر ہیں۔آپ اسلام کی پوری تاریخ کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کا کہیں ساتھ نہیں چھوٹا ہے اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے ذریعہ امت کو نفع پہنچایا اور کسی بڑے فتنے سے محفوظ فرمایا ان میں سب سے بڑا فتنہ ردت کا فتنہ تھا اور دوسرا فتنہ خلقِ قرآن کا تھا، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے:

نصر الله هذه الامة. اعان الله هذه الامة بابی بکر الصدیق یوم الردة وبا حمد بن حنبل یوم الفتنة ،اور اس کے بعد جو فلسفے کے حملے تھے جن کے مقابلہ کے لئے جو لوگ آئے،امام غزالی ہوں یا امام ابوالحسن اشعری ہوں پھر اس کے بعد جو فتنے تھے ان کے مقابلہ کے لئے امام ابن تیمیہ وغیرہ آئے پھر ہندوستان میں صوفیائے کرام جنھوں نے مادیت وغفلت اور سلطنت کے اثر سے جو جاہ پرستی، طاقت پرستی، دولت پرستی اور نفس پرستی پیدا ہو رہی تھی اس کو روکا۔ پھر اس کے بعد غیر مسلموں کے اثر سے اسلامی معاشرے میں جو بدعات، مشرکانہ عقائد داخل ہو گئے تھے اور وحدة الوجود کا جو اثر فلاسفہ اور صوفیوں سے لے کر ادباء اور شعراء تک کے دماغوں میں سرایت کر گیا تھا اس کے مقابلہ کے لئے حضرت مجدد الف ثانی آئے۔ پھر اس کے بعد قرآن مجید کے براہ راست مطالعہ اور حدیث سے اشتغال ہونے کی وجہ سے جو ایک جاہلیتِ ہندیہ اور مقامی اثرات تھے اور اتباعِ سنت کا جو ذوق کم ہو گیا تھا اور عقیدہ میں رخنہ پڑ گیا تھا اس کے سدباب کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف وخلفاء کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔

غرض کہ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ اصلاح کا کام، عزیمت کا کام اور سطح سے بلند ہو کر

امت کے نفع کا کام اور زہد و ایثار دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فطری اور طبعی رشتہ قائم کر دیا ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں ٹوٹنے نہیں پایا۔ اس لئے میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس کے لئے بھی آپ اپنے کو تیار کریں، کیونکہ دوسری قوموں میں بھی کوئی کام زہد و ایثار کے بغیر نہیں ہوا ہے۔ اگر چہ ان کا مزاج الگ، ان کے نتائج مختلف اور ان کے احکام بھی دوسرے ہیں اس لئے اپنے آپ کو ارزاں فروشی سے بچائیں، صرف دولت دنیا کو اور عہدوں کو اپنا مطمع نظر نہ بنائیں جہاں سے کام آجائے، مانگ آجائے اور امید ہو جائے بس آپ آنکھ بند کر کے چلے نہ جائیں اور زہد و ایثار سے کام لیں۔ اسی زہد و ایثار کے وعدے سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے اس وقت نہ میں استیعاب کر سکتا ہوں اور نہ آپ کو ضرورت ہے۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ زہد و ایثار سے جو حقیقی آسودگی اور صحیح عزت حاصل ہوتی ہے وہ کہیں نہیں حاصل ہوتی ہے اور یہی اصل مقصد ہے جو لاکھوں کروڑوں روپے کے مالک کو بھی حاصل نہیں ہے۔ وہ ایک لقمہ کو حلق سے اتارنے کے لئے بعض اوقات ترستے ہیں ہنری فورٹ کہتا تھا کہ میری ساری دولت لے لو اور میرا ہاضمہ درست کر دو، اور اس قابل بنا دو کہ میں کچھ کھا پی سکوں، حقیقی ضرورت کا سہولتوں اور عزت کے ساتھ پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہوتا ہے۔

اگر غیر مناسب بات نہ ہوتی تو میں بتاتا کہ میں اور میرے بعض رفقاء کو محض بزرگوں اور اپنے مربیوں کے فیض سے اور جو کتابوں میں پڑھا تھا اس کے اثر سے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا تو آج ہم اس قابل ہیں، ورنہ معلوم نہیں کسی یونیورسٹی یا کسی کالج میں ریٹائر ہو چکے ہوتے اور تھوڑی بہت پنشن وغیرہ جو ملتی ہے ملتی ہوتی اور اپنے قصبہ میں بیٹھے زندگی کے دن گذار رہے ہوتے۔ لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر بزرگوں کے واقعات سامنے ہوتے ہیں ان میں سے مولانا عبد الرحیم صاحب کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جس کی نظیر

شاید مشکل سے ملے گی۔

والد صاحب مرحوم نے نزہۃ الخواطر کی آخری جلد میں مولانا نجم الغنی صاحب رامپوری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا عبدالرحیم صاحب معقولات کے اور ریاضیات کے بہت بڑے ماہر تھے وہ قدیم درس پڑھاتے تھے اور انہیں ریاست رامپور سے پندرہ یا بیس روپے ماہانہ ملتے تھے ان کی اپنے فن میں قابلیت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی جب بریلی میں پہلی مرتبہ کالج قائم ہوا ہے تو اس کے پرنسپل مسٹر ہاکنس نے ان کو آفر (پیش کش) کی کہ آپ بریلی کالج میں آئیے اور دوسو روپے آپ کی تنخواہ ہوگی تو انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ میرے پندرہ روپے بند ہو جائیں گے۔ مسٹر ہاکنس نے کہا کہ آپ ریاضیات کے اتنے بڑے ماہر ہیں لیکن پندرہ اور دوسو روپے میں فرق نہیں سمجھتے، پھر انہوں نے جواب دیا کہ جن لڑکوں کو میں پڑھاتا ہوں ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی پھر اس نے کہا وہ سب لڑکے یہاں آجائیں گے اور سبھوں کا اسکالرشپ مقرر کر دیا جائے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک بڑی دقت یہ ہے کہ میرے گھر کے سامنے بیری کا درخت ہے جس کے تازہ پھل سے صبح صبح ناشتہ کرتا ہوں وہاں جانے کے بعد اس کا پھل نہیں ملے گا جس کی وجہ سے صحت پر اثر پڑ سکتا ہے، پھر اس انگریز نے کہا کہ وہ پھل بھی صبح صبح ڈاک کی گاڑی سے آپ کو مل جائے گا تو پھر انہوں نے جواب دیا یہ سب ٹھیک ہے لیکن آپ یہ بتائیے کہ کل قیامت میں جب خدا یہ سوال کرے گا کہ تم رامپور چھوڑ کر بریلی اس لئے گئے تھے کہ یہاں پندرہ روپے ملتے تھے اور وہاں دوسو روپے ملیں گے تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟ انگریز بہر حال انگریز تھا اس نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

میرے عزیزو! میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ ایسی مثالیں پھر زندہ ہونی چاہئیں، اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کی سنت ہے، سارے آسمانی صحیفے بتاتے ہیں انبیاء علیہم السلام کی

سیرت سے معلوم ہوتا ہے اور مصلحین کی تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو عزت سکونِ قلب اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے اور اس کے ساتھ جو برکت ہوتی ہے وہ سب زہد وایثار پر موقوف ہے اور اب پھر وہ دور آ گیا ہے خاص طور سے ہندوستان کے حالات اس زہد و ایثار کے طالب ہیں۔ یہ بہت بری روایت شروع ہوگئی ہے کہ جہاں زیادہ پیسے ملیں جہاں زیادہ آسودگی حاصل ہو اور جہاں اپنے خاندان کی آسانی سے پرورش کرسکیں وہیں جانا چاہئے یہ بہت بڑی آزمائش ہے اس سے بچنے کی دعا مانگنی چاہئے۔

۳۔ تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں اسلام کے مذاہب اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گُر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹئے گا۔ اس کو لکھ لیجئے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے کیسی ہی قوی دلیل پائیں جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیے، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے ساتھ رہی ہے جس کے شواہد وقرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کو باقی رکھنا تھا اور باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہے ورنہ بدھ مذہب کیا باقی ہے عیسائیت کیا باقی ہے عیسائیت کے بارے میں قرآن کا و لاالضآلین کہنا ایک معجزہ ہی ہے یعنی وہ پٹری سے بالکل ہٹ چکی تھی اور اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس دین اسلام کے بارہ میں فرمادیا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون، اور اس کے ساتھ جو تائید ہے جو قوی دلائل ہیں، جو سلامت فکر اور سلامتِ قلب ہے، اس کے ساتھ جو ذہین ترین انسانوں کی محنتیں اور غور وخوض کے نتائج ہیں اور ان کا جو اخلاص ہے اور ذہن سوزی ہے وہ کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے یہ وہ بات ہے ہمارے اور آپ کے استاد مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے بعض شاگردوں سے کہا جیسا کہ مولانا اویس صاحبؒ نقل کرتے تھے اور سید

صاحبؒ سے ان کے استاذ مولانا شبلیؒ نے کہی تھی۔ بعض لوگ چمک دمک والی تحریر پڑھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں "**ومن الناس من یعجبک قوله فی الحیوة الدنیا ویشهد الله علی ما فی قلبه**" اور شہیدوں کا مذاق اڑاتے ہیں، اور کہیں علمائے سلف کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہیں مفسرین ان کے تیر کا نشانہ بنتے ہیں، لھذا مسلک جمہور سے اپنے کو وابستہ رکھئے اس کا بڑا فائدہ ہوگا۔ اللہ کی خاص عنایت ہوگی اس کی نصرت و برکت ہوگی اور حسنِ خاتمہ بھی ہوگا۔

یہ باتیں ہیں جن کو میں شاید زیادہ مؤثر طریقہ سے نہ کہہ سکا لیکن آپ انہیں حقائق سمجھیں اور یہ مطالعہ اور تجربہ کا ماحصل ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں ان باتوں تک پہنچا ہوں اور آپ تک بطور امانت اور وصیت منتقل کرتا ہوں۔

۴۔ اور آخری بات یہ ہے کہ علم سے اپنا اشتغال رکھئے، اپنے کو کبھی فارغ التحصیل نہ سمجھئے، ہمیشہ نئی اور پرانی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیئے خواہ آپ کہیں رہیں، قرآن مجید کی تفسیریں، حدیث شریف کی شرحیں، تاریخ کی کتابیں اور جو کتابیں علم الکلام پر اور صحیح عقائد کو پیش کرنے کے لئے صحیح طریقہ پر لکھی گئی ہیں ان سب سے آپ کا ربط رہے اور ان کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہیں اور اپنے مرکز سے برابر تعلق قائم رکھئے۔

ع پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

وماعلینا الاالبلاغ المبین

نشانِ منزل

اسلامی وعربی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کیلئے پیغامِ عمل، یہ تقریر حضرت مولانا قدس سرہ نے وسط اپریل ۱۹۷۱ء میں ہمارے اکابرین، اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا مولد ومسکن بھٹکل کا مشہور دینی ادارہ جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں اساتذہ وطلبہ کے سامنے فرمائی تھی۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا. من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلاهادى له. ونشهد ان لا اله الا الله وحده لاشريك له ونشهد ان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلى آله وصحبه وسلم تسليما كثيرا.

اما بعد! فاعوذ بالله من الشيطان الرَّجيم بسم الله الرَّحمٰن الرحيم. لقد جآء كم رسول من انفسكم عزيز عليه ماعنتُّم حريص عليكم بالمؤمنين رؤف رحيم فان تولّوا فقل حسبى الله لا اله الا هو عليه توكّلت وهو رب العرش العظيم.

میرے دوستو، بھائیو، اور بزرگو! ہم کو اور آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ماں باپ سے بڑھ کر کسی کی اور شفقت نہیں، ماں کی مامتا دنیا میں ضرب المثل ہے، اگر کوئی عورت،

اگر کوئی انسانی ہستی، اگر دنیا کی کوئی بھی مخلوق ماں کی محبت سے بڑھ کر دعویٰ کرے تو سب اس کو جھوٹا کہتے ہیں، جھوٹا سمجھتے ہیں، اور اس پر اعتماد نہیں کرتے، اور اسکو بناوٹ، نفاق اور جھوٹا دعوی سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بچے کی محبت ماں کے دل میں ڈال دی ہے۔ جب سے یہ نظام عالم قائم ہے، یہ محبت رہی ہے۔ اس نظام عالم میں جسمانی پرورش کا نظام ایک خاص اسٹیج پر چل رہا ہے۔ اگر ماں کے دل میں بچے کی محبت نہ ہوتو بچے کی پرورش بہت مشکل ہے، چنانچہ جو بچے اپنی ماؤں سے محروم رہتے ہیں، کسی وجہ سے ان کی پرورش کے لئے بہتر سے بہتر سامان کیا جائے لیکن وہ قدرتی، وہ بے تکلف وہ خدائی محبت اور مامتا کا جوش اور فکر اور درد جو ماں کے دل میں ہوتا ہے وہ پیدا نہیں ہوتا، وہ بچے اس دولت سے محروم رہ جاتے ہیں، اس طرح سے باپ کی شفقت بھی، بالکل قدرتی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے باپ کے دل میں بھی محبت وشفقت کا مادہ رکھا ہے، اور کیوں نہ ہو اولاد اس کے چشم کا ٹکڑا بلکہ اس کے دل ہی کا ٹکڑا ہے، اس لئے جسے اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے اسے اپنی اولاد سے بھی محبت ہوتی ہے، سوائے اس کے کہ فطرت مسخ ہو جائے، انسان کی زندگی میں کوئی ایسی بات ہو جائے اور کوئی ایسا عنصر شامل ہو جائے جس سے فطرت متأثر ہو، لیکن ماں اور باپ اپنے علم کے مطابق، اپنے تجربے کے مطابق اپنی سمجھ کے مطابق، بچے کے لئے بھلائی چاہتے ہیں، اس کو تعلیم دینا چاہتے ہیں اس کی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں اچھے اخلاق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور بری باتوں سے بری صحبتوں سے بچے کو بچانا چاہتے ہیں۔

مخلوق کے ساتھ انبیاء کی غیر معمولی شفقت

لیکن کبھی کبھی ماں کی محبت بھی اندھی ہوتی ہے، کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور ماں کی محبت تو بہت اندھی ہوتی ہے، وہ اندھا دُھند کام کرتی ہے۔ اس کو فکر نہیں ہوتی کہ

بچے کے حق میں یہ بات انجام کے لحاظ سے بہتر ہے، مفید ہے یا مضر، بس مامتا کا جوش ہوتا ہے اس میں اس کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں، وہ بالکل اندھی بن جاتی ہے، بعض اوقات بچے کو نقصان پہنچانے والی ضد پوری کرتی ہے، اس کی فرمائش پوری کرتی ہے۔ وہ مکتب میں جانا نہیں چاہتا تو اس کو روک لیتی ہے، سو بہانے کرتی ہے، بیمار بتلاتی ہے، اور اس طرح سے بچہ مکتب کی تعلیم سے محروم رہ جاتا ہے اس طرح کی ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں ہیں، جس طریقہ سے انسانی جسم کی پرورش کا نظام اور ترقی کا نظام ماں اور باپ کی محبت پر چل رہا ہے اسی طریقے سے روحانی اور اخلاقی پرورش کا نظام اور سچ پوچھئے تو یہ پورا نظامِ عالم پیغمبروں کی محبت اور شفقت پر چل رہا ہے، ماں باپ میں جو لوگ ذرا سمجھدار ہوتے ہیں، جن کی نظر ذرا دور بیں ہوتی ہے، جن کی انجام پر نظر ہوتی ہے، وہ بچے کی چھوٹی چھوٹی ضدیں پوری نہیں کرتے، ان کے بے جا اصرار پورا نہیں کرتے، وہ بعض اوقات بچے کو رلاتے ہیں، بعض اوقات دکھ پہنچاتے ہیں مگر جو چیز انجام کے لحاظ سے اس کے لئے بہتر ہوتی ہے وہ اسی کا انتظام کرتے ہیں، بچہ مدرسہ نہیں جانا چاہتا وہ اسے بھیجتے ہیں، بچہ دوا نہیں پینا چاہتا پلاتے ہیں، بچہ آپریشن نہیں کرانا چاہتا کراتے ہیں، شگاف نہیں دلانا چاہتا دلاتے ہیں ان سے بڑھ کر محبت کرنے والا بچے کے لئے کون ہوسکتا ہے لیکن وہی اس کو پکڑتے ہیں وہی آپریشن کرواتے ہیں، یہی سب کچھ دنیا میں ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کی یہ مخلوق اور انسانوں کی یہ نسل تعلیم سے، تربیت سے، اخلاق سے بلکہ انسانیت سے محروم رہ جائے جس طریقے سے ہمارا یہ جسمانی نظام چل رہا ہے اسی طرح سے روحانی اور اخلاقی تربیت کا نظام پیغمبروں سے وابستہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی محبت اور شفقت عطا فرمائی ہے کہ اس محبت اور شفقت کے سامنے ماں باپ کی محبت سچ پوچھئے تو گرد ہے، ماند ہے، ہم اندازہ نہیں کرسکتے کہ پیغمبروں کے دل میں اپنی امت کی کس درجہ محبت اور شفقت ہوتی ہے، وہ کس طرح سے ان کے دل کی

تکلیف کو محسوس کرتے ہیں، ان کے پاؤں میں، ان کے تلوے میں کانٹا چبھتا ہے، انگلی میں ان کے جسم کے کسی حصہ میں پھانس لگتی ہے تو اس کی خلش وہ سارے جسم میں محسوس کرتے ہیں، اپنے امتی کے ساتھ ان کا کیسا تعلق ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنا ہمارے لئے مشکل ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، میں نے جو آپ کے سامنے آیت پڑھی آپ کو مسلمانوں کی حیثیت سے اور اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم دیا ہے، سیرت کا، آنحضرت ﷺ کے حالات سے ہم کو تھوڑی بہت واقفیت ہے تو ہم اس کی لفظ بہ لفظ نہیں، حرف بحرف نہیں بلکہ نقطہ بہ نقطہ تصدیق کرینگے۔

"لقد جآء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم. فان تولوا فقل حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم."

ایسا پیغمبر آیا ہے جو تمہیں میں سے ہے اور اگر وہ ہم میں سے نہیں ہوتا تو اس کو ہمارے درد دکھ کا احساس نہ ہوتا ہماری مشکلات کو وہ نہ جانتا، اسے جانتا بھی تو اس مشکل میں شریک نہ ہوتا، انسان کا درد انسان محسوس کرتا ہے، بھائی کی تکلیف بھائی محسوس کرتا ہے، ایک گاؤں کے رہنے والے، ایک دوسرے کے دکھ درد کو جانتے ہیں، ایک گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایک دوسرے کی مشکلات کو نہیں سمجھتے، ریاست صوبہ، ملک تو بڑی چیز ہیں اور دنیا تو بعد میں بنتی ہے، ایک چھوٹے سے گاؤں کے لوگ بھی بسا اوقات ایک دوسرے کی مشکلات کو نہیں سمجھتے، تمہارے پاس ایک پیغمبر آیا ہے جو تم میں سے ہے تمہاری جنس میں سے ہے۔ یعنی جس چیز سے تم کو ذرا بھی تکلیف ہو وہ اس کو شاق گزرتی ہے، وہ اس کو برداشت نہیں ہوتی، وہ اس کو کھل جاتی ہے، اس کی جان پر بن جاتی ہے، عزیز علیہ ما عنتم جس سے تم کو ذرا بھی تکلیف ہو، تمہاری شفقت، تمہارے درد

سے تمہاری بے چینی سے وہ بے چین ہوتا ہے، **حریص علیکم** اس کو تمہاری بڑی فکر ہے، تمہاری دُھن اس کو لگی ہوئی ہے کہ تم اللہ کے مقبول بندے بن جاؤ، اللہ کی رحمت تم پر رہے، مغفرت رہے، اس کی تھوڑی سی غفلت سے تمہارا دامن کہیں خالی نہ ہو جائے، کفر کا کلمہ تمہارے حلق سے اترنے نہ پائے، انسان جہنم کے حلقے میں شامل نہ ہونے پائے، شیطان کے حلقے میں جانے نہ پائے، اور خدا کے دین کی خدمت چھوٹنے نہ پائے بس جو بھی انسان ہے وہ انہیں میں آجائے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جھولی میں آجائے۔

ایمان والوں کے ساتھ نہایت شفقت کرنے والا اور بہت مہربان ہے، آنحضرت کی اپنی امت کے ساتھ جو تعلق تھا فکر تھی جو درد تھا، اس کا آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کس درجے کی تھی، بس یوں سمجھیئے کہ جیسے ایک ماں کی ایک ہی اولاد ہو، ماں کا ایک چھوٹا بچہ ہو اکلوتا اور ساری زندگی کا سہارا اور سارے گھر کا چراغ، اس ماں کو جیسے اپنے بچے کی فکر ہوتی ہے، اس کی ترقی سے خوشی ہوتی ہے، اس کی تکلیف سے تکلیف ہوتی ہے، تو سمجھیے ایسا ہی تعلق ایک پیغمبر کو اپنی امت کے ساتھ ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپ کا کیا تعلق تھا، یہاں تک کہ وہ لوگ جو مکہ کے رہنے والے تھے ان میں سے بعض آپ کے عزیز تھے، اور بعض ان میں سے اہل شہر تھے، ہم وطن تھے، مگر بدر میں قیدیوں کی حیثیت سے جب وہ پیش ہوئے تو نماز میں بھی آپ بے چین رہے، نماز سے آپ کو جو عشق تھا، نماز میں جو مزہ ملتا تھا اور جو طمانینت ہوتی تھی، خدا کی طرف توجہ ہوتی تھی، اس کا اندازہ ہم آپ کر ہی نہیں سکتے۔

آپ فرماتے ہیں "**قرة عینی فی الصلوٰة**" میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، آپ بلالؓ سے فرماتے ہیں کہ اے بلالؓ!

بلالؓ آپ کے مؤذن تھے، دنیا کی باتیں ہو رہی تھیں، وہاں کیسی باتیں ہوں گی،

اچھی باتوں کے سوا وہاں اور کیا ہو سکتا تھا، اسلام کی تبلیغ کی باتیں، اسلام کو پھیلانے کی تدبیریں، کوششیں، اور علم قرآن وحدیث، لیکن آپ کو حضور نماز کا جو مقام تھا، نماز سے جو تعلق تھا، آپ نماز کے لئے بے چین ہو کر بلالؓ سے کہتے اے بلالؓ! اذان کہہ کر ہم کو آرام دو، بہت انتظار کیا، اب انتظار نہیں ہوتا، بلالؓ خدا کے لئے اذان دو تا کہ ہم کو سکون حاصل ہو، تا کہ ہم کو آرام ملے، بس نماز سے آپ کا یہ تعلق تھا، اور امت کے ساتھ آپ ﷺ کا جو تعلق تھا، آپ ﷺ کہتے ہیں کہ میں کبھی کبھی نماز میں ہوتا اور پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی دل تو چاہتا کہ نماز لمبی کروں، دل کھول کر قرآن شریف پڑھوں، اپنے خدا کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ لمبے لمبے سجدے کروں، خوب اس سے باتیں کروں، خوب اس سے دعائیں کروں، اس کا نام لوں، اچھی طرح سے اس کو پکاروں، راضی کروں اور مناؤں، لیکن اس بچے کی آواز میرے کان میں آتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اس کی ماں بھی نماز میں ہوگی۔ اس زمانے میں مسلمان عورتیں بھی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آتی تھیں اور وہ زمانہ فتنہ وفساد کا زمانہ نہیں تھا، خیر القرون کا زمانہ تھا، اس لئے عورتوں کو اجازت تھی کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ، اپنے باپ کے ساتھ اپنی اولاد کے ساتھ وہ بھی اللہ کے گھر آئیں اور نماز پڑھیں، آپ فرماتے ہیں کہ میں نماز میں ہوتا ہوں، اور میرا اس وقت ارادہ ہوتا ہے کہ اپنے خدا سے دل کھول کر مانگوں گا، دل کھول کر دعائیں مانگوں گا، دل کھول کر قرآن شریف پڑھوں گا، اتنے میں کان میں ایک بچے کی آواز آتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس کی ماں نماز میں ہو اور اس کا دل بے چین رہے گا اس کا دل نماز میں نہ لگے گا، وہ اپنے بچے کو جلد لینا چاہے گی، اس وقت میں نماز مختصر کر دیتا ہوں، بھائیو اس سے بڑھ کر کیا تعلق ہو سکتا ہے، ہم کو نماز سے اس قسم کا تعلق کہاں ہے، جن لوگوں کو نماز سے تعلق ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی قربانی ہے، یہ ہمارے رسول ﷺ کی کتنی بڑی قربانی تھی، وہ نماز میں دنیا

وآخرت سے بے خبر ہو جاتے تھے، آپ کو نماز میں بالکل یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے، آپ اپنے خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر رونے، مانگنے اور گڑگڑانے میں مصروف رہتے، اس میں آپ ایک بچے کی آواز سے نماز کو مختصر کر دیتے تھے کیوں؟ اس لئے کہ اس کی ماں کو تکلیف نہ ہو، آپ کا اپنی امت کے ساتھ یہ حال تھا، آپ نے فرمایا، اے مسلمانو! میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص نے الاؤ روشن کیا، بہت ہی تیز آگ جلائی، جیسے کہ جنگلوں میں آگ ہوتی ہے، لوگ اس کے چاروں طرف بیٹھ کر تاپتے ہیں، برسات کی راتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا آگ کے پاس کیا ہوتا ہے، پروانے آ کر گرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں آ کر جمع ہو جاتے ہیں، ایک بتی روشن کر دیجئے بس کافی ہے، روشنی پھیلتے ہی خدا جانے کون ان کو خبر کر دیتا ہے، وہ آتے ہیں، امنڈ آتے ہیں، بادلوں کی طرح امنڈ آتے ہیں، وہ سب کے سب آگ میں آ کر ٹوٹ پڑتے ہیں، تمہاری مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی نے الاؤ روشن کیا اور پتنگے آ کر اس پر گرنے لگے، اسی طرح سے تم جہنم کی آگ میں گرنا چاہتے ہو، اے انسانو! تم جہنم کی آگ میں، دوزخ میں گرنا چاہتے ہو، اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تم کو آگ سے ہٹاتا ہوں، یہ آپ ﷺ کی اپنی امت کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہے، امت کے ساتھ آپ ﷺ کو الفت تھی، ایسی الفت کہ اللہ تعالیٰ کو قرآن مجید میں کہنا پڑا، سورۂ کہف میں آیا ہے:

فلعلک باخع نفسک علی آثارھم ان لم یؤمنوا
بھذا الحدیث اسفاً ○

کیا تم جان دے دو گے ان انسانوں کے پیچھے، کیا تم اپنا گلا گھونٹ لو گے، ان کے اسلام نہ لانے پر، ایمان نہ لانے پر۔؟

آپ ﷺ کو یہ فکر تھی کہ امت میں سے کوئی بھی جہنم میں نہ جانے پائے، سب جنت

کے مستحق ہو جائیں، آپ کا مقام تو بہت اونچا ہے، آپ کے غلاموں کا یہ حال تھا، آپ اپنے مشائخ صوفیائے کرام، اور صحابہ کرامؓ کی سوانح عمریاں پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں نے نبوت کی وراثت میں، آپ کے صدقے میں وہ محبت اور شفقت انسانوں کے ساتھ جتائی، اپنے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ، اپنے ساتھیوں کے ساتھ، ان لوگوں کا جو تعلق تھا، جو محبت وشفقت تھی، وہ گویا آنحضورﷺ کا صدقہ تھا، حضرت نظام الدین اولیاء جو غلامانِ محمد میں سے تھے، ان کی سب سے بڑی معراج یہی ہے، ان کا یہ حال لکھا ہوا ہے کہ ان کی مجلس ہورہی تھی، اللہ اور رسول کی باتیں ہورہی تھیں، لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے، آپ کے پاس جگہ ہی کہاں، وہ لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ جو سایہ کی جگہ تھی وہ بھر گئی، جو لوگ بعد میں آئے وہ دھوپ میں کھڑے ہو گئے، آپ نے ایک مرتبہ تڑپ کر فرمایا کہ خدا کے لئے سایہ میں آجاؤ، دھوپ میں تم کھڑے ہو، اور میں جلا جارہا ہوں، یہ حالت تھی حضورﷺ کے غلاموں کی، یہ آپ ﷺ کے غلام تھے، آپ ﷺ کے نام لیوا تھے، دوسروں کی تکلیف کا ان کو اتنا احساس ہوتا تھا کہ دوسرے دھوپ کھائیں اور تکلیف ان کو خود محسوس ہوتی تھی، وہ سوزش محسوس کرتے تھے اور ایک مرتبہ حضرت نظام الدینؒ کا واقعہ ہے کہ حضرت سے کسی نے پوچھا کہ آپ کچھ کھاتے نہیں؟ وہ روزہ رکھتے تھے، انہوں نے عمر بھر روزہ رکھا سوائے بقرعید اور عید الفطر کے باقی ایام میں وہ روزہ سے رہتے تھے، اس لئے کہ ان دنوں میں روزہ رکھنا حرام ہے، سال بھر روزہ رکھا، لوگ حلوہ لاتے تھے، دستر خوان بچھا ہوا رہتا تھا، افطار میں وہ کھاتے تھے اپنی پسند کے مطابق، بعض مرتبہ دیکھا گیا کہ ہاتھ بڑھایا ہوا وہیں رہ گیا، اور دستر خوان اُٹھ گیا، برائے نام کچھ کھالیا تو کھالیا، ایک نے پوچھا کہ آپ کیوں تناول نہیں فرماتے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ برائے نام ہی کھاتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم جو کچھ کھاتے ہو وہ میرے حلق میں جاتا ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ میرے ہی حلق کے

اندر جار ہا ہے، اوران کے ایک خادم تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ رات سحری لے کر آتے تھے، ان کی ڈیوٹی تھی کہ پانی وغیرہ وضو کے لئے رکھ آئیں، اور وہ خوان بھی لے آئیں جو کچھ بچا رہتا وہ کھاتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ سب کھاتے تھے اور حضرت روزہ رکھتے تھے، یعنی یہ کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ پیٹ بھر کر کھاتے ہوں، برائے نام کھاتے تھے، وہ کچھ بہانے سے کھاتے تھے یا جوں کا توں جیسا ہی خوان میں لے گیا ویسا ہی واپس لایا، ایک دن میں نے حضرت سے رو کر کہا کہ حضرت! آپ بھی کچھ کھائیے نا، آخر کس طرح سے کام ہوگا، عمر شریف اسی (۸۰) سے اوپر ہوتے آئی، کھائیے، بوڑھوں کی طاقت کھانے ہی سے ہوتی ہے، اب کھائے بغیر کام کیسے چلے گا، حضرت رو کر فرمانے لگے کہ میاں اقبال جو کچھ نام تھا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ کتنے اللہ کے بندے مسجدوں کے صحن میں بھوکے پڑے ہیں، کیا تم کو معلوم ہے کہ دلی کے مسافر خانوں میں کتنے مسافر ایسے ہیں جو نانِ جویں کے محتاج ہیں، ان کو کھانے کو نہیں ملتا، پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ میں سیر ہو کر کھاؤں، یہ غلامانِ محمد ﷺ کے چند واقعات ہیں جو میں نے سنائے، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاء اور بڑے بڑے اولیاء کرام کے واقعات میں نے عرض کیا، یہ سب ان کا عمل تھا، خادموں کے ساتھ یہ سب نمونہ تھا، یہ صدقہ تھا، نمونے کی ایک جھلک ہے، حضور کی شفقت کی جو آپ کو اپنی امت کے ساتھ تھی، میرے دوستو! اللہ کے سب پیغمبر اللہ کا سلام ہو ان پر، سب نے اپنی اپنی امتوں سے محبت وشفقت کا برتاؤ کیا، حضرت محمد ﷺ ماں باپ کی محبت سے بڑھ کر محبت لے کر آئے، آپ کو یہ فکر تھی، یہ حرص تھی، یہ دھن تھی کہ امت کا بیڑا پار ہو، اس کو نجات ہو، امتیوں میں سے کوئی بھی جہنم میں نہ جانے پائے، ایک امتی ہلاک نہ ہونے پائے، یہ نظام عمل تھا حضور ﷺ کا، آپ نے انسانیت کے سامنے جو تاریخ رکھی، جو ہدایت کا راستہ بتایا، اس پر چل کر مسلمان ہمیشہ کامیاب ہونگے، دنیا میں بھی آخرت میں بھی، دنیا میں

راحت ہوگی، آخرت میں جنت کے مزے لوٹینگے، دنیا میں جنت کے جھونکے آئیں گے اور جن کی ہوا چلے گی، اولیاء کرام کا مقولہ ہے کہ خدا کی قسم ہم کو جنت کا مزہ آرہا ہے، اور بہت سے عارفوں کا کہنا ہے کہ اگر لوگوں کو خبر ہو جائے دنیا والوں کو کہ ہم کس جنت میں رہتے ہیں، اسی زندگی میں ہم کو جو سکھ حاصل ہے...... تو خدا کی قسم وہ لوگ ہم کو یہاں بیٹھنے نہ دیں گے، ہم کو کام کرنے نہ دیں گے، وہ تلواروں کے ساتھ چل کر آئیں گے، اور ہم کو اٹھا کر کے یہاں ہماری جگہ پر خود بیٹھ جائیں گے، ہم کو دنیا فاقہ کرتا ہوا دیکھتی ہے یا پیٹ میں پتھر باندھے ہوئے دیکھتی ہے، چیتھڑے لگائے ہوئے، پیوند لگائے ہوئے دیکھتی ہے، ہم کو دنیا مال کے اعتبار سے کھانے کے اعتبار سے بہت بے مایہ اور بہت فقیر دیکھتی ہے لیکن ہم تو یہاں جنت کا مزہ لوٹ رہے ہیں، ہم کو جو یقین اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا، جو راحت ہم کو بخشی، جو ہمارے دل میں استغنا رکھا، دل میں سے ہر خوف کو نکال دیا، امید ختم کردی، نہ کسی سے امید، نہ کسی سے خوف، **لاخوف علیھم ولاھم یحزنون**، کہ ہم کو جنت کا مزہ آرہا ہے، جنت کی تعریف کیا ہے، وہاں نہ خوف ہوگا، نہ مصیبت کی فکر ہوگی، نہ کیے ہوئے پر پچھتاوا نہ پشیمانی، نہ آئندہ کا غم ہوگا، یہ ان اولیاء کرام نے زندگی حاصل کی ہے۔

دنیا وآخرت میں کامیابی کی ضمانت

میرے دوستو! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو راستہ ہم کو بتایا ہے، جو تعلیم آپ ﷺ لے کر آئے اور جو کتاب آپ لے کر آئے، اس پر چل کر ہم دین و دنیا دونوں جگہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، ہم اس کے بغیر کتنی بڑی عقلمندی سے کام لیں، کتنے فلسفی ہوں، کچھ بھی ہوں، نہ ہم اس دنیا میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اس دنیا میں ہم کو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، آپ کی اطاعت ہی میں کامیابی

ہے، آپ ہی کے راستے میں فوز وفلاح ہے، آپ ہی کے راستے میں سعادت ہے، آپ نے جو طریقہ بتایا ہے اسی طریقے میں ہمارے لئے کامیابی اور نجات ہے، ہماری عقل ہم کو کیا سمجھاتی ہے؟ ہماری عقل ہم کو یہ سمجھاتی ہے کہ آج کے فلسفہ اور آج کل کے نظام میں، آج کل کی تربیت میں ترقی ہے، ہمارا نفس ہم کو یہ طریقہ بتاتا ہے، یہ فلسفہ دیتا ہے علمی مسئلہ بتادیتا ہے کہ کیسی دنیا اور کہاں دنیا کی فکر، کیا ملت کا مفاد، کیا ملت، کیا ادارے، کہاں کا مسلمانوں کا مسئلہ، دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ کہاں، ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ کہاں، کھاو پیومست رہو، کماؤ زیادہ سے زیادہ، کماؤ اور اولاد کے لئے زیادہ سے زیادہ چھوڑ کر جاؤ، عمدہ مکانات اور بنگلے بناؤ اور جائیدادیں خریدو، باہر ممالک چلے جاؤ، کس فکر میں جڑے ہو تم کہاں کا عقبیٰ، کہاں کی آخرت،؟ اور کہاں کے ملت کا مفاد، کہاں کے ملت کے مسائل کہاں کی مسلمانوں کی فکر، اس جھنجھٹ میں اگر ہم پڑیں گے تو ہم سے نہ کھایا جائے گا، نہ پیا جائے گا یہ تو تپ دق ہے، تپ دق کیوں مول لیتے ہو (EAT DRINK & BENEW) کھاؤ پیو اور مست رہو، یہ جو یورپ کا فلسفہ (BEMERRY) رہنے کا جو فلسفہ ہے ہمارا نفس ہم کو یہ بتاتا ہے کہ ہمارا بڑا مسئلہ ہماری ذات کا مسئلہ ہے، قوم کا مسئلہ نہیں ہے، اجتماعیت کا مسئلہ اور ملت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ زید کا، بکر کا اور عمر کا ہے، یہ جو اکائیاں ہیں، ملت کی ہر اکائی کا ہے، ہم کو تجربہ بتاتا ہے کہ اکائی دہائی کچھ نہیں، بس یہی دنیا ہے، یہی آخرت ہے، یہی اچھا ہے اور یہی برا ہے، اس کے نتیجہ میں کھانے کو جو کچھ بھی مل جائے اور کھانے کو تو بہت کچھ مل جاتا ہے، پہننے کو تو بہت کچھ مل جاتا ہے مگر یہ ہے جانور کی سی زندگی، بندر کی زندگی، بندر کی زندگی کیا ہے، گدھے کی زندگی کیا ہے، بھینس کی زندگی کیا ہے، کھالیا، پی لیا اور اپنے بچوں تک کی بعض جانوروں کو فکر نہیں ہوتی، ایسا دیکھا گیا ہے، کہ بچہ بھی اگر منہ مار رہا ہے تو ماں اس کے منہ سے لقمہ چھین رہی ہے، اسے کھانے نہیں دیتی، یہ ہے حیوانیت کا فلسفہ، یہ ہمارا

نفس ہم کو بتاتا ہے، **وزین لھم الشیطان ما کانوا یعملون** ۔شیطان ان کے اعمال کو آراستہ کر کے دکھاتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ دوسروں کی فکر میں تم کیوں گھلے جارہے ہو، ہر وقت لوگوں کے غم میں مبتلا رہتے ہو، یہ درد یہ مرض اور یہ بیماری جس کو لگ گئی وہ گھلتا چلا جاتا ہے، اس کی ہڈی کو بھی گھلا دیتی ہے، یہ ہمارا نفس ہم کو بتاتا ہے اور ہمارا نفس سمجھاتا ہے کہ کہاں کا مرنا اور کہاں کا جینا، **ان ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیٰ** ۔ یہ سب کھیل ہے، یہی دنیا کی زندگی ہے، آج ہم زندہ ہیں کل مرجائیں گے کہاں کے ملت کے مسائل، کہاں کی اجتماعیت، کہاں کے ملی مفاد، کیسی تعلیم وتربیت، اس ملک میں کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے، آنے والی نسلوں کا حال کیا ہوگا، ہم پر کیا ذمہ داری ہے، ہم پر صرف اتنی سی ذمہ داری ہے کہ بس کھالیں، پی لیں، بچوں کو پڑھائیں، ان کو آگے بڑھائیں، ان کو ایک کامیاب انسان بنائیں، ان کے مستقبل کا کیا ہوگا، اس ملک میں کیا ہونے والا ہے، مسلمانوں کا کیا ہونے والا ہے، اس فکر میں ہم کیوں پڑیں، یہ **فلسفہ** ہے نفس کا، نفسانیت کا اور حیوانیت کا، انفرادیت کا، جب کوئی قوم اس فلسفہ میں مبتلا ہو جاتی ہے، اور نفسی نفسی میں پڑ جاتی ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوگا، ایک چھوٹا سا کنبہ آج وہ کنبہ بھی مختصر ہو رہا ہے، اپنی ہی زندگی میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ کنبہ روز بروز مختصر ہو رہا ہے، پہلے چچازاد، تایازاد بھائی، ماموں زاد، پھوپھی زاد بھائیوں کا پورے کنبہ سے تعلق تھا، جب انسانیت کا تعلق تھا تو پوری برادری کے ساتھ تعلق تھا، گاؤں کا ہر بچہ اپنا بچہ معلوم ہوتا تھا اور ہر آدمی اپنا بھائی معلوم ہوتا تھا، جب اس کے بعد مادیت کارفرما ہوگئی تو یہ بات آئی کہ اگر ایک محلے کے کسی بچے کو دوسرے محلے کے بچے نے چھیڑ دیا یا مار دیا تو بس بپھر گئے کہ ہمارے محلے کے بچوں کو مارنے کی کیسے ہمت ہوئی، کیسے مجال ہوئی، ہمارے محلّہ کے بچہ کی طرف نظر اٹھا کر کیسے دیکھا، اب اس محلّہ کے لوگ ، اس محلّہ کے لوگ ایک دوسرے سے جرمن اور انگریزوں کی لڑائی کی طرح دونوں آمنے سامنے

کھڑے ہوگئے، پھر محلّہ میں لڑائی شروع ہوگئی، پہلے خاندان میں، سگے ماموں زاد بھائی، سگے خالہ زاد بھائی، سگے پھوپھی زاد بھائی جسے انگریزی میں (COUSINS) کہتے ہیں، کا معاملہ آیا، ان سے بھی لڑنے بھڑنے کے لئے تیار، اس طرح لڑائی ہوئی، چچازاد بھائی، اور تایازاد بھائی آپس میں لڑنے لگے، اس کے بعد پھر وہ زمانہ آیا کہ بھائی بھائی کے درمیان لڑائی ہوئی، اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ سگے بھائی کی جگہ اپنی اولاد سے لڑائی ہوئی ہم اور آپ جس زمانے سے گذر رہے ہیں، یہ زمانہ ہے اپنی اولاد کا، اگر ترقی کا حال یہی رہا، اگر یہ رفتار یونہی جاری رہی، زندگی کا سفر یوں ہی جاری رہا، تو آپ دیکھ لیجئے گا کہ باپ بیٹے کا بھی نہ ہوگا، باپ بیٹے سے چھین کر کھائے گا، ایسا دیکھنے میں بھی آیا ہے قحط سالی کے موقع پر ایسا ہوا کرتا ہے کہ اپنے بچے کو ماں باپ نے بھون کر کھالیا، بیچ کر کھالیا، یہ آخری حد ہے، جہالت کا اگر ایسا ہی غلبہ رہا تو وہ زمانہ آجائے گا کہ جب کہ لڑکے کے منہ سے نوالہ چھین کر آدمی کھائے گا، یہ حالت ہوتی ہے نفس پرستی کی، شکم پرستی کی سمٹتے سمٹتے تعلقات اپنی اولاد تک آگئے، اور یہ بھی ختم ہوجائے گی، اولاد بھی نہ رہے گی، پھر اپنا نفس اور اس میں ترقی جاری رہے گی، تو آپ دیکھیئے گا کہ ہاتھ ہاتھ کے ساتھ تعاون نہیں کرے گا، بلکہ یہ چاہے گا کہ کل جامعہ اسلامیہ کے بچوں نے تماشا دکھایا کہ منہ سے پیسہ کو اٹھایا، ہاتھ کہے گا کہ کھانا تو آپ کو ہے میں کیوں آپ کی مدد کروں، زمین پر لیٹ کر کے منہ کے ذریعہ کھایئے، جامعہ اسلامیہ کے بچے زمین پر لیٹ کر کے پیسہ کو اٹھا کر بھاگ گئے، ان بچوں نے جس طرح کرتب دکھایا تھا، یہ کرتب کھائے گا کل کو انسان، ہاتھ مدد کو نہیں آئے گا، پاؤں کہے گا کہ میں کیوں چل کر کے جاؤں کھانا تو آپ کو ہے، مزہ تو آپ کو آئے گا، اور زبان وہاں تک جانے کے لئے کہے گی کہ ہم کیوں تھکیں آپ پیٹ کے بل رینگ کر کے کھایئے گا، اسی پیٹ کو تکلیف دیجئے پاؤں کیوں آئے اس کی مدد کے لئے جیسے سانپ رینگتا ہے جیسا کہ اور بہت سے جانور زمین

پر رینگتے ہیں ویسے آپ جا کر کھا لیجئے ،منہ کو مزہ آئے گا پیٹ میں جائے گا یہ فلسفہ یہ بتاتا ہے ،دیکھو اس وقت دنیا کی حالت کیا ہوتی ہے،جہنم سے بدتر ہو جاتی ہے، کسی کو فکر نہیں ہوتی ، یہ سمجھ لیجئے چوہے بندر اور بیل کی طرح منہ مارتے لگیں گے،کوئی کام نہیں ہوگا......کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا،انصاف اور بے انصافی کے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں کوئی کسی کا حق تسلیم نہیں کرتا،ایثار وقربانی دن بدن ایک قصہ پارینہ اور ایک داستان بن کر رہ جاتے ہیں،کہاں کا انصاف اور کہاں کی ناانصافی،کہاں کی قربانی، یہ باتیں پرانے زمانے کی کہاوتیں بن جاتی ہیں،اللہ کے پیغمبر ہم کو اس کے خلاف ایک نظامِ زندگی دیتے ہیں اور ہم کو زندگی گذارنے کا طریقہ بتاتے ہیں، یہ بھی کیا زندگی ہے،کھالیا، پی لی، پیٹ بھر لیا، یہ بھی کوئی زندگی ہے،لعنت ہو ایسی زندگی پر، جانور کی زندگی پر، بکرے کی زندگی پر،لیکن انسان کی زندگی پر خدا کی رحمت ہو، وہ کیا آدمی ہے جس کے دل میں انسان کا درد نہ ہو اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر ہو، دنیا میں کیا ہو رہا ہے، کسی دوسرے کا پیٹ بھر رہا ہے کہ نہیں، وہ یہ نہیں دیکھتا۔

پیغمبروں کی میراث

پیغمبر جو زندگی بسر کرتے ہیں اس زندگی کے لئے شریعت آئی ہے اس زندگی کے لئے قرآن اترا ہے،خدا کے بندوں نے کوشش کی ہے کہ تعاون کی ، ہمدردی کی ،محبت کی ،ایثار وقربانی کی زندگی عام ہو،انسان بندر نہ بنے ،انسان گدھا نہ بنے ،بس یہی فکر نہ کرے کہ اس کو جو کھانا مقرر ہے جتنا دودھ مقرر ہے ، جتنا چارہ مقرر ہے، وہ اس کو مل جائے بلکہ اس کو یہ فکر ہو کہ میرے ہم جنس میرے جیسے انسان ہیں جن کو کھانے کو نہیں ملا ہے ان کو بھی کھلاؤں اور وہ اسی میں خوشی محسوس کرتے ہیں وہ دوسروں کو کھلا کر کھاتے ہیں، رکھ کر کے انہیں آرام نہیں ملتا، یہ ہے پیغمبروں کی میراث اس کے لئے پیغمبروں نے

کوشش کی ہے پھر اس کے لئے لڑے کہ انسانوں میں درد عام ہو، انسانوں میں یہ کیفیت عام ہو...... صحابہؓ کے واقعات آپ نے سنے ہوں گے، ایک زخمی صحابیؓ کے پاس پانی کا پیالہ لے کر گئے تو انہوں نے کہا کہ ''میں نے ابھی کراہ سنی تھی دوسرے زخمی بھائی کی، ''آپ پہلے ان کو پانی پلا دیجئے'' دوسرے نے کہا ''تیسرے زخمی بھائی کی کراہ سنی تھی'' اس کے پاس پانی لے گئے تو اس نے کہا ''چوتھے بھائی کی کراہ سنی تھی'' آخر میں جب پانی لے جایا گیا تو سب کے سب انتقال فرما گئے تھے، یہ ہے انسانیت کی میراث، انسانیت کی عظمت کا راز، انسان کی اشرفیت کا راز، اس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور اس کے لئے یہ امت کھڑی کی گئی ہے اگر یہ امتی بھی اس نفسی نفسی کے اصول پر چلا جائے، اگر نفس شیطان کی پیروی میں آگے بڑھ جائے، حقیقت کو حقیقت نہ سمجھے اس کا انکار کر دے اور یہ سمجھے کہ سوائے کھانے پینے کے اور کوئی کام نہیں ہے تو سمجھیئے کہ یہ امت مرگئی، کوئی خصوصیت اس کی باقی نہیں رہی، پیغمبروں نے فرمایا کہ اپنے میں مگن رہنا اور اپنے میں مست رہنا یہ ہلاکت ہے، جب صحابہ کرامؓ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اپنے کاروبار کو تج دیا ہے، ہم سب کو بھول گئے، دنیا و مافیھا سے بے خبر ہو گئے ہم نے اسلام کی خدمت کی، ہماری کوٹھیاں اجڑ گئیں، ہمارے کھیت برباد ہو گئے، ہماری تجارتوں کا دیوالہ نکل گیا، اب کچھ دنوں کے لئے ہم اپنے ذاتی کاروبار کو دیکھ لیں اس کے بعد پھر اسلام کی خدمت میں لگ جائیں گے، وہ جب اس طرح سے سوچنے لگے تو اسی وقت خطرے کی گھنٹی بجی، یہی وجہ ہے کہ ان کو فوراً تنبیہ دی گئی کہ خبردار یہ کیا خیال تمہارے دل میں آ گیا ہے یہ خیال پیدا کیسے ہوا، خبردار ایسا خیال نہ کرنا، یہ زہر کا پیالہ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے منہ سے نہ لگالینا، ان کو یاد دلایا گیا کہ جاؤ پھر اس خیالِ خام سے باز آ جاؤ ورنہ تمہارا کام تمام ہو جائے گا، **ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ** یہ تمہارے حق میں سم قاتل ہے یہ زہر اگر تم نے پی لیا تم کو اگر یہ خیال آ جائے

کہ تم اپنے کاموں کو کرلو، تمہارے اندر یہ فکر رہے کہ تم امن سے رہو اور دین کے کام پس پشت ڈال دو تو یاد رکھو تم مرجاؤ گے، اس لئے کہ تھوڑی دیر کے لئے اگر تم اپنا کاروبار سنبھال بھی لے جاؤ گے تو کیا ہوگا، ملت نہیں بنے گی **والا تفعلوہ تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر**، جہاں مسلمانوں کے درمیان ایک نیا رشتہ قائم کیا، ایک نئی برادری بنالی **الا تفعلوہ** اگر تم نے اپنی ملت کے کام سے کوتاہی کی، اگر غفلت سے کام لیا، اسلام کی برادری توڑ ڈالی **تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر**، تو دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگا، یہ انسانیت تاراج ہوجائے گی، خاک کا ایک تودا بن جائے گا، دھول کا ایک ڈھیر ہوگا، ساری ملت کو ایک سمجھ، ساری ملت کے مفاد کے لئے ایثار و قربانی سے کام لو، اسلام کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری بنالو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا حامی و مددگار بن جائے۔

صحابہ کرامؓ کے ذہن میں جب یہ بات آئی کہ ذرا اپنے دنیاوی کاروبار کو دیکھ لیں تو اللہ گواہ ہے کہ دین کا تقاضا فوراً ان کو سمجھایا گیا، بتایا گیا کہ خبردار! یہ بہت ہلاکت انگیز خیال ہے، یہ ذاتی مسائل کو سوچنا اور ملت کے مسائل کو بھول جانا تمہارے حق میں سم قاتل ہے اور صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کی زندگی اور اس کے بعد خلفاء راشدین کے دور میں کیا کیا قربانیاں دیں کیا بتائیں، ان کو اپنا مال اپنی جان، اپنا وقت، اپنی اولاد، اپنا گھر بار کسی کی پرواہ نہیں تھی، سب چھوڑ دیا، سب خدا کے دین کو سونپ دیا، اولاد کی پرواہ نہیں تھی، تجارت کی پرواہ نہیں تھی، کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی، عمر بھر کی کمائی کی پرواہ نہیں تھی، یہاں تک کہ بچوں اور ماں باپ کی پرواہ نہیں تھی، صحابہ کرامؓ نے اسلام کو جو طاقت بخشی وہ ہماری اتنی ناقدری، اتنا ظلم اور جینے کی لالچ کے بعد بھی قائم ہے انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک قائم رہے گا۔

نفسی نفسی کا کاروبار چھوڑیے

میرے دوستو! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے راستے سے بڑھ کر کوئی صحیح راستہ نہیں ہوسکتا، انہوں نے راستہ بتایا، مسلمانوں کے پھلنے پھولنے کا، تجارتیں کرنے کا، اس راستے کو اختیار کیجئے، اور نفسی نفسی کے کاروبار کو چھوڑ دیجئے ...... میری ذات، میرا کاروبار، میری اولاد، میرا مال، بس اسی کی فکر ہے یہ حال ہے اس امت کا بڑے سے بڑا مسئلہ پیش آتا ہے، تعلیم کا مسئلہ ہے جس کو ہم یوپی میں حل کررہے ہیں، اس کے لئے میدان میں اتر آئے ہیں، لیکن مسلمان سرمایہ دار اپنا پیسہ دبائے ہوئے ہیں، اس نظام کو قائم کرنے کے لئے تھوڑے سے سرمایہ کی ضرورت ہے وہ بھی پورا نہیں ملتا اسی طرح سے علیگڑھ کا مسئلہ ہے تعلیمی اداروں کا مسئلہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے ایسے چار آدمی مل کر اس کو چلا سکتے ہیں، لیکن یہ پیسہ دبائے ہوئے ہیں اپنی کمر مضبوط کسے ہوئے ہیں چاہے چمڑی چلی جائے، دمڑی نہ جائے لیکن جب وقت آتا ہے تو چمڑی جاتی ہے اور دمڑی بھی جاتی ہے وہ وقت آئے گا جب سزا ملے گی جب امتیوں کو سزا ملتی ہے، چمڑی تو کیا ہے دمڑی بھی چلی جاتی ہے، یہ دمڑی کس کے لئے جب دمڑی چلی جائے، یہ ایک عیب لگ گیا ہے، مسلمانوں کو یہ ایک گھن لگ گیا ہے مسلمانوں کے اندر سرمایہ کی کوئی کمی نہیں ہے، ایک ایک جگہ کے مسلمان پورے ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرسکتے ہیں، آدھی نہیں تو چوتھائی ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں، لیکن نہیں کرتے بس مست ہیں، مگن ہیں، آپ دیکھئے مسلمانوں کے کاروبار کی حیثیت کیسی ہے، بمبئی میں دیکھئے کالی کٹ میں دیکھئے مدراس میں دیکھئے، کلکتہ میں دیکھئے مسلمانوں کا کاروبار ملے گا بعض کاروبار تو ایسے ہیں جو خالص مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

میں نہیں جانتا یہاں کونسی کونسی تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے لیکن جب کسی ملی

ادارے کے لئے کچھ مانگیے تو ایک جواب یہ ملتا ہے کہ ''اپنا ہی پورا نہیں ہوتا'' یہ جانتے ہیں کہ جب وقت آئے گا تو کوئی بہانہ نہیں چلے گا، وہ آخری بہانہ کر دیتے ہیں اگر ہماری ٹولی ان کے پاس جاتی ہے تو پوچھتے ہیں ''کیوں آئے ہو''۔

ہلاکت کا سامان

تم نے جب زکوٰۃ ادا نہیں کی تو خدا نے ہی تم پر یہ ٹیکس مسلّط کیا، جو قوم زکوٰۃ کو یعنی خدا کی مقرر کی ہوئی رقم کو روکتی ہے تو اس پر نئے نئے ٹیکس مسلّط ہو جاتے ہیں، جیسے کسی کو بیماری لگا دی، گھر میں بیوی بیمار ہے، بعض لوگوں سے پوچھا کہ اتنی بڑی آپ کی تنخواہ ہے وہ کیا ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں صاحب! دس برس سے جو بیماری آ گئی ہے گھر میں وہ جانے کا نام نہیں لیتی، روزانہ ڈاکٹروں کو بلانا پڑتا ہے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا بورڈ بٹھانا پڑتا ہے، اسکریننگ کرنا پڑتا ہے، ایکسرے کرانا پڑتا ہے، بعض دفعہ یورپ جا کر علاج کرنا پڑتا ہے، یہ مرض کھاتے پیتے لوگوں کو اللہ نے لگا دیا ہے، کسی کو کوئی اور خبط ہو گیا ہے، جس کو (HOBBY) کہتے ہیں، غرض یہ کہ پہلے راستے پر خرچ کرنے سے اگر ہاتھ روکو گے تو دوسرے راستوں پر خرچ کر کے نہ تم کو فائدہ نہ ملت کو فائدہ نہ اسلام کو فائدہ نہ انسانیت کو فائدہ، ان راستوں میں تمہارا پیسہ نکلنا شروع ہو جائے گا، یہ ہے ہلاکت کا سامان، ایک بیماری یہ ہے کہ مسلمانوں کا سرمایہ ان کو عزیز ہو گیا ہے اور ملت کے مسائل کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا ہے، صحابہ کرام کا معاملہ جدا تھا، ان کو پیسہ کی کوئی پرواہ نہ تھی، صحابہ کرام کو ملت کے مسائل کے سامنے پیسہ عزیز نہیں تھا، گھر میں جھاڑو دے کر آتے تھے وہ لوگ، صحابہؓ کے کئی ایک واقعات آپ لوگوں کو یاد ہوں گے پھر بھی ایک واقعہ تم کو بتاتا ہوں جو تم کو معلوم ہے پوچھا رسول اللہ ﷺ نے اے ابوبکرؓ تم نے گھر میں کیا چھوڑا، انہوں نے فرمایا ''اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑا'' یہ حالت تھی صحابہ کرام کی

لیکن ہمارا نفس ہم کو یہ کہتا ہے کہ یہ ایثار کا راستہ زندگی کا راستہ نہیں ہے بلکہ ہلاکت کا راستہ ہے، ہمارا نفس کہتا ہے کہ پیسہ بچائے رکھنا، ترقی کرنے کا راستہ ہے لیکن پیغمبر کہتے ہیں کہ یہ ہلاکت کا راستہ ہے، ان کی بات سچی نکلتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہم تباہ ہوتے جارہے ہیں، اتنے بہت سے قارون ہماری قوم میں ہیں اور ہر گاؤں میں چار پانچ قارون بنے ہوئے ہیں لیکن ہماری ملت کی کیا حالت، ہماری ملت کی عزت کیا رہ گئی ہے، ہماری ملت دوکوڑی کی ہوکر رہ گئی ہے، جہاں چاہو فساد کرادو، مسلمانوں کی عزت ہوتی، رعب ہوتا، ہمارا کیرکٹر ہوتا، ہم کیریکٹر کے لوگ ہوتے، ایثار کرنے والے ہوتے، روپے پیسے جھونک دینے والے ہوتے تو کس کی مجال تھی کہ جہاں چاہے بس ایک جھنڈی لے کر چلا جائے یا دیا سلائی (**ماچس**) لے کر آگ **لگاتا چلا جائے**، ہمارے گھروں کو، کیا مجال تھی کسی کی کہ کوئی فساد کرا سکتا، ملت بے عزت ہوگئی ہے، بے آبرو ہوگئی ہے، بے وقعت ہوکر رہ گئی ہے، ملت کی جان جان نہیں رہی، ملت کی عزت عزت نہیں رہی، ملت کی زندگی زندگی نہیں رہی، ملت کی آبرو آبرو نہیں رہی، جو آبرو باختہ جو اوباش ہو؟ بس جہاں چاہے فساد کرادے، کیا مجال تھی، اگر آپ میں آبرو ہوتی آپ میں ایثار کا مادہ ہوتا، اگر آپ میں پیسہ خرچ کرنے کا مادہ ہوتا، اگر آپ سینہ سپر ہوجاتے ملت کے لئے، اگر آپ یہ ثابت کردیتے کہ آپ ایک مستحکم ملت ہیں، اگر آپ کو پیسہ سے عشق نہ ہوتا اگر آپ کے اندر قارون نہیں ہوتے تو کیا ملت اتنی بے آبرو ہوتی؟ کیا کسی کو ہمت ہوتی کہ کہیں فساد کرائے، کل کس کی ہمت ہوگی کہ فساد کرائے، یہ اقلیت کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، باعزت ملتوں کے لئے، باعزت قوموں کے لئے، غیرت مند قوموں کے لئے اقلیت اور اکثریت کا سوال نہیں ہوتا، آج کسی پارسی کو مار کر دیکھئے آج کسی اینگلو انڈین کو مار کر دیکھئے، آج کسی سکھ کو پوچھ کر دیکھئے، کہنے کو یہ اقلیت ہیں، پنجاب بنالیا، انہوں نے اپنے ایثار کی بدولت ایک صوبہ بنالیا، ایک لسانی صوبہ بنالیا، اور آپ اپنی حفاظت بھی نہیں

کر سکتے، کس دن آپ کا یہ سرمایہ کام آئے گا، کیا آپ یہ دیکھ کر کہ اتنی بڑی فرم اتنی جگہ اور یہ آپ کی چار جگہ دکانیں ہیں، یہ دیکھ دیکھ کر آپ پھول رہے ہیں اگر ان چیزوں سے اسلام کا فائدہوتا، ملت کا فائدہوتا تو ہم سے زیادہ خوش ہونے والا کوئی نہیں تھا، اب کیا ہم پر رعب جماتے ہو کہ اتنے بڑے سرمایہ دار ہو، تجارت دور دور پھیلا رہے ہو، اگر ملت کے لئے یہ سرمایہ دار بے حس نہ ہوتے، بے غیرت نہ ہوتے، کم ہمت نہ ہوتے، پست ہمت نہ ہوتے تو آج یہ ملت اتنی ذلیل نہ ہوتی۔

فسادات کا اصل علاج

آپ فساد کا ہم سے علاج پوچھتے ہیں، فساد کا علاج یہ ہے کہ اپنے پیسہ کو اپنا پیسہ نہ سمجھئے فساد کا علاج فرقہ وارانہ فساد کا علاج یہ کہ جو زبان آپ کے خلاف چلے اس کو پکڑ لینے کی آپ میں طاقت ہو، فساد کا علاج یہ ہے کہ آپ کے خلاف جو ہاتھ بڑھے اس ہاتھ کو پکڑ لینے کی آپ میں طاقت ہو، فساد کا علاج یہ ہے کہ آپ کے خلاف جو ہاتھ بڑھے اس ہاتھ کو پکڑنے کی ہمت آپ کے اندر ہو، کیونکہ یہ ہاتھ مسلمانوں کے خلاف اٹھ رہا ہے! اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو آپ نہیں بچ سکیں گے، یہ تعاون کا زمانہ ہے، ایثار کے ذریعہ پیسہ خرچ کر کے اپنی ملت کو مضبوط بنانے کا۔

بہت افسوس ہے اور بہت درد کے ساتھ مجھے یہ باتیں کہنی پڑ رہی ہیں، آپ سے میں نے یہ باتیں کانپور میں کہیں، یہ باتیں رنگون میں کہیں، میں رنگون ۱۹۶۰ء میں گیا تھا جب میں کالیکٹ آیا اور آپ بھائیوں سے ملا تو رنگون ہو کر آیا تھا، میں نے رنگون میں کہا کہ میں صاحبِ کشف نہیں، صاحب الہام نہیں ہوں، میں ایک بہت ہی گناہ گار انسان ہوں، خدا جس سے سچ بات کہلوائے، میں نے ان سے کہا وہ لکھ پتی لوگ تھے، دعوتیں کرتے تھے، استقبال کرتے تھے، ہم سے بڑی محبت کرتے تھے، میں نے

دیکھا کہ ان میں یہ روگ ہے میں نے کہا کہ اگر تم تبلیغ میں نہ نکلے راہ خدا میں نہ نکلے اگر تم نے اپنے مال میں سے خدا کا حصہ نہ دیا، ملت کے مسائل ملت کے مفاد کے لئے پیسہ نہ دیا تو یاد رکھو تمہاری دوکانوں پر سیل پڑے گی اور تمہارے مل ضبط کر لئے جائیں گے اور تمہارا تھوڑا گذارہ لگا دیا جائے گا اگر دین کے تقاضے پورے نہیں کئے تو خدا تم پر عذاب مسلط کرے گا آپ یقین مانیے میں قسم کھا کر کہتا ہوں، میں بالکل بھول گیا جو کچھ وہاں کہہ کر آیا تھا، اب آیا وہ زمانہ کہ قومی حکومت قائم ہوئی، وہاں سے خط آتے تھے وہ خط کیا تھے، وہ خط آنسو ہوتے تھے ان خطوں میں لکھا ہوا تھا کہ مولانا آپ نے جو باتیں ارشاد فرمائی تھیں ان کو سن کر ان کو بار بار پڑھ کر برما کے مسلمان روتے ہیں جب میں وہاں جاتا تو جب اعلان ہوتا کہ مولانا ابوالحسن علی کی تقریر فلاں اسٹریٹ میں ہوگی تو مجمع جمع ہو جاتا، میری تقریریں چند اصحاب نے نقل کر کے بھیج دی ہیں اس کی چند سطریں پڑھ کر مجھے خود تعجب ہوا کہ میں نے کس حال میں یہ باتیں کہہ ڈالیں۔

میرے دوستو! میں آپ کی بدشگونی نہیں کرتا، آپ کو اللہ حفاظت میں رکھے آپ کے مال کی حفاظت فرمائے آپ کو امن و امان میں رکھے لیکن یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے یہ طریقہ بڑا خطرناک طریقہ ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ تحشرون O واتقوا فتنۃ لاتصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ واعلموا ان اللہ شدید العقاب O

اے ایمان لانے والو! قبول کرو اللہ کی دعوت کو اور اس کی پکار کو جب وہ بلائے اس چیز کے لئے جو تم کو زندہ کردے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے لیکن ہماری حالت کیا ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی اور کبھی آتی بھی ہے تو موقعہ نہیں، ذریعہ نہیں ہوتا۔

شانِ رنگ وبو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

میں صاف کہتا ہوں، بھٹکل کے مسلمانوں کو اللہ نے بہت کچھ دیا ہے وہ ملت کی فکر کریں، ملت کی حفاظت کریں، یہ ٹکڑیاں یہ لبے یہ نوائط یہ ملت نہیں ہے، سارے مسلمان ہندوستان کی فکر کریں اور جو مسلمانوں کے مسائل ہیں ان کو حل کرنے کی کوشش کریں، اس میں حصہ لیں، اس کو مضبوط کریں، اس کو پھیلائیں اور اپنے غیر مسلم دوستوں کو تعارف کرائیں، اسلام کا پیغام پہنچائیں، اپنی زندگی سے ان کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کریں اپنے اخلاق سے ان کے دل ودماغ پر اچھا اثر ڈالیں، ان کو اپنے سے مانوس کریں، نفرت اور عداوت ان کے دل سے دور کریں اگر یہ سب آپ لوگ کریں گے تو محفوظ رہیں گے ورنہ ایک بھٹکل کے مسلمان کیا ایک دکن کے مسلمان کیا، ریاست میسور کے مسلمان کیا، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے ایشیا کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے، مشرق وسطیٰ میں جو اتنا بڑا زلزلہ آیا یہ کس بات کا نتیجہ تھا، سرمایہ دار اور سرمایہ پرست بادشاہ جن کو خدا نے سب کچھ دیا تھا وہ نفس پرست تھے، وہ ایثار نہیں جانتے تھے، جفاکشی بھول چکے تھے، سادہ زندگی کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے (AIR CONDITION) ایرکنڈیشن میں رہنا (TELEVISION) ٹیلی ویژن سے ہروقت راز ونیاز یہ ان کی زندگی کا طور طریقہ، پچیس لاکھ یہودیوں نے جو مٹھی بھر تھے، سارے عربوں کو یعنی دس کروڑ عربوں کو ذلیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو ذلیل کردیا، یہ اسی امارت کی محبت کا نتیجہ ہے، حدیث سریف میں آتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا تم پر وہن مسلط کردیا جائے گا، کمزوری مسلط کردی جائے گی، صحابہ کرامؓ

نے پوچھا یا رسول اللہ وہن کس کو کہتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زندگی سے محبت اور موت سے نفرت۔ دوستو! یہی تو اب ہو رہا ہے، یہی تو ہے آج کے مسلمانوں کا مرض یاد رکھئے کہ کسی قوم میں خالی بڑے بڑے تاجروں، لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کا ہونا بالکل کافی نہیں ہوگا، اور تم جانتے ہو کہ جب اس قوم پر کوئی خطرہ کوئی مصیبت آتی ہے تو یہی طبقہ اس کا نشانہ بنتا ہے تاک تاک کر وہ نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔

خدا کی نصرت کا استحقاق پیدا کریں

اللہ تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے، قیامت تک محفوظ رکھے، دل سے کہتا ہوں، خدانخواستہ کوئی برا وقت آیا تو آپ کا یہ سرمایہ دھن دولت کام نہ آئے گی۔ یہ پنجاب میں کام نہیں آیا، جبل پور اور جمشید پور میں کام نہیں آیا، رڑکیلا کے فساد کے کچھ دن بعد میں نے جا کر دیکھا وہاں مسلمانوں میں بڑے بڑے ٹھکیدار تھے، جن کے لاکھوں روپے کے ٹھیکے تھے، معلوم ہوا کہ فسادیوں نے ان کے روپیوں پر ہاتھ صاف کیا، سب سے پہلے ان کی جلی ہوئی موٹریں میں نے دیکھیں، ان کے بنگلوں کے سامنے ان کی جلی ہوئی کوٹھیاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں جھونپڑیوں میں رہنے والے یہ غریب تو بچ جائیں گے، ان کو مار کر کے کوئی کیا لے گا، کسی کا کیا بھرے گا، مجھے ڈر ہے آپ لوگوں کا، اگر ملت مضبوط نہیں ہے، اگر ملت کے مسائل حل نہیں ہوتے، ملت کے ادارے ٹھیک سے نہیں چلتے، آپ نے مسلمانوں کو اپنے سینے سے نہیں لگایا اگر آپ نے مسلمانوں کو ہمدرد نہیں بنایا تو وہ آپ کے کس طرح شریک ہو سکتے اور آپ کے ساتھ ہمدردی کیسے کر سکتے ہیں، آپ نے ان کے دلوں کو نہیں جیتا تو وہ آپ سے کیسے محبت کرتے دیکھیے آپ کی حفاظت کرنے والی پولیس نہیں ہے، آپ کی حفاظت کرنے والے ہوم گارڈ نہیں ہیں، آپ کی حفاظت کرنے والی فوج نہیں ہے، ان تینوں نے مل کر رانچی کے مسلمانوں کو قتل کیا، اور

انہوں نے ہی وہاں فساد کردایا، اور کیا آپ کی حفاظت کرنے والا آپ کا خدا ہے، آپ کی حفاظت کرنے والا آپ کے اعمال ہیں، آپ کی حفاظت کرنے والا آپ کا جذبہ ایثار ہے آپ کی حفاظت کرنے والی وہ دولت ہے حلال کمائی کی جو آپ پھیلا دیں اپنا فدائی بنالیں اپنے اندر خدا کی نصرت کا استحقاق پیدا کرلیں تو آپ کی حفاظت ہوگی۔

زخمی دلوں پر مرہم رکھیے!

میرے دوستو! میں آپ کا مہمان ہوں مجھے اتنی تیز تقریر نہیں کرنی چاہیے مگر میں کیا کروں، میں تو آپ کی ہمدردی اور محبت میں یہ باتیں کہہ رہا ہوں، اس بات کو میں آپ سے ہمدردی سمجھتا ہوں، آپ اپنی حفاظت کا سامان کیجئے، آپ کی دکانیں، فرمیں، یہ بینک کے حسابات یہ سب سے زیادہ کمزور چیزیں ہیں، دنیا پہلے تو انہیں چیزوں پر آنا چاہتی ہے، سب سے پہلے زکوٰۃ نکالئے، پھر سوچئے، خیرات کیجئے، لوگوں کے ساتھ ہمدردی کیجئے، لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھیے تاکہ ان کی دعائیں آپ کے شریک حال رہیں، کسی نے سلطان نورالدین زنگیؒ سے کہا آپ تو اپنی دولت اتنی زیادہ غریبوں پر خرچ کرتے ہیں، جب لڑائی ہوگی تو یہ چیز کس کام آئے گی؟ سلطان نے کہا " بھائی! کام تو انہیں لوگوں کی دعاؤں سے ہوگا اور مجھے تو انہیں کی دعاؤں کا آسرا ہے ان کی دعاؤں سے دشمنوں کے کلیجے چھلنی ہوجائیں گے" چنانچہ ایسا ہی ہوا، ان لوگوں کی دعاؤں سے نورالدین کو فتح نصیب ہوئی، میں آپ سے سچ سچ کہتا ہوں میں چلا جاؤں گا یہاں سے اور خدا کے فضل سے کسی ادارے کے لئے چندہ لینے نہیں آیا ہوں اور یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ انشاءاللہ آئندہ بھی اس کے لئے نہیں آؤں گا اس مسئلہ کے لئے مسلمانوں کے لئے اور اپنے لئے آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ خدارا اپنے آپ کو پہچانئے!

ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی تو اگر میرا نہ بنتا نہ بن اپنا تو بن

حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اپنے مسائل کو حل کرو، اپنے اداروں کو چلاؤ، اپنے اوقات کو اللہ کی راہ میں نکالو، اپنی جان کا اپنے کو مالک نہ سمجھو، خدا کو مالک سمجھو، خدا کے دین کا حصہ سب میں غالب رکھو، خدا کی راہ میں نکلو، خدا کی راہ میں خرچ کرو اور خدا کی راہ میں تکلیف اٹھاؤ، انشاء اللہ پھولو گے پھلو گے اور تمہارا علاقہ بھی انشاء اللہ محفوظ رہے گا۔ یہ میں اس لئے نہیں کہتا کہ مجھے کوئی کمیشن ملے گا، کوئی کمیشن میرے اور منیری صاحب کے درمیان یا جامعہ والوں کے درمیان طے نہیں ہوا میں اس لئے کہتا ہوں کہ میں نے تاریخ پڑھی ہے، میں نے قرآن شریف پڑھا ہے، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے، حفاظت صرف خدا کی حفاظت ہے، اور اس سے بڑھ کر قرآن شریف کہتا ہے کہ اچھے اعمال سے حفاظت ہوتی ہے ''ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم'' اگر تم خدا کی مدد کرتے ہو تو خدا تمہاری مدد کرے گا، خدا ہی تمہارا بہترین انشورنش ہے ان انشورنش کمپنیوں کی کیا حقیقت ہے کہ ان پر انشورنش کریں، خدا کے یہاں اپنی فرموں کا، اپنی جانوں کا، اپنی اولاد کا، اپنے مال کا، اپنی عزت کا انشورنش بنا دیجئے اور خدا کے یہاں مال کا انشورنش کیسے ہوتا ہے اپنے مال کو قیمتی بنا دیجئے تا کہ کوئی ہاتھ نہ ڈال سکتے، اپنی جان کو قیمتی بنا دیجئے اور قیمت کیسے پیدا ہوتی ہے، خدا کے دین کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے، خدا سے تعلق پیدا کر لیجئے، جو ہاتھ بھی آپ کے خلاف بڑھے گا وہ کاٹ کر رکھ دیا جائے گا، آپ دیکھئے بادشاہ کی کسی چیز پر کوئی ہاتھ اٹھائے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے، یہ ساٹھ ستر روپے کا سپاہی وہ پولیس جو کھڑا ہے اس کو ذرا چھیڑ کر کے دیکھئے کیا ہوگا، سرکار مشتعل ہو جائے گی آپ کے لئے اس کا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا، یہ ڈاکیہ یہ پوسٹ مین جو آتا ہے اس کی تنخواہ ہی کیا ہے، آپ میں سے ہر ایک ایسے دس پانچ ملازم رکھ سکتے ہیں اپنی دوکان میں، اس

کا کپڑا اپھاڑ لیجئے ،اس کی تھیلی چھین لیجئے پھر دیکھئے کیا ہوگا، یہ آن گونمنٹ ڈیوٹی ہے،آپ بھی آن گونمنٹ سروس مین بن جایئے،آپ بھی اللہ کے فرض میں لگ جایئے ،اس کی خدمت میں لگ جایئے،اس کے دین کی خدمت میں لگ جایئے،ایک زمانہ تھا کہ کسی خط پر(آن ہز میجسٹی سروس) لکھا ہوتا تھا تو یہ خط بڑا معزز ہوتا تھا جس میں یہ جملہ (ON HIS MEJESTY'S SERVICE) لکھا ہوتا تھا تو یہ (HIS MEJESTYS) آپ کیلئے کیا ہے،خدا کے سوا کون اس کا مستحق ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

آپ شہنشاہِ مطلق اس مالک الملک کی خدمت میں لگ جائیں گے تو دیکھیئے آپ کی جان ومال سب کا تحفظ ہو جائے گا اگر عزت چاہتے ہو اگر دولت چاہتے ہو تو اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں، یہ راستہ مسلمانوں کو اس نے بتایا ہے جس کو مسلمانوں سے بے حد محبت تھی، ہر چیز سے زیادہ محبت تھی ،یعنی رسول اللہ ﷺ کی محبت۔

جان ومال کی قربانی سے ملت کی حفاظت

بس راستہ دو چیزوں پر منحصر ہے،مال کا ایثار اور جان کا ایثار، جان دینے کی ضرورت نہیں، اپنے اوقات لگاؤ،تبلیغ کرو،خدا کے راستہ میں پھرو،اپنے اصول کی زندگی سے اترو، کچھ تکلیف اٹھاؤ، کچھ جفاکشی کا راستہ اختیار کرو اور ملت کے جو مسائل ہیں ان مسائل کو حل کرنے میں ہاتھ بٹاؤ، جامعہ اسلامیہ کا تنا بڑا منصوبہ ہے، دس ہزار فلاں نے دیا، پانچ ہزار فلاں خاتون نے دیا، یہ ہزار دس ہزار کا کیا اعلان، اس وقت تک ایک لاکھ کا اعلان ہونا چاہئے تھا، یہ جامعہ جب بن جائے گا آپ رہیں یا نہ رہیں جامعہ رہے گا آپ کے بچے وہاں پڑھیں گے وہاں اسلام کے لئے نظام بن رہا ہے، یہ قلعہ اسلام کا قلعہ بن

رہا ہے، وہ قلعہ آپ سب کی حفاظت کرے گا۔

زمانہ کی نبض کو پہچانیئے

میرے دوستو! اور بھائیو! اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرو، خدا کے غصہ کو کھینچنے والی خواہ وہ حرام شئے ہو، خواہ وہ حرام مشاغل ہوں ان سب کو چھوڑو، توبہ کرو، یہ بغاوت کی زندگی ختم کرو، وفاداری اور فرماں برداری کی زندگی شروع کرو، انصاف پسندی پر عمل کرو، پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یہ کشمکش کی زندگی چھوڑ دو اور ایک مسلمان کی زندگی اختیار کرلو، یہ دنیا فانی ہے، یہ دنیا محدود ہے، ہزاروں لوگ لگے ہوئے ہیں اس دنیا کو، آخرت کو یاد رکھو، موت کو یاد کرو، قبر کو ایک حقیقی منزل سمجھو، اپنے سفر کی پہلی منزل اور حقیقی منزل سمجھو اس کی تیاری کرو اور روزانہ استغفار کی کثرت کرو یہ جو عذاب آرہے ہیں، جو مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہو رہی ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ وہ استغفار کی کثرت کریں، ایثار سے کام لیں، اپنے پیسے کو اپنی خواہشات کے پیچھے صرف نہ کریں بلکہ خدا اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے اور ملت کے کاموں میں صرف کریں، ان کے دل کی دعائیں حاصل کریں، نمازوں کی پابندی کریں، قرآن شریف کو دیکھیں کہ اس میں کیا لکھا ہے کیا حکم ہے، اس کو اختیا کریں، دین کا ضروری علم حاصل کریں اللہ سے لو لگائیں اور جہاں تک ہو سکے پاکبازی تقویٰ کی زندگی اور خدا ترسی اختیار کریں، اگر مسلمان تقویٰ کی زندگی اختیار کریں گے تو آسمان سے اللہ کی رحمتوں کی بارشیں ہوں گی، وہ بارشیں نہیں جو آپ کو پریشان کردیں، یہ وقت بے وقت کی بارشیں، یہ ہمارے اعمال کی سزائیں ہیں، اس کا ایک ایک قطرہ ہمارے اعمال کی سزا ہے، دوستو! میں یہی سچی بات آپ سے کہتا ہوں میں نے آپ کو قصے نہیں سنائے، قصے بہت کچھ سنا سکتا تھا، اشعار پڑھ سکتا تھا، آپ لوگوں کو خوش کرسکتا تھا لیکن میں نے قصداً ایسا نہیں

کیا، یادرکھیے کہ اگر ہندوستان میں تم کو عزت کی زندگی گذارنا ہے ایمان کی زندگی گذارنا ہے اور اپنی نسلوں کو آئندہ ہندوستان میں مسلمان رکھنا ہے اور آزادی کے ساتھ خدا کا نام لینا ہے اور اسلام کا کام کرنا ہے تو ایثار کرنا پڑے گا، خلاف شرع کاروبار اور دین کے کام کے لئے چار پیسے!! جان لو اس طرح کسی کو عزت نہیں مل سکتی اس طرح خدا کی رحمت سے خدانخواستہ آپ محروم ہوں گے...... پارسیوں کو جو عزت حاصل ہے وہ ٹاٹا اور ڈالیا سے نہیں ملی، ان لوگوں کی ہمت اور ارادے کی بلندی اور مضبوطی سے ملی اور یہ روئی کی بنی ہوئی قوم جو کوئی صدمہ کوئی چوٹ برداشت نہ کر سکے، کوئی سخت سست بات سن نہ سکے، یہ قوم کیا اس ملک میں عزت پا سکتی ہے؟ بالکل نہیں پا سکتی، خالی نمائشی باتوں سے عزت نہیں ملا کرتی، ایسی دینی مجلسیں منعقد کر دینے سے اور کچھ یتیم خانے قائم کر دینے سے عزت نہیں ملتی، عزیزو! ملت کے تقاضوں کو سمجھو! زمانہ تم سے کس بات کو چاہتا ہے، ہندوستان کا رنگ کیا ہے اور کیا اشارہ کر رہا ہے، زمانہ کس طرف اشارہ کر رہا ہے، زمانہ کی نبض کو پہچانو، جہاں ایثار کی ضرورت ہو وہاں ایثار کرو، جہاں وقت کی ضرورت ہے وہاں وقت کی قربانی کرو، جہاں جم جانے کی ضرورت ہے وہاں جم جاؤ، جہاں جس طرح دینے کی ضرورت ہے وہاں اسی طرح دے جاؤ، یہ نہیں کہ جمنے کی جگہ پر نرم ہو گئے اور نرم ہونے کی جگہ پر جم گئے، لوہا بن گئے، ملت کی جو قیادت وجود میں آئے تم اس کی بات کو مانو، تم اس کے ساتھ تعاون کرو، پھر دیکھو تمہارا مقام ہندوستان میں محفوظ ہے۔

عزت کے ساتھ جینے کا راستہ کیا ہے

اے بھٹکل کے باشندو! اے نوائط قوم کے چشم و چراغ تمہارے بزرگ یہاں کے لوگوں کے پاس اسلام کا پیغام لے کر آئے وہ تو بتیس دانتوں میں ایک زبان کی حیثیت رکھتے تھے، کوئی ان کا ساز وسامان نہیں تھا، کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہیں تھا اور ان کا کوئی

دوست نہیں تھا لیکن ان کی باتوں کا وزن تھا، اور تم ہو اور اتنی بڑی تمہاری تعداد ہے لیکن تمہارا کوئی وزن نہیں ہے، تم یہاں قریب قریب پچاس فیصد ہو، یہاں تمہاری کتنی تعلیم گاہیں ہونی چاہئے تھیں، تمہارا یہاں تہذیب کا قلعہ ہونا چاہئے تھا، روشنی کا ایک مینار ہونا چاہئے تھا، وہ اس سے بھی بہت زیادہ دور سے نظر آتا جو کہا جاتا کہ یہاں روشنی کا مینارہ ہے، اللہ نے تم کو بہت کچھ دیا ہے، میں نے تم کو کالی کٹ میں دیکھا ہے، میں تم سے ناواقف نہیں ہوں، میں نے تم کو مدراس میں دیکھا ہے اور میں نے تمہارے متعلق کولمبو میں بھی سنا ہے اور ایسی ایک کاروباری قوم اور ملت کے مسائل کو حل کر کے نہ رکھ سکے، کوئی عقل اس بات کو مان نہیں سکتی جو اتنا بڑا اس کا کوئی ملی ادارہ اور ملی مسئلہ ادھورا پڑا ہوا ہے، کیا بات ہے، کیا راز ہے اس کا، ایک دن میں یہ مسئلہ حل ہو جانا چاہیے، تمہارا نام یہاں ایک ضرب المثل ہونا چاہئے تمہاری قومی زبان نوایطی زبان میں لٹریچر ہونا چاہیے، واقعی جامعہ اسلامیہ ایک ایسا مرکزی ادارہ ہوتا جو دکن میں ایک بڑا ادارہ مانا جاتا، تمہارے یہاں سے تم سارے دکن کو برابر غذا پہنچاتے، مسلمانوں کے اداروں کو اور جگہ کے مسلمانوں کے اداروں کو تم سے غذا ملتی وہ تو میں کہتا نہیں، کم از کم اپنے ہی مقامی مسائل کو حل کرو اور مقامی ضروریات کو پورا کرو، یہاں ملت کا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرو، میں سمجھتا ہوں آپ میری بات کو سمجھ گئے ہوں گے، ہمارا دماغ، ہمارا علم ہم کو غلط رہنمائی دے سکتا ہے، ہم کو دھوکا دے سکتا ہے لیکن خدا کے پیغمبر ہم کو دھوکا نہیں دے سکتے، وہ تو ہم کو جینے اور عزت پانے کا راستہ بتاتے ہیں اگر اس راستہ میں چلو گے تو عزت پاؤ گے، پھلو گے، پھولو گے، تمہارا نام روشن رہے گا، تمہارے خلاف آنکھ اٹھا کر بھی کوئی دیکھ نہ سکے گا جو آنکھ اٹھا کر دیکھے گا تو وہ آنکھ نکال دی جائے گی جو انگلی تمہاری طرف اٹھے گی وہ قلم کر دی جائے گی اور تم خدا کی مسلسل حفاظت میں رہو گے، ہاں اگر من مانی زندگی گذارو گے نفس کے غلام ہو گے، محض اپنی اولاد کو دیکھو گے اور کسی کو نہیں دیکھو گے، محض

اپنی دکانوں اور فرموں کو دیکھو گے، جب ایسی حالت ہوگی، یاد رکھو خدا کے یہاں تمہاری دوکوڑی کی بھی قیمت نہیں ہوگی، ایک لہر تمہاری چیزوں کو بہا کر لے جائے گی، پتہ نہیں چلے گا کہ وہ سب کہاں چلا گیا، پیسہ تم کو بچا نہیں سکتا، دولت تم کو بچا نہیں سکتی، تم کو اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو اللہ سے وفاداری ہے اور ایثار و قربانی ہے، میں تو کہہ کر چلا جاؤں گا مگر تم میں سے ہر شخص کے دل میں یہ بات امانت ہے وہ تمہارے دل کے اندر رہے گی، تمہارے حافظے کے اندر رہے گی، خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آجائے گا جب کہ تمہارے دل و دماغ پکار کر کہیں گے کہ کہنے والے کسی نے کہا تھا کہ نہیں۔

میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کرے، اللہ تعالیٰ آپ کی عزت رکھے، آپ کو ترقی دے، ہر خطرے سے ہر بری نظر سے محفوظ رکھے، میں صرف یہی کہوں گا کہ بچاؤ کا راستہ صرف پیغمبروں کا بتایا ہوا راستہ ہے ایثار کرو، مال خیرات کرو، ایثار کے ذریعہ اوقات کے ذریعہ اللہ کو خوش کرو، اللہ کے دین کی مدد کرو، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

پیام راہ

دوسری دفعہ بھٹکل آمد کے موقع پر اساتذہ وطلباء اور منتظمین جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے حضرت مولانا قدس سرہ کا خصوصی خطاب جو ہر مدرسے اور دینی ادارے سے تعلق رکھنے والے فرد کے لئے پیام راہ کی حیثیت رکھتا ہے

علم کا بھی ایک قانون ہے

نحمده ونصلى على رسوله الكريم. اما بعد!

صحیح راہ کی ضرورت

میرے عزیزو اور بھائیو! آپ کو شاید معلوم ہو یا نہ معلوم ہو جو لوگ تفسیر پڑھتے ہیں اور ان کی تفسیر کی کتاب شروع ہو چکی ہے یا کم سے کم سورہ بقرہ اور اس کا ترجمہ وتفسیر انہوں نے پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت میں جو لوگ حج کو نکلتے تھے ان کا ایک عرف اور ضابطہ یہ بن گیا تھا جو خود ساختہ تھا شریعت میں نہیں تھا لیکن انہوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی تھی کہ جب تک کہ حج سے فارغ نہ ہوں حج کے ارکان میں مشغول ہوں اور اس دوران اگر ضرورت ہو گھر آنے کی کوئی بات کہنے کی تو گھر کے دروازے سے نہ آئیں کہ ابھی تو اللہ کے گھر سے ہو کر نہیں آئے تو اپنے گھر میں قاعدے سے کیسے داخل ہوں تو چھتوں پر سے یا دیواروں کی طرف سے من ظهورها پشت سے وہ گھر میں آیا کرتے تھے اور اس کو وہ بڑی نیکی کا کام سمجھتے تھے کہ اس میں بیت اللہ کا ادب واحترام ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" ليس البر ان تأتوا البيوت من ظهورها" یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ، ولكن البر من اتقى وأتوا البيوت من ابوابها ،گھروں میں گھروں کے دروازوں سے آؤ، یہی قاعدہ ہے اور یہی عقل سلیم اور ذوق سلیم کی بات ہے اور قانون قدرت ہے کہ جس چیز

کا جو مدخل ہے اس سے آدمی آئے، قرآن مجید تو پوری زندگی کی کتاب اور پوری زندگی کے لئے کتاب ہدایت ہے ہر طبقہ کے لئے ہر مشغلہ ہر میدان اور ہر مرحلہ کے لئے وہ ایک دستور العمل اور ایک ہدایت نامہ کا کام دیتا ہے قرآن کے یہ دو لفظ بڑے اہم ہیں" وأتوا البيوت من أبوابها" یہ پوری زندگی پر حاوی ہے اس میں پوری زندگی کی حکمت بتادی گئی یہ صرف گھر کا معاملہ نہیں ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ جو اس کا دروازہ ہے اس دروازہ سے آنا چاہئے اگر کوئی شخص پیشہ سیکھنا چاہے کوئی صنعت سیکھنا چاہے لیکن صنعت کے استاذوں سے نہ سیکھے اور صنعت کے آداب کا خیال نہ کرے اور صنعت کے اوزار مہیا نہ کرے اور تدریج کے ساتھ (STEP BY STEP) درجہ بدرجہ مرحلہ وار اس کو نہ سیکھے اور یہاں تک کہ ان کی وردی استعمال نہ کرے، لوہاروں کی ایک وردی ہے اور سقاؤوں کی ایک وردی ہے سپاہیوں کی ایک وردی ہے اور ڈاکٹروں کی ایک وردی ہے تو وہ وردی تک بعض اوقات ضروری ہوتی ہے ورنہ وہ اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہوگا اس کو پیشہ نہیں آئے گا فن نہیں آئے گا تو جب یہ معمولی چیزوں کا حال ہے اگر کوئی کہتا ہے کہ فضول باتیں ہیں ہمیں لوہاری کا فن سیکھنا ہے یا ہمیں فوج میں بھرتی ہونا ہے لیکن وردی کا جھگڑا ہم مول نہیں لیتے یہ پہنو وہ نہ پہنو اور صاحب لیفٹ رائٹ LEFT,RIGHT فضول بات ہے ہم اپنی ذہانت سے کام لیں گے ہم دوسرا طرز ایجاد کریں گے وہ یوں ہی رہ جائیگا اچھا سپاہی بن نہیں سکتا ایسے ہی لوہار نہیں بن سکتا نجار (کارپینٹر) نہیں بن سکتا اس کے لئے بھی "وأتوا البيوت من ابوابها" ضرورت ہے جو اس کا دروازہ ہے ادھر ہی سے آؤ۔

یہ وأتوا البيوت من ابوابها ساری زندگی دین و دنیا سب پر حاوی ہے کہ اللہ نے اور فطرت انسانی نے، فطرت سلیم نے سالوں سال کے تجربہ سے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جو اس کے مداخل اور مخارج ہیں اگر کوئی شخص اس کا پابند نہ ہو ان کا کوئی احترام نہ کرے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔ ایک شخص کہے کہ حروف تہجی کا جھگڑا عجیب ہے، ا، ب، ت، کا کون جھگڑا مول لے کہ پہلے الف ب ت پڑھے، ہم براہ راست پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ کتنا ہی ذہین ہو کبھی اس کو پڑھنا نہیں آئے گا جو اب، ت، نہیں پہچانتا یا (A.B.C.D) نہیں پہچانتا وہ کبھی ایک سیکنڈ نہیں بول سکتا

آپ کسی وقت بھی تجربہ کر کے دیکھئے کہ آپ کے زمانے کا کوئی بقراط سقراط ہو جو پڑھا ہوا نہ ہو خواندہ نہ ہو، آپ اس کو ایک کتاب دیجئے اردو کی دیجئے یا انگریزی کی دیجئے یا عربی کی دیجئے یا یہیں کی کنٹر زبان کی دے دیجئے اور کہئے کہ رات بھر نہیں آپ کو ایک مہینہ کی مہلت دی جاتی ہے آپ کے پاس کوئی دوسرا آدمی نہیں جائے گا، یہ کتاب ہے اور آپ ہیں، ہم آپ کو کمرے میں بند کر دیتے ہیں تالہ لگا دیتے ہیں کھانے پینے کا سب سامان کھڑکی سے ہم پہونچاتے ہیں اور وہاں پہلے سے موجود اور زندگی کی سب ضروریات ہیں ایک مہینہ نہیں چھ مہینے آپ اس میں رہئے اور یہ صفحہ حل کر دیجئے اس صفحہ کو آپ پڑھ دیجئے اور اس نے حروف تہجی نہیں پڑھے تو آپ یقین مانئے کہ جب وہ نکلے گا تو ویسے ہی جاہل ہوگا جیسے وہ داخل ہوا تھا اس لئے کہ وأتوا البيوت من ابوابها، پر اس نے عمل نہیں کیا، حروف تہجی بڑے حقیر ہیں کیا حقیقت ہے، ا، ب، ت، بچوں کو پڑھایا جاتا ہے لیکن بڑے بڑے علامہ امام غزالیؒ، امام رازیؒ بھی محتاج تھے کہ پہلے حروف تہجی پڑھیں پھر احیاء علوم الدین اور تفسیر رازی تک پہنچیں وہ احیاء علوم اور تفسیر رازی تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے اگر انہوں نے حروف تہجی نہ پڑھے ہوتے، ایسے ہی ہر فن کا ہر علم کا ہر شعبہ کا ایک قانون ہے اس قانون پر چلنا ہوگا، یہ ہمارا علم اول تو مجرد علم ہے مجرد علم کا حال بھی یہی ہے کہ بہت سی چیزیں تو اس میں مشترک ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری دنیا الگ ہے ان کی دنیا الگ لیکن آپ دیکھیں گے تو زیادہ حصہ دنیاوی اور دینی تعلیم میں مشترک ہے مثلاً درجہ بدرجہ پڑھنا استاد سے پڑھنا محنت کرنا استاد کا احترام کرنا۔

یورپ میں استاد وشاگرد

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یورپ وغیرہ میں استادوں کا کوئی احترام کرنا نہیں جانتا یہ آپ یہاں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں پر قیاس نہ کیجئے گا یہ نہ مشرق کے ہیں اور نہ مغرب کے اور نہ دنیا کے اور نہ دین کے یہ تو کچھ نہیں یہ تو خودرو ہیں جنگلی درخت ہیں میں یورپ گیا ہوں میں نے وہاں کی یونیورسٹیاں دیکھیں مجھے تو حیرت ہوگئی کہ میں کیمبرج آکسفورڈ گیا ضرورت کے لئے بتاتا ہوں آپ کو کہ وہاں معلوم ہوا کہ وہاں اب تک ٹیٹوریل سسٹ[illegible]ی ہے ایک استاد کو اتالیق بنا لینا جب آپ کسی آفس میں چلے جائیں

اور آپ داخلہ کرائیں بی اے اور ایم اے میں تو آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کس استاذ کا انتخاب کرتے ہیں آپ کا مشیر کون ہوگا تو بتانا پڑتا ہے کہ فلاں استاد فلاں پروفیسر کی نگرانی میں اور اس کے مشورہ سے علم حاصل کرنا ہے، پھر اس پروفیسر سے بالکل ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسے مرید و پیر کا تعلق ہے یعنی طالب علم اس کے مشورے سے کتابیں پڑھتا ہے کتابیں پڑھ کر نوٹس (NOTES) اس کو دکھاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ طالب علم کتاب کی صحیح اہمیت سمجھتا ہے اور اسکا جو اصل مغز لب لباب ہے اس کو لے رہا ہے پھر اس کے بعد مضمون اس کو تیار کرنا پڑتا ہے وہ بالکل اس سے ایسا وابستہ ہو جاتا ہے جیسے پہلے ہمارے مدارس میں تھا کہ ہر استاد کے ساتھ چند طلباء ہوتے تھے کہ جو بالکل مربوط ہو جاتے تھے اساتذہ سے۔

اور شعراء تک کا یہ حال تھا کہ ان کے راویہ ہوتے تھے چنانچہ تاریخ ادب میں آتا ہے کہ فلاں فلاں کا راویہ تھا یعنی اس کے اشعار کو اخذ کرنے والا یاد کر لینے والا سنانے والا اس کے ساتھ ساتھ شامل کر لیتے تھے کہ یہ میرا راویہ ہے، میں نہیں قصیدہ سناؤں گا اس سے سن لو، ویسے ہی ہمارے زمانہ تک طالب علم تقسیم ہو جاتے تھے استادوں میں، چار طالب علم ایک استاد کے ساتھ لگ گئے ہیں خادم بھی ہیں وہ اس کی خدمت بھی کر رہے ہیں چائے بنانی ہو تو چائے بنائیں گے اس کے آرام کا خیال کریں گے بازار سے اس کی چیزیں لائیں گے اور ہمارے یہاں تو یہ بھی تھا کہ اس کا حساب کتاب بھی دے دیں گے وہ جو اس کے بعد جو کچھ لکھوائے گا اس کو لکھیں گے وہ جو مواد نکلوائے گا اس کو نکالیں، ہم سب لوگوں نے ایسا ہی پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ سسٹم آج تک وہاں کی اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیوں میں رائج ہے اس کے بغیر وہ طالب علموں کو گویا قبول نہیں کرتے پہلے بتانا پڑتا ہے کہ تمہارا ٹیوٹر کون ہے یعنی تمہارا خاص استاد کون ہے جس کے ساتھ تم وابستہ ہو گے اور اس کے مشوروں پر چلو گے یہی ہمارے علم کا حال ہے۔

علم دین کا امتیاز

کچھ چیزیں تو مشترک ہیں لیکن پھر اس کے بعد ایک سرحد ایسی آتی ہے ایک ایسی

لکیر آتی ہے جہاں سے ہماری سرحد الگ ہوجاتی ہے وہ کیا مثلاً اللہ کی رضا کی طلب ہو اخلاص ہو دعا ہو خدا سے کہ اے اللہ ہم سے تو جو محنت ہو سکتی ہے ہم کریں گے اصل تو دینے والا ہے علم کا۔

حضرت امام شافعیؒ کا شعر یاد کیجئے:

شکوت الی وکیع سوء حفظی　　فأوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم نور من الھی　　ونور اللہ لا یعطی لعاصی

میں نے اپنے استاد وکیع سے شکایت کی میرا حافظہ کمزور ہے انہوں نے کہا کہ گناہوں سے اجتناب کرو بہت زیادہ گناہوں سے دور رہو اس لئے کہ علم جو اللہ کا نور ہے، اللہ کا نور نافرمان کو نہیں دیا جاتا۔ یہاں سے ہماری سرحد الگ ہوجاتی ہے، وہ سینما جائیں اور کسی اخلاقی کمزوری یا کسی بے راہ روی کے شکار ہوجائیں تو بھی فرق نہیں پڑتا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ فرق پڑتا ہے، لیکن خیر مان لیا نہیں فرق پڑتا ویسے ہی وہ فرسٹ ڈویزن سے پاس ہوجائیں گے فرسٹ آئیں گے نوکری مل جائے گی لیکن فرق اس میں بھی پڑتا ہے مگر مان لیجئے کہ نہیں فرق پڑتا لیکن ہمارے یہاں تو کھلا ہوا فرق ہے کہ وہ شخص جو استاد کا ادب کرتا ہے اس کی دعائیں لیتا ہے اور اس کے ساتھ بالکل گویا بندھ جاتا ہے اس کا گویا ملازم ہو، آپ تاریخ میں پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات ایک ہی آدمی ایک استاد کے ساتھ مخصوص ہوگیا وہ بس بالکل اس کا ثنی بن گیا اور بالکل اس کے علم کو ایسا جذب کرگیا جیسے اسٹیج ہوتا ہے وہ پی لیتا ہے اس طرح پی لیا اس کے علم کو پھر نچوڑ دیا اپنے شاگردوں میں۔

علم کے آداب

تو عزیزو! یہ ہمارا علم جو ہے جس علم کے طالب علم ہیں اس کے لئے یہ جامعہ قائم کیا گیا ہے یہ علم خاص آداب رکھتا ہے، یہ پہلوانی کا علم نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ کون ہوتا ہے استاد، کیا کتابوں کا ادب، کیا پرانی دقیانوسی باتیں کرتے ہو، اللہ نے ہمیں ذہن دیا ہے حافظہ دیا ہے، محنت صحت ہماری اچھی ہے، ہم سب کرکے دکھادیں گے نہیں ایسا نہیں بعض لوگ کم صلاحیت کے ساتھ ایسے کامیاب ہوگئے ہیں کہ دنیا میں ان

کاڈ نکا ج گیا مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ایک صاحب تھے انہوں نے غلط لائن اختیا کی تھی اور کالج میں پڑھاتے تھے ان کی ذہانت اور معقولات میں ان کی دسترس مسلم تھی یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال بھی ان کو مانتے تھے لیکن جو فیض ان سے پہنچنا چاہئے تھا جو علوم وسنت کا اجراء ان سے ہونا چاہئے تھا وہ لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی کہنے لگے کہ مولوی حسین احمد مدنی تو ہمارے ساتھ تھے تو ان کا شمار غبی طالب علموں میں تھا وہ کچھ وہاں نمایاں نہ تھے یہ بڑے نمایاں تھے ان سے کیا فیض پہنچا ذہانت کے باوجود...... ایسے ہی ایک صاحب کہنے لگے ارے مولوی الیاس تو جب دیکھو نفلیں پڑھتے تھے، پڑھنے کے زمانے میں نفلیں پڑھتے تھے مولوی الیاس صاحب نے کیا کر دکھلایا، دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، یہاں تک کہ امریکہ اور افریقہ میں بھی ان کی دعوت مقبول ہوئی تو بھائی بڑے تجربے کی بات بتاتا ہوں تھوڑی صلاحیت سے وہ طریقہ اختیار کرکے ’’وأتوا البیوت من ابوابھا ‘‘ پر عمل کر کے آدمی وہاں پہنچ سکتا ہے جہاں وہ لوگ جن کو اپنی ذہانت پر ناز ہے اور اپنے قوت مطالعہ پر اور محنت پر وہ نہیں پہنچ سکتے ان کے پڑھنے پڑھانے میں برکت نہیں ہوگی کہ لوگوں کو نفع پہنچے علم کے ساتھ سنتوں کا اجرا ہو، بدعات کا محو ہو، معصیتوں سے نفرت پیدا ہو، طاعت میں رغبت پیدا ہو، نور آئے، یہ بات پیدا نہیں ہوگی، یہ بات جب پیدا ہوگی کہ آدمی اس طریقہ پر عمل کرے جو استاد بتائے ایک صاحب تھے بہت بڑے علامہ، شام کے علامہ بیطار، کہنے لگے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ اپنے استاد کے پاس نہیں جا سکے بڑی سخت سردی تھی سردی شام میں ہوتی ہے برف پڑتی ہے کہنے لگے ہم مجبور ہو گئے، دوسرے وقت گئے تو کہنے لگے کیوں نہیں آئے، ہم نے کہا سردی بہت تھی اوپر سے ایک گھڑا پانی اور ڈال دیا، کہنے لگے کہ یہ سردی ہے کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے برداشت کیا اور کوئی شکایت نہیں کی اور پھر جانے لگے اب وہ علامہ بیطار بن گئے، انہوں نے خود سنایا یا ایسے ہی ایک صاحب نے ان کے ہم عصروں میں سے سنایا، تو یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ استاد خدمت بھی لیتے تھے اور پڑھاتے بھی تھے اور پھر استاد استاد ہی نہیں ہوتا تھا ایک طرح کا پیر ہوتا تھا اس کے پاس رہتے کہ نماز کیسے پڑھتا ہے کیا خشوع وخضوع ہے سنتوں

کا کہاں تک اہتمام کرتا ہے، مسجد آتا ہے تو پہلا قدم کونسا رکھتا ہے، نکلتا ہے تو کون سا قدم نکالتا ہے یہ باتیں بھی سیکھتے تھے استادوں سے، اور اب یہ باتیں کم ہو گئیں۔

قحط الرجال کا دور

آج دیکھئے کوئی غیر معمولی شخص کوئی سطح سے بلند کوئی علامہ کوئی کوہ قامت کوہ پیکر ایسی کوئی ہستی نہیں پیدا ہو رہی ہے، اس وقت کوئی امام مزنیؒ امام نوویؒ، شیخ الاسلام ابن عبدالسلامؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نہیں بن سکتا، تو کوئی حافظ ابن حجر ھیثمیؒ بن جائے ان جیسا ان سے دوسرے تیسرے نمبر کا ادیب بنے لیکن نہیں بن رہے ہیں لوگ یہاں سے مصر تک اور اب تو مصر بھی خالی ہے، اس زمانہ میں ازہر بڑے لوگ پیدا کرتا تھا بڑے فاضل لوگ راسخ العلم لوگ پیدا کرتا تھا وہاں بھی خزاں کا دور آ گیا اور سیاسی اغراض اور سیاسی مقاصد نے اس کو بالکل بے اثر کر کے رکھ دیا ہے اور وہاں بھی لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور ہر ملک میں یہ احساس کیا جا رہا ہے کہ اب اس پایہ کے عالم پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور ہر ملک میں یہ احساس کیا جا رہا ہے کہ اب اس پایہ کے عالم پیدا نہیں ہو رہے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے درس کی پابندی، استاد کا احترام، مطالعہ کرنا، مطالعہ دیکھے بغیر نہ پڑھنا اور مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے تھے کہ طالب علموں کا شعار یہ ہو گیا ہے نہ دیکھ کر پڑھنا نہ پڑھ کر دیکھنا، دیکھ کر پڑھنا یہ مطالعہ کر کے پڑھیں گے اور پڑھ کر کے اس کو رواں کریں دیکھیں بار بار پڑھیں بار بار پڑھیں دونوں چیزیں ختم ہو گئیں، بس چند باتیں ہیں لمبا قصہ نہیں ہے، اگر ان پر عمل کیا جائے تو آج بھی اللہ کا قانون یہی ہے جو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے تھا، الحمد للہ اب بھی ذہین لوگ پیدا ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کھانے کو تو دے رہا ہے پہلے لوگ کیا کھاتے اور اس سے کیا ذہانت ان کی ترقی کرتی تھی، بیچاروں کو ہفتوں مہینوں نہ گھی ملے نہ چکنائی ملے نہ فروٹ ملے نہ گوشت ملے، یہ سوکھی روٹی کھا کے انہوں نے اتنے بڑے کام کئے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، بعض بعض ایسے گذرے ہیں کہ کھڑے ہو گئے نان بائی کی دکان پر اور روٹی توے پر ڈالنے کی جو خوشبو ہوتی ہے اس سے طاقت حاصل کی اور آ کر پھر پڑھنے لگے، بس وہی بات ہے کہ "وأتوا البيوت من ابوابها" کہ بیت علم میں باب علم سے داخل ہو، باب علم کیا ہے

وہی قواعد ضوابط پر چلنا احترام کرنا نظام کے ساتھ رہنا مطالعہ دیکھنا محنت کرنا اور بھائی اگر تم نے یہ کرلیا تو چمکو گے انشاءاللہ نام روشن کرو گے اپنے ملک کا بھی اور اپنی ملت کا بھی اور نہیں تو بس شدید ہو جائے گی مشکل سے کوئی مسئلہ بتا سکو گے کوئی کتاب پڑھا سکو گے یا علمی کام کرسکو گے، میں سمجھتا ہوں کہ بس یہ کافی ہے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ شرور و آفات سے بچائے اخلاص عطا فرمائے، اپنے کلام کا، حاملین کلام کا، اپنے سب کا احترام و ادب نصیب فرمائے۔ (آمین)

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

نعمت اسلام کی قدر اور اس پر شکر

۱۰/مارچ ۱۹۸۴ء بعد عصر بنگلہ دیش کی عظیم دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ پٹیہ (چاٹگام) میں ایک عظیم الشان مجمع سے خطاب جو جامعہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جمع ہوا تھا، اس خطاب سے سفر بنگلہ دیش کا آغاز ہوا۔

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لانبی بعدہٗ. امابعد!

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْدٌ O (سورہ ابراھیم۔۷)

میرے بھائیو، اور بنگلہ دیش کے عزیزو اور دوستو! میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے اپنی اس کوتاہی اور اس تقصیر کی معافی چاہتا ہوں کہ ہمارے پورے برصغیر کے (جو تین حصوں پر منقسم ہو گیا ہے، ایک ہندوستان ایک پاکستان ایک بنگلہ دیش) مسلمانوں کا سب سے بڑا خاندان اس سرزمین پر آباد تھا، اور میں آپ کے پاس بہت تاخیر سے حاضر ہوا، اس کو میں اپنی ایک بڑی کوتاہی سمجھتا ہوں اور اللہ کے اس مبارک گھر اور اس علمی

مرکز کی مسجد میں بیٹھ کر اللہ سے استغفار کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ میرے اس گناہ کو معاف فرمائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنی نسبت کرنے والی امت کا اتنا بڑا خاندان جو دنیا میں دوسرے نمبر کی مسلمان آبادی سمجھی جاتی ہے (انڈونیشیا کا پہلا درجہ ہے اور دوسرا درجہ بنگلہ دیش کا ہے) رسول اللہ ﷺ کے اتنے نام لینے والے، اللہ اور رسول کے اتنے ماننے والے، اللہ کے سامنے سجدہ کرنے والے، اور اسلام کا کلمہ پڑھنے والے موجود ہوں، اور عرصہ سے موجود ہوں، وہاں میں اتنی تاخیر سے آؤں۔

حضرات! میں نے آپ کے سامنے ایک آیت پڑھی اللہ فرماتا ہے:

واذ تاذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدیدO

اور جب تمہارے رب نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو یاد رکھو کہ میرا عذاب بھی سخت ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب دوسری قوموں کی کوئی بات دیکھتا ہے جس میں بڑی رونق ہوتی ہے، دھوم دھام ہوتی ہے، جی لگنے کا اور دلچسپی کا سامان ہوتا ہے، تو شیطان ایسے موقعہ پر حملہ کرتا ہے، اور مسلمانوں کے اندر لالچ پیدا کر دیتا ہے کہ ہمارے پاس بھی ایسی کوئی چیز ہوتی، دنیا کی کتنی قومیں ہیں جو عقیدۂ توحید اور اسلام کی نعمت سے محروم ہیں، وہ میلے ٹھیلے کرتی ہیں، کوئی درخت کو پوجتا ہے کوئی بتوں کے اور چڑھاوا چڑھاتا ہے، کھانے پکتے ہیں، جشن ہوتے ہیں، اور دلچسپی اور دل لگی کا سامان ہوتا ہے، بعض قومیں اس موقع پر بھسل گئیں اور شیطان کے حملہ کا شکار ہوگئیں، اور انہوں نے یہ کہنا شروع کیا (بعض نے اپنی زبانِ حال سے اور بعض نے اپنی زبان قال سے) کہ کاش ہمارے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی۔!

دنیا کی بیسیوں قوموں نے خدا کے سوبت بنائے، کسی نے قومیت کو بت بنالیا، کسی نے ملک کو بت بنالیا ہے، کسی نے زبان کو بت بنالیا ہے، کسی نے اپنے آباواجداد کی کہانیوں کو اور تاریخ کو بت بنالیا ہے، اور کسی نے رنگ ونسل کو بت بنالیا ہے، لیکن اللہ نے مسلمانوں کو ان

تمام بتوں سے محفوظ رکھا، ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم ہمیشہ اسلام پر فخر کریں اور اسلام کے سوا کسی چیز کو لالچ اور رشک کی نظر سے نہ دیکھیں کہ کاش ہم کو بھی یہ چیز ملتی۔

یہ ایسی لغزش کی فضا ہے کہ بعض قوموں کے منہ میں پانی بھر آیا ہے، جیسے کسی کو اچھی لذیذ چیز کھاتے دیکھ کر بھی منہ میں پانی بھر آتا ہے، اسی طرح بعض قوموں کی گمراہیوں کو دیکھ کر اچھے اچھوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک جلیل القدر پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کی صحبت وتربیت نصیب فرمائی تھی، ان کے قدم بھی لڑکھڑا گئے اور بت پرستی کے مظاہر دیکھ کر وہ سنبھل نہیں سکے اور انہوں نے تمنا کی کہ ہمیں بھی یہ چیز ملتی، سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وجوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لھم قالوا یموسی اجعل لنا الٰھا کما لھم الٰھة. قال انکم قوم تجھلون O ان ھٰؤلاء متبّر ماھم فیه وبطل ما کانوا یعملون O

(سورۃ الاعراف ۱۳۸۔ ۱۳۹)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتارا تو وہ ایسے لوگوں کے پاس جا پہنچے جو اپنے بتوں (کی عبادت) کے لئے بیٹھے رہتے تھے (بنی اسرائیل) کہنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام! جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں سب بیہودہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس قوم کی لغزش کا واقعہ بیان کیا ہے، جس کے متعلق خود فرماتا ہے:

یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانّی فضلتکم علی العٰلمین O (سورۃ البقرۃ ۴۷)

اے یعقوب کی اولاد! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے تھے اور یہ کہ میں

نے تم کو جہاں کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔

مفسرین و محققین کا کہنا ہے کہ بنی اسرائیل کو دنیا پر جو فضیلت حاصل تھی، وہ توحید کی بنا پر تھی، توحید ہمیشہ اسرائیل (یعقوبؑ) کی نسل میں رہی وہ اپنے زمانہ کی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ خدا پرست اور موحّد تھے، اس قوم کا یہ حال ہوا جو مصر میں کئی برس تک موسیٰ علیہ السلام کی تربیت میں رہی تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' **وجوزنا ببنی اسرائیل البحر** ''ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرایا)'' **فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لھم** ''(وہ ایسے لوگوں کے پاس سے ہو کر گذرے کہ جو اپنے بتوں کے سامنے جھکے ہوئے تھے) اور وہاں غالباً دکانیں لگی ہوں گی، کھانے پک رہے ہوں گے، گانے بجانے بھی ہو رہے ہوں گے، اور ایسے موقعوں پر یہ ہونا ضروری ہے، موسیٰ علیہ السلام نے اتنے دن تک جو سبق پڑھایا تھا وہ یکسر بھول گئے، وہ بولنے لگے ''**یٰموسیٰ اجعل لنا الٰھا کما لھم الٰھة**'' اے موسیٰ (یہ کتنی رونق کی چیز ہے) ہمارے لئے بھی کوئی ایسا خدا تجویز کر دیجئے جو آنکھوں سے نظر آتا ہو، ہم اسے چھو سکیں اور اس کے قسموں میں گر سکیں اور اپنے سامنے دیکھ سکیں،'' **الٰھا کما لھم الٰھة** ''ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود تجویز کیجئے جیسے مشرکین کے کئی معبود ہیں'' **قال انکم قومٌ تجھلون** ''موسیٰ علیہ السلام کو جلال آ گیا اور کہنے لگے کہ تم پرلے درجہ کے نالائق اور پرلے درجہ کے ناشکرے اور پرلے درجہ کے جاہل ہو، اتنے دنوں تک تم کو سکھایا پڑھایا اور تمہیں اس گندی زندگی سے نکالا تمہارے لئے اللہ کے یہاں سے منّ و سلویٰ اترا، اور تم کہتے ہو کہ ہمارے لئے ایسا جشن اور میلہ لائیے'' **ان ھؤلاء متبّر ماھم فیه** ''یہ سب برباد ہونے والے ہیں'' **وبطل ما کانوا یعملون** ''اور بت کچھ کام نہیں آئے گا سب ملیامیٹ ہو جائے گا یہ بڑی عبرت کی بات ہے، ہمارے اور آپ کے ڈرنے کی بات ہے، اللہ کے پیغمبر سیدنا موسیٰؑ کی تربیت میں جو قوم برسوں رہی وہ بھی پھسل گئی اور اس نے کہا کہ ہمارے لئے بھی آپ کوئی ایسا مجسم خدا کھڑا کیجئے جسے ہم دیکھ کر پرستش کریں۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ (اتنا بڑا تو نہیں) خود مسلمانوں کو پیش آیا کہ ایک درخت ذات

انواط تھا اس درخت پر لوگ اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے، قربانیاں کرتے تھے، اور ایک دن اس کے نیچے قیام کرتے تھے، صحاح کی روایت ہے کہ حضور ﷺ غزوۂ حنین پر جارہے تھے تو جو نئے مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے بھی ایسا درخت تجویز کردیجئے جہاں ہم آئیں بیٹھیں، میلہ کریں، بازار لگائیں، کھائیں پئیں، جانور ذبح کریں، آپ نے فرمایا کہ جو بات بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہی تھی وہی تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟ ''اجعل لنا الٰها کما لهم الهة'' اے مسلمانو! تم بھی اس قوم کے بالکل قدم بقدم چلو گے۔(۱)

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک لڑائی کے موقعہ پر ایک انصاری میں اور ایک مہاجر میں کچھ تکرار ہوگئی تو اس وقت انصاری نے چلا کر کہا'' یا للأنصار ''انصار کی دہائی ہے، اور مہاجر نے کہا'' یا للمهاجرین ''مہاجرین کی دہائی ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا''دعوها فانها منتنة''چھوڑو اس کو یہ ناپاک چیز ہے۔

تو میرے بھائیو اور دوستو! شیطان ہماری تاک میں ہے، وہ اپنے کام سے کبھی غافل نہیں ہوتا، وہ نئے نئے طریقہ پر پھسلایا کرتا ہے، کبھی کسی رنگ سے، کبھی کسی رنگ سے، وہ یہ جانتا ہے کہ یہ آدمی کس بات سے متاثر ہوگا، اس کو اس کام سے ہٹانے کے لئے کون سی بات زیادہ موثر ہوگی، وہ عالموں کے خاندان میں جائے گا تو وہ چوری کے لئے نہیں کہے گا کہ وہ جانتا ہے کہ کہیں عالموں کی اولاد اور بزرگوں کی اولاد چوری کرتی ہے؟ ان کو تکبر سکھلائے گا، آباء واجداد پر فخر کرنا بتائے گا، ایسے ہی اگر وہ تاجروں کے پاس جائے گا تو ان کو وہ ناپ تول میں کمی کرنے یا ناجائز طریقہ پر تجارت کرنے، نفع حاصل کرنے پر مائل کرے گا، ایسے ہی جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے دین کا بڑا ذخیرہ دیا ہے، علم کا، ذہانت کا، نسل کا، اسلامی اخوت کا، ان سے کہے گا کہ اسلام کی نسبت تو سب کو ملتی ہے، زبان کی نسبت، قومیت کی نسبت ہماری خصوصیت ہے، اس پر فخر کرنا چاہئے اور اس کو مضبوط بنانا چاہئے، یہی شیطان کا وہ حربہ ہے جو وہ ایسے موقع پر استعمال کرتا ہے، آپ اس توحید کی رسی کو مضبوط پکڑیئے''واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرّقوا ''اللہ تعالیٰ

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۲ ص: ۴۴۲۔ اصل روایت صحاح میں بھی ہے۔

فرماتا ہے کہ رسی کو مضبوط پکڑو متفرق نہ ہو جاؤ۔

تفرّق کی بات تو یہی ہے کہ شیطان کسی کے سامنے قومیت، کسی کے سامنے مادیت، کسی کے سامنے دولت، کسی کے لئے علم اور مختلف قسم کی چیزیں لالا کر کھڑا کر دیتا ہے، اور ان میں ایسی کشش پیدا کر دیتا ہے کہ بعض وقت آدمی اس کے لئے دوسروں کی جانیں لیتا ہے، لوگ ایک دوسرے کے سر کاٹنے لگتے ہیں، ایک دوسرے کے گھر اجاڑنے لگتے ہیں، کمزور کمزور بچوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، شریف بیبیوں اور بیواؤں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، یہ سب شیطان کے چکّر ہیں، ہمیں آپ کو اسلام پر فخر کرنا چاہئے اور اسلام کو سب سے بڑی دولت سمجھنا چاہئے، اسلام کی نسبت کو، اسلام کی چیزوں کو سب سے بڑھ کر سمجھنا چاہئے، حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک سیاہ فام آدمی کی جس میں کوئی وجاہت نہیں بڑے بڑے خاندانی لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ عزت ہوتی ہے'' ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم '' اللہ تعالیٰ نے فضیلت کی چیز تقویٰ بنایا ہے، فضیلت کی چیز عبادت بنائی ہے، فضیلت کی چیز علم بنایا ہے'' **لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی الا بالتقویٰ** ''عرب کو عجم پر کسی عجمی کو عرب پر، گورے کو کالے پر، کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں دی گئی، اگر فضیلت دی تو تقویٰ کی بنیاد پر، کون اللہ کا علم زیادہ رکھتا ہے، دین کا علم زیادہ رکھتا ہے، کون زیادہ نماز پڑھنا جانتا ہے، کون اسلام پر زیادہ شکر و فخر کرتا ہے، اور جس کو اللہ و رسول سے زیادہ محبت ہے، اسی کو فضیلت ہے، ایمان کی نسبت سب سے بڑی نسبت ہے، اس لئے فرمایا'' **ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا** '' کہیں آتا ہے'' **انہ یرکم ھو وقبیلہ من حیث لاترونھم** '' شیطان اور اس کا لشکر تم کو دیکھتا ہے، اور تم اس کو نہیں دیکھتے۔

اور شیطان جن کے بھیس میں بھی ہے، اور انسان کے بھیس میں بھی آتا ہے، وہ دشمنوں کے بھیس میں بھی آتا ہے، اور دوستوں کے بھیس میں بھی آتا ہے، اس کو بہت سی زبانیں آتی ہیں، ہم سے آپ سے اچھی زبان بولتا ہے اور ہم سے اور آپ سے زیادہ اچھی زبان میں وہ سمجھاتا ہے، آپ ایسے سب دشمنوں سے ہوشیار رہئے، اسلام کی رسی

کو مضبوط پکڑیئے، اس اس پر فخر کیجئے اس سے زیادہ فخر کی کوئی بات نہیں ہے، اسلام پر زندہ رہئے، اسلام پر مر جایئے، اسلام سیکھئے، اس کے لئے سر کٹانا بھی درست ہے لیکن غیر اسلام کے لئے خون کا ایک قطرہ بہانا بھی ناجائز۔

عرب میں ۶۶-۶۵ء میں ایک بڑا طوفان اٹھا، بڑی آندھی اٹھی ایک ایسا آدمی پیدا ہوگیا(۱) جس نے لاکھوں عربوں کو پاگل بنادیا، لیکن تھوڑے دن کے لئے اللہ رہ گیا، اس کا رسول رہ گیا، قبلہ رہ گیا، اور مسجد نبوی رہ گئی، اور قرآن شریف رہ گیا اور وہ جادو رخصت ہوا "ان الباطل کان زھوقاً" باطل کے پاؤں نہیں، صرف اللہ اور رسول قائم رہیں گے، آپ اسلام کے سوا کسی چیز پر فخر نہ کریں، اسلام کے نعرہ کے علاوہ کوئی چیز آپ کو اپنی طرف کھینچنے نہ پائے، اسلام کے رخ کے سوا کسی کی طرف آپ رخ نہ کریں بس یہی اسلام کا شکر ہے، یہی اسلام کا فخر ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ایمانوں اور دلوں کی حفاظت فرمائیں، ہمارے ایمان، ہمارے ساتھیوں کے ایمان اور ہمارے دلوں کی بھی اللہ حفاظت فرمائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

محبت اور سچی روحانیت کی فتح

> حضرت مولانا قدس سرہ کی یہ تقریر جو اسلامک فاؤنڈیشن بنگلہ دیش کی طرف سے دیئے ہوئے استقبالیہ اور اس کے ڈائرکٹر جناب ابوالفاید محمد یحییٰ صاحب کی خیر مقدمی تقریر کے جواب میں ۱۲/مارچ کو ہوٹل پوربانی میں مہمان کے اعزاز میں ڈنر کے موقع پر کی گئی۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین، وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین. امابعد!

ڈائرکٹر جنرل صاحب اسلامک فاؤنڈیشن اور معزز حاضرین!

میں اس وقت بڑا متاثر اور مسرور ہوں کہ اتنے چیدہ و برگزیدہ منتخب دوستوں اور

---

(۱) جمال عبدالناصر صدر مصر مراد ہیں۔

دانشوروں سے ایک جگہ مل رہا ہوں، چاہئے تو یہ تھا کہ میں خود گھر گھر جاتا اور آپ سے ملتا لیکن ایک آدمی کے لئے جس کا قیام مختصر ہو اور شہر بہت بڑا ہو یہ ممکن نہیں ہوتا، میں جناب ابوالفاید محمد یحییٰ صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ موقعہ عطا کیا کہ میں ایک وقت میں اپنے اتنے عزیز و معزز بھائیوں سے مل سکوں۔

میں بلا تکلف کہتا ہوں کہ اس وقت مجھے بنگلہ زبان نہ جاننے کا بہت افسوس ہو رہا ہے، زبانیں سب خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، اور خدا نے اپنا احسان رکھتے ہوئے، کسی کمزوری (WEAKNESS) کسی عیب کے طور پر نہیں، بلکہ تعریف کے موقعہ پر اور اپنی نعمت کو یاد دلاتے ہوئے زبانوں کے تنوع (VARIETY) کا ذکر کیا ہے۔

ومن آیتہ خلق السموٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذٰلک لاٰیٰت للعلمین O

(سورۃ الروم ۲۲)

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے، اور تمہاری بولیوں اور تمہارے رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اور اس میں سمجھنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے اور بنگالی زبان تو مسلمانوں کی زبان ہے، اس میں علم وادب کا بڑا خزانہ ہے، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ میں اس برصغیر کے ایک باشندہ ہونے کے ناطے بنگلہ زبان سے وقف ہوتا، لیکن یہ میری کمزوری ہے کہ میں آپ سے آپ کی عزیز زبان میں اس وقت بات نہیں کر رہا ہوں، اگر اس کا کوئی متبادل طریقہ ہوسکتا تھا تو وہ یہ کہ میں عربی زبان میں بات کرتا اور آپ اس کو سمجھتے جو اسلام کی سرکاری زبان اور عالم اسلام کی سب سے محبوب اور سب سے وسیع زبان ہے۔

حضرات! جب سے میں نے ایمان کی، علمائے کبار اور اولیائے عظام کی اس سرزمین پر قدم رکھا ہے، اس وقت سے میرا دل مسرت سے معمور ہے، میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ اس سرزمین پر مسلمانوں کی اتنی کثیر آبادی کا وجود محض خلوص اور روحانیت کی فتح ہے، اگر سچی روحانیت اور سیاسی مفادات سے بالاتر خلوص نہ

ہوتا، سچی خداپرستی اور انسانیت دوستی نہ ہوتی (جو ہمارے بزرگوں میں تھی) تو یہ سرزمین اسلام کی نعمت سے مالا مال اور اسلام سے عشق کرنے والی نہ ہوتی، آج ہمیں کسی ایک شخص کے دل کا جیتنا مشکل معلوم ہورہا ہے، لیکن ہمارے بزرگوں نے کتنی آسانی کے ساتھ محض اپنے خلوص کی بدولت لاکھوں انسانوں کے دل میں گھر کرلیا اور ان کو اپنا عاشق وشیدائی بنالیا، یہاں مسلمانوں کی اکثریت کسی فوج کشی کا نتیجہ نہیں ہے، میں پوری ذمہ داری کے ساتھ آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں جہاں اسلامی فوجیں نہیں گئیں، وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور جہاں صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، کشمیر حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی محبت کا اسیر و نخچیر ہے، خدا کا ایک بندہ ایران سے آتا ہے اور سارا کشمیر اسلام کا کلمہ پڑھ لیتا ہے، اور اسلام سے اس کو ایسا عشق ہوجاتا ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے برہمن خاندانوں کے افراد اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، وہیں کے ایک برہمن زادہ (اقبالؔ) کو ایک سیدزادہ خطاب کرتے ہوئے یہ کہنے کا موقعہ ملا کہ ؎

تو سید ہاشمی کی اولاد	میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب وگل میں	پیوستہ ہے ریشہائے دل میں
اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے	اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
عالم کی عشا ہو جس سے اشراق	مومن کی اذاں ندائے آفاق

اقبالؔ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی یہ محبت کس نے پیدا کی، جس نے ان کی زبان سے کہلوایا ؎

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے	غبار راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
حدیث عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر	وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسں وہی طٰہٰ

یہ عشق رسول روحانیت نے پیدا کیا، خلوص نے پیدا کیا، سچی خداپرستی اور سچی انسان

دوستی نے پیدا کیا، جب خداپرستی اور انسان دوستی کا سنگم ہو جاتا ہے، جب یہ دو دریا آ کر مل جاتے ہیں، ایک طرف انسان خداپرست ہوتا ہے، دوسری طرف انسان دوست ہوتا ہے، پھر اس کی فتوحات کو کوئی روک نہیں سکتا، پھر روشنی تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے، سچی خداپرستی اور انسان دوستی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ ملک کے ملک ان کے قدموں پر گر جاتے ہیں، آج بھی دنیا کی مشکلات ومصائب کا علاج یہی خلوص ہے، سچی روحانیت اور مفادات اور سیاسی اغراض سے بالاتر ہو کر خدمت کرنا ہے۔

مشرقی بنگال میں بھی درویش آئے، خداپرست فقیر آئے، یہاں وہ آئے، جو انسان کو سینہ سے لگاتے تھے، اور انسانوں نے جو مصنوعی تقسیم کر رکھی تھی، آدمؑ کی اولاد کو انہوں نے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا، ایک انسان تھے، دوسرے وہ بدقسمت تھے، جن سے جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا، وہ اسلام کا پیغام لے کر آئے، توحید ربانی اور وحدت انسانی کا پیغام لے کر آئے، رسول اللہ ﷺ نے عربوں کو مخاطب کر کے فرمایا، جو اس زمانہ کے سب سے بڑے نسل پرست اور زبان پرست تھے، حتی کہ وہ ساری دنیا کو اپنے سامنے گونگا اور بے زبان سمجھتے تھے اور اپنی عربی زبان کے سامنے کسی زبان کو زبان نہیں سمجھتے تھے، اور اس کو منہ نہیں لگاتے تھے ''ان ربکم واحد وان اباکم واحد، کلکم من آدم وآدم من تراب، لافضل لعربی علی عجمی، ولالعجمی علی عربیّ، لا لأبیض علی أسود، ولالأسود علی ابیض، الا بالتقویٰ۔''

يا ايها الناس انا خلقنكم من ذكرٍ واُنثىٰ وجعلنكم
شعوباً وقبائل لتعارفوا. ان اكرمكم عندالله اتقكم O
(سورة الحجرات. ١٣)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری قوم اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

محمد عربی ہاشمی قریشی ﷺ نے فرمایا کہ انسانو! اے لوگو! اے عربو! تمہارا خدا

تمہارا پیدا کرنے والا بھی ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک تھا، دو دو رشتوں سے تم ایک دوسرے کے بھائی ہو، ایک خدا کے رشتہ سے، خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے، دوسرے باپ کے رشتہ سے کہ تمہارے مورث اعلیٰ ایک تھے، توحید ربانی اور وحدت انسانی دو ستون ہیں جن پر انسانیت قائم ہے، اگر ان میں سے ایک ستون بھی گرا دیا جائے تو تہذیب وتمدن کا یہ سارا قصر زمین پر آجائے گا۔

انہیں صوفیوں اور انہیں درویشوں کے ذریعہ یہاں اسلام آیا، جنہوں نے دماغ سے بات کرنے سے پہلے دل سے بات کی، انہوں نے منہ کی زبان سے بات نہیں کی دل کی زبان سے کی، منہ کی زبانیں پچاسوں ہوسکتی ہیں، لیکن دل کی زبان ایک ہے، روح کی زبان ایک ہے، سچائی کی زبان ایک ہے، محبت کی زبان ایک ہے، محبت کی زبان ہر جگہ سمجھی جاتی ہے، اور بعض مرتبہ ترجمان کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، آنکھوں کی چمک، لبوں کی مسکراہٹ دل سے ابلتا ہوا محبت کا فوارہ بڑے بڑے دشمنوں کو اور جنگل کے شیروں اور چیتوں کو اپنا کلمہ پڑھنے والا بنا لیتا ہے۔

میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے صرف ڈھاکہ کے نہیں بنگلہ دیش کے دل ودماغ یہاں پر اکٹھا کردیئے، کہ میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ جس ملک میں اتنے دانشور موجود ہوں، اسلام سے اتنی محبت کرنے والے موجود ہوں، جو اپنے ایک پردیسی بھائی کا نام سن کر اپنے تمام ضروری کام چھوڑ کر یہاں جمع ہوجائیں، اس ملک کا رشتہ اسلام سے کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، کمیت (QUANTITY) اور کیفیت (QUALITY) دونوں حیثیتوں سے یہ مجمع بہت ممتاز ہے، یہ مجھے (خدا کی رحمت پر نظر کرتے ہوئے) یقین دلاتا ہے کہ جہاں اتنے مسلمان ہوں، جہاں اتنے دانشور (INTELLECTUALS) ہوں، جہاں اتنے پڑھے لکھے اسکالرس (SCHOLARS) ہوں، اس ملک کا اسلام سے علمی طور پر تہذیبی طور پر، کلچرل طریقہ پر رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا، آپ نے مجھے بڑا تحفہ دیا ہے کہ ایک جگہ پر ایک وقت میں اتنے آدمیوں سے ملا دیا۔

حضرات! آپ مجھے معاف کریں اگر میری بات لمبی ہوجائے میں ''دخل

کرر ہاہوں ''دخل در معقولات'' بھی اچھی چیز نہیں ہے لیکن '' دخل در ماکولات'' اس سے بھی زیادہ سخت چیز ہے کہ یہ کھانے کا وقت تھا، میں آپ سے باتیں کرر ہاہوں، کھانا تو مجھے ہر جگہ مل جائے گا، لیکن میں آپ کو کہاں ڈھونڈھوں گا۔؟

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، خوشامد میں نہیں کہتا کہ آپ کو اسلام سے محبت کرنے والی جیسی مخلص اور سادہ دل قوم ملی ہے، بہت سے ملکوں کو نصیب نہیں، آپ اس کی قدر کریں، آپ کو بڑے بڑے سیاسی POLITICIANS مل جائیں گے DIPLOMATES مل جائیں گے، بڑے ذہین اور GENIUS لوگ مل جائیں گے، لیکن سچائی اور محبت آپ کو ہر جگہ نہیں ملے گی، آپ کی قوم میں یہ سچائی اور محبت موجود ہے، اب آپ اس سے کام لیں، میں TORONTO گیا، وہاں لوگوں نے مجھے NIAGARA FALL دکھایا، وہ آبشار جو دنیا کے ساری عجائبات میں شمار ہوتی ہے کہ ہزاروں فٹ سے پانی گرتا ہے، دنیا بھر کے سیاح اس کو دیکھنے جاتے ہیں، میں بھی گیا، اس نیاگرہ آبشار سے بجلی نہ پیدا کی جائے، اس سے ELECTRICITY نہ لی جائے، اس سے وہ انرجی ENERGY نہ لی جائے، اور اس سے کھیتیاں نہ سینچی جائیں تو نیاگرہ فال ضائع ہوا کہ کام آیا؟ آپ کو خدا نے ایک آبشار دی ہے، یہ ایمان کی آبشار ہے جو آپ کو اس قوم کی شکل میں حاصل ہے، یہ سچائی کی، خلوص کی آبشار ہے، اس سے بجلی پیدا کریں، آپ جن مسائل کو سمجھ رہے ہیں کہ وہ ناقابلِ حل ہیں، وہ سب مسئلے چٹکیوں میں حل ہو سکتے ہیں، اگر سچائی اور خلوص ہو، آپ کی قوم میں وہ جوہر موجود ہے، اس سے آپ جو کام لینا چاہیں وہ کام لے سکتے ہیں۔

لیکن یہ سیاسی لیڈروں کا کام نہیں ہے، یہ سچے دل والوں کا، خلوص والوں کا کام ہے، جو اپنے دل میں محبت رکھتے ہوں، جو اس قوم کو دینا چاہتے ہوں، اس قوم سے لینا نہیں چاہتے ہوں جو اس قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہوں، اور خدا سے اس کا ثواب چاہتے ہوں، وہ اس قوم سے اکسیر بنا سکتے ہیں، سونا بنا سکتے ہیں، یہ قوم تو سونا ہے، یہ قوم یہاں بنگلہ دیش ہی میں نہیں پورے عالم اسلام میں ایک نئی طاقت پیدا کر سکتی ہے، لیکن یہ

جب ہوگا جب ہم اس نعمت کی قدر کریں جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس قوم کی شکل میں دی ہے، یہ ''نیاگرہ فال'' ہے، آپ اس سے بجلی پیدا کریں، یہ پانی ضائع ہو رہا ہے، کتنے دنوں سے ضائع ہو رہا ہے، اس سے آپ اگر بجلی پیدا کریں تو نہ بجلی سارے برصغیر SUB CONTINENT کو منور و روشن کر سکتی ہے، اور عالمِ عربی تک یہ روشنی جا سکتی ہے۔

آپ اپنی قوم کی قدر کریں اور جو خلیج GULF پرانے طبقہ کے درمیان اور نئی نسل YOUNG GENERATION کے درمیان، اور علماء اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹس کے درمیان پڑ گئی ہے اور زیادہ سے زیادہ گہری اور وسیع ہوتی جا رہی ہے، آپ اس خلیج کو پر کریں، دونوں طبقے گلے ملیں، قدیم علماء دینی مسائل میں آپ کی مدد کر سکتے ہیں، آپ کی رہنمائی کر سکتے ہیں، آپ کو قرآن کی تعلیمات سے آشنا کر سکتے ہیں، اور جدید تعلیم یافتہ اس کو لے کر بنگلہ زبان میں پھیلا سکتے ہیں، دونوں مل کر اس ملک کو طاقتور اور اسلام کا علمبردار بنائیں، یہ عالمِ اسلام کا دوسرے نمبر کا بڑا خاندان ہے، اس کو اپنی ذمہ داری، اپنی طاقت اور اپنی قیمت محسوس کرنی چاہئے، اور بڑے بھائی کی طرح چھوٹے بھائیوں جو تعداد میں کم ہیں کی مدد کرنی چاہئے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے طاقت کے ایک نئے خزانہ سے واقف کرایا، آپ نے امید کی ایک دنیا آباد کر دی، میرے دل پر جس پر بار بار عالم اسلام کے واقعات کو دیکھ کر مایوسی کا حملہ ہوتا رہا ہے، لبنان کے واقعات کو دیکھ کر، عراق و ایران کی جنگ کو دیکھ کر اور عرب ملکوں کی دولت کا غلام بن جانے کی حالت کو دیکھ کر جو میرے دل پر چوٹ لگتی رہی ہے، آپ نے اس میں تھوڑی سی کمی پیدا کی، ابھی اسلام کا ستارہ بلند ہے، اور کیا تعجب ہے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ MODERN RENAISSANCE یہاں سے پیدا ہو اور میں صاف کہتا ہوں ایک ہندوستانی مصنف کی حیثیت سے (جیسا کہ میرا تعارف کرایا گیا) کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب طرح کی صلاحیتیں دی ہیں، الحمد للہ آپ میں کسی بات کی کمی نہیں ہے، صرف اس کی ضرورت ہے کہ اسلام کے رشتہ کو اور نسبت کو آپ ہر چیز پر ترجیح دیں کوئی چیز اس کے راستہ میں

رکاوٹ نہ بنے، اصل تعلق خدا کا ہے، جہاں ہم سب کو جانا ہے، اور وہاں کوئی چیز کام نہیں آئے گی سوائے ایمان اور عقیدہ کے اور نیک عمل کے، ہم سب انسانوں سے محبت کریں، سب زبانوں کے ساتھ محبت رکھیں، اپنی زبان کو ترقی دیں، اس سے پیار کریں، مگر نفرت کسی زبان سے نہ کریں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ ایسے عالم وادیب بھیجیں جو ہندوستان میں بنگلہ زبان کی تعلیم دیں، زبانوں کے تعصب سے اسلام کی تاریخ آشنا نہیں، مسلمانوں نے سب زبانوں کو سیکھا اور ان میں کمال پیدا کیا اور ان کو اسلامی لٹریچر سے مالا مال کر دیا، فارسی کیا تھی، آتش پرستوں کی زبان تھی، اس کی شاعری کی تاریخ پڑھئے، اس نے سعدیؒ کو پیدا کیا، حافظؒ کو پیدا کیا، جلال الدین رومیؒ کو پیدا کیا، عرفی اور نظیری کو پیدا کیا، مولانا جامیؒ اور قدسیؒ کو پیدا کیا اور کیسے کیسے عالم پیدا کئے مجھے یہاں آکر جس سے سب سے بڑی امید پیدا ہوئی وہ اسلامک فاؤنڈیشن ہے، یہ ایک ایسا ادارہ ہے کہ جو ہمارے INTELLEC TUALS کے لئے، یونیورسٹیوں سے نکلنے والے نوجوانوں کے لئے اسلامی کتابیں ان کی زبان میں پیش کرے گی، اور اس کی زبان، اس کا اسٹائل ہر چیز اس کی آئیڈیل IDEAL اور معیاری ہوگی، یہ امید کا ایک ستارہ ہے جس سے اس ملک میں روشنی پھیلنے کی امید ہوتی ہے اور اس سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

میں ان الفاظ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں اور پھر اسلامک فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے یہ زرّین اور تاریخی موقعہ فراہم کیا۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین